

سبط حسن

انقلابِ ایران

"از خون جوانان وطن لاله دمیده"

انقلابِ ایران

ثمینا، طاہرہ اور دانش کے نام

جن کے ہنستے چہروں کو دیکھ کر انسان کے روشن
مستقبل پر میرا یقین اور پختہ ہو جاتا ہے۔

انقلابِ ایران

سیّد سبطِ حسن

دانیال

پبلشر کا نوٹ

'انقلابِ ایران' کے موجودہ ایڈیشن کو سابقہ ایڈیشنوں کے برعکس کمپیوٹر پر کمپوز کر کے شائع کیا جارہا ہے۔ اس ایڈیشن میں 'انقلابِ ایران' کے حوالہ جات و حواشی کو بھی یکساں انداز میں پیش کیا جارہا ہے۔ یعنی اب ہر باب کے حوالہ جات اور حواشی اس باب کے آخر میں یکجا کر دیے گئے ہیں۔ نیز بعض نامکمل حوالوں کو جہاں جہاں ممکن تھا، مکمل بھی کر دیا گیا ہے۔

ہم محترم ڈاکٹر سیّد جعفر احمد، ڈائریکٹر پاکستان اسٹڈی سینٹر، کراچی یونیورسٹی کے بے حد ممنون ہیں جنہوں نے ازراہِ لطف و کرم اس اہم کام میں ہم سے مکمل تعاون کیا اور یوں یہ کام بخوبی ممکن ہوسکا۔

فہرست

تمہید

کہتے ہیں کہ یہ زمانہ تاریخ سازی کا ہے نہ کہ تاریخ نویسی کا، لیکن ایران کے حالیہ واقعات تاریخ نویسی کا شوق پورا کرنے کی غرض سے قلمبند نہیں کیے گئے ہیں بلکہ انقلاب کے سفر میں تاریخ سازی کی جو راہیں کھلتی ہیں اور جو مشکل مقام آتے ہیں ان کا تجزیہ مقصود ہے۔ یوں تو ہم میں سے ہر شخص کی زندگی میں روزانہ اِن گنت واقعات پیش آتے رہتے ہیں مگر ہم ان واقعات کو عموماً اپنا ذاتی یا اتفاقی تجربہ سمجھ لیتے ہیں۔ ان کو کسی رشتے میں نہیں جوڑتے اور نہ ان واقعات کی تہہ میں جو معاشرتی قانون یا تاریخی عوامل کارفرما ہوتے ہیں ان پر غور کرتے ہیں۔ البتہ انقلاب کے دوران ہمارے ذاتی تجربے ایک وسیع سماجی تجربے سے منسلک ہوجاتے ہیں۔ انسان واقعات کا موضوع نہیں بلکہ واقعات اس کا موضوع بن جاتے ہیں۔ اُس کی فعالی خصوصیتیں ابھر آتی ہیں۔ وہ تاریخ کا معمول ہونے کے بجائے تاریخ کا عامل یعنی تاریخ ساز بن جاتا ہے۔ تاریخ کے اسی عوامی تجربے کو، تاریخ سازی کے اسی عمل افروز شعور کو انقلاب کہتے ہیں۔

انقلابی عمل کے طفیل ہمارا یہ روایتی تاثر بھی کہ واقعات قدرتی ماجرے ہوتے ہیں جن پر ہمارا کوئی قابو نہیں، کمزور ہوجاتا ہے اور اس احساس کو تقویت ملتی ہے کہ انسان اپنی تقدیر کا خالق خود ہے اور یہ کہ تاریخ بھی کوئی شے ہے جو ہر فرد کی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ تاریخ کا یہی

شعور قومی آزادی اور قومی تشخص کی تلاش کا محرک بنتا ہے۔ ہمارے ذہنوں میں ماضی کی عظمتوں کی یادیں تازہ ہوتی ہیں اور ہم کو اپنے قومی زوال، پستی اور ذلت کے لمحے کانٹے کی طرح چبھنے لگتے ہیں۔

انقلاب کے ایام صدیوں کی حیاتِ جبر میں اختیار و آزادی کے لمحے ہوتے ہیں جو مظلوم انسانوں کی طرز زیست قرار پاتے ہیں۔ اُن میں جو، اب تک حالات کے تابع تھے حالات کو اپنا مطیع بنانے کا جذبہ بیدار ہوتا ہے اور ترقی کی راہ میں جو رکاوٹیں تھیں، انقلابی عناصر ان کو ہٹا دیتے ہیں تاکہ امکانات کا دائرہ وسیع ہو۔ کارل مارکس نے اسی بنا پر کہا تھا کہ انقلاب فقط اسی وجہ سے ضروری نہیں کہ حکمراں طبقے کو انقلاب کے علاوہ کسی اور ذریعے سے اقتدار سے بیدخل نہیں کیا جاسکتا بلکہ انقلاب اس وجہ سے بھی ضروری ہے کہ انقلاب ہماری ذات کی تطہیر کرتا ہے، اطاعت وبندگی، تذبذب اور تشکک کے داغ دھل جاتے ہیں اور انسان اس آگ سے کندن بن کر نکلتا ہے۔

انقلاب، انسان کے معاشرتی عمل کا نقطۂ عروج ہے مگر وہ اتفاقاً وقوع پذیر نہیں ہوتا بلکہ اس کی نوعیت ایک تحریک، ایک 'پراسس' کی ہوتی ہے۔ اس اثنا میں وقت کی رفتار تیز ہوجاتی ہے۔ لینن کے بقول 'زمانہ بیل گاڑی کے بجائے بھاپ کے انجن کی رفتار سے چلنے لگتا ہے' اور صدیوں کی مسافت دنوں میں طے ہوجاتی ہے۔ پیداواری اصول بدلتے ہیں، سماجی رشتے بدلتے ہیں، طاقت کا توازن بدلتا ہے، زندگی کی قدریں بدلتی ہیں اور فکر و احساس کے انداز بدلتے ہیں۔ وہ لوگ جو انقلاب کو معاشرے کے قانونِ حرکت وتغیر سے الگ کر کے محض زندگی کا ایک حادثہ خیال کرتے ہیں وہ نہ انقلاب کے تاریخی کردار کو سمجھ سکیں گے اور نہ انقلاب کے فلسفے کو۔

انقلاب سے معاشرے کے انتشار میں اتحاد پیدا ہوتا ہے۔ انقلاب برائے انقلاب مہمل بات ہے کیونکہ ہر انقلاب کے چند مقاصد، چند اصول ہوتے ہیں جو لوگوں کے انقلابی عمل، ان کے جوش اور ولولے کا نقطۂ اتصال بن کر ان کو آگے چلنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ اس سفر میں چھوٹے چھوٹے اختلافات نظر انداز کر دیے جاتے ہیں البتہ جب حالات معمول پر آنے لگتے ہیں اور منزل مراد قریب آجاتی ہے تو معاشرے کے وہ داخلی تضادات اور اندرونی اختلافات

جن کو پس پشت ڈال دیا گیا تھا دوبارہ سر اٹھاتے ہیں، آدرشوں پر عمل کرنے کے تقاضے شروع ہو جاتے ہیں اور نئے مسائل بھی ابھرتے ہیں۔ اس وقت کار پردازانِ انقلاب کی فہم و فراست کا امتحان ہوتا ہے اور ان کے اپنے مفادات اور میلانات کی قلعی کھلتی ہے۔ جن لوگوں کے خیال میں انقلاب کوئی مسلسل عمل (process) نہیں بلکہ ایک حادثہ ہے وہ گزرے ہوئے کل میں تو انقلاب کو جائز اور درست سمجھتے ہیں لیکن آنے والے کل میں انقلاب کو جائز اور درست نہیں سمجھتے۔ لہٰذا وہ انقلاب کو اس کی منطقی حد تک لے جانے کا مطالبہ کرنے والوں پر مفسد اور 'طاغوتی' ہونے کے فتوے لگاتے ہیں۔ ان کے نزدیک انقلاب مستقبل کا نہیں بلکہ ماضی کا نقیب ہوتا ہے۔ وہ مستقبل کو ماضی میں تبدیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور تب ایک نئے انقلاب کے تقاضے شروع ہو جاتے ہیں۔

ایرانی انقلاب نے ابھی ابتدائی مراحل طے کیے ہیں اور منزل سے ہنوز بہت دور ہے۔ پھر بھی اس انقلاب سے یہ نتیجہ تو آسانی سے اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جبر کا بھیانک عفریت بہ ظاہر بہت قوی لیکن درحقیقت بہت کمزور ہوتا ہے، اُس افسانوی بادشاہ کی مانند جو ننگا تھا لیکن کسی کی جرأت نہ تھی کہ اس کو بتائے کہ وہ ننگا ہے۔ البتہ ایک لڑکے نے جب چیخ کر کہا کہ بادشاہ ننگا ہے تو بادشاہ کا سارا شاہی دبدبہ خاک میں مل گیا۔ اور لڑکا (جو انقلاب کی علامت تھا) اگر للکار دے تو پھر دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کو بھی، وہ توپ و تفنگ سے کتنی ہی لیس کیوں نہ ہو، پسپا ہونا پڑتا ہے۔

ایران اور پاکستان کے معاشرتی حالات میں جو مماثلت پائی جاتی ہے وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ایرانی معاشرے کا وہ کون سا پہلو ہے جو ہمارے ۳۲ سالہ تجربوں سے مختلف ہے۔ زندگی کو حسین و دلکش بنانے کے وہی خواب اور وہی ان کی ہیبت ناک تعبیریں، انسانی حقوق کی وہی پامالی، کبھی جمہوریت کے نام پر، کبھی مذہب کے نام پر، دولت و اقتدار کی وہی ہوس اور ہوس کی وہی بے شرمیاں، دیو استبداد کی وہی سفاکیاں اور گیرودار کی وہی رسمِ کہن، وہی درباری سازشیں اور ملکی مفاد کے وہی سودے، عوام کے مسائلِ زیست سے وہی غفلت، ضمیرِ انسانی کی وہی خرید و فروخت اور وقارِ انسانی کی وہی بے حرمتی، جلوت میں اخلاق و ایمانداری

کے وہی وعظ اور خلوت میں وہی ان وعظوں کی نفی، طاقت کا وہی نشہ اور اس طاقت کے لازوال ہونے کا وہی غرّہ، غرضیکہ بصیرت کی آنکھوں سے دیکھو تو ایران کی گزشتہ ۳۵ سالہ تاریخ میں اپنے گھر کی بربادی کا نقشہ صاف نظر آ جائے گا۔

یوں بھی ایران ہمارا دوست اور ہمسایہ ہے۔ اس کے ساتھ ہمارے رشتے ہزاروں سال پرانے ہیں۔ ہماری زبانیں ایک ماں کی اولاد ہیں۔ ایرانی علوم وفنون سے ہم نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ فارسی تقریباً آٹھ سو برس تک ہمارے ملک کی سرکاری درباری زبان رہی ہے جس کی وجہ سے فارسی کے بے شمار الفاظ، محاورے، اصطلاحیں، تمثیلیں، علامتیں اور استعارے ہمارے ادب کا جز بن گئے ہیں۔ حتیٰ کہ ہماری گرامر بھی فارسی گرامر کا چربہ ہے اور ہمارا رسم الخط بھی فارسی ہے۔ ہم نے امیر خسرو، مرزا عبدالقادر بیدل، غالب اور اقبال جیسے عظیم القدر شاعر پیدا کیے ہیں۔ ہمارے صوفیوں کی تعلیمات اور تصنیفات کی عظمت کا اعتراف اہل ایران بھی کرتے ہیں۔ ان حالات میں ایران کی موجودہ تاریخ سے ہماری دلچسپی قدرتی امر ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ گزشتہ ۳۲ سال میں ہمارے کسی مؤرخ، کسی مبصر، کسی دانش ور، کسی صحافی نے ہم کو ایران کے صحیح حالات سے باخبر کرنے کی زحمت نہیں اٹھائی۔ فارسی داں بزرگوں نے بار بار ایران کی سیاحت کی، طلبا وہاں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے گئے اور کئی کئی سال وہاں مقیم رہے، بے شمار سرکاری وفد بھی ایران جاتے رہے لیکن کسی کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ واپس آ کر ایران کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل پر کچھ لکھتا، جو لوٹا اس نے شاہ کی مدح وثنا پر اکتفا کی اور شاہ کی مہمان نوازیوں کا قصیدہ لکھا۔ دراصل ملوکیت پرستی ہماری رگ وپے میں کچھ اس طرح سرایت کر گئی ہے اور ہم معاشرتی زندگی کو شخصیتوں کے حوالے سے دیکھنے کے اس درجہ خوگر ہو گئے ہیں کہ ہم فرد ہی کو جماعت تصور کرنے لگے ہیں اور فرد بھی وہ جو جماعت سے بلند و بالا ہو۔ چنانچہ رضا شاہ کو ہم نے قومی ہیرو کا درجہ دے رکھا تھا۔ کسی کی مجال نہ تھی جو ایک حرف ان کے خلاف زبان سے نکال سکتا۔ وہ جب سرکاری دورے پر یہاں آتے تھے تو ان کا خیر مقدم یوں ہوتا تھا گویا پاکستان کے نجات دہندہ وہی ہیں۔ اسی غلامانہ ذہنیت کا نتیجہ تھا کہ شاہ پاکستان کو اپنی کالونی سمجھنے لگے تھے۔ شاہ ایران تو رخصت ہو گئے لیکن ہماری شخصیت پرستی میں کمی نہیں آئی ہے۔ پہلے شاہ

ہمارے ہیرو تھے اب وہی مقام ہم نے امام خمینی کو دے دیا ہے۔

ایرانی انقلاب ہر چند کہ ایران کا داخلی معاملہ ہے لیکن اس کی بین الاقوامی اہمیت روز بروز واضح ہوتی جاتی ہے۔ اس انقلاب کی وجہ سے مشرق وسطیٰ میں ترقی پسند اور رجعتی قوتوں کے توازن میں بڑی تبدیلی آئی ہے۔ ایران میں امریکی امپیریلزم کو بڑی ذلت آمیز شکست ہوئی ہے۔ اور اس شکست کے اثرات غالباً ویت نام سے بھی زیادہ دور رس ثابت ہوں گے۔ امریکی سامراج کے ترجمانوں کو اس امر کا پورا پورا احساس ہے۔ چنانچہ سابق صدر نکسن کے وزیر خارجہ ہنری کسنجر کو صدر کارٹر سے بڑی شکایت یہی ہے کہ انھوں نے 'مشرق وسطیٰ میں استحکام کے سب سے بڑے ستون، شاہِ ایران کا ساتھ نہیں دیا۔ صدر کارٹر کی اس کمزور خارجہ حکمت عملی کی وجہ سے 'دوستوں کے حوصلے پست ہوئے ہیں اور دشمن زیادہ دلیر ہوئے ہیں' (۵ دسمبر ۱۹۷۸ء) اور کارٹر کے دستِ راست بریزنسکی نے جو نیشنل سیکورٹی کونسل کے مشیرِ اعلیٰ ہیں 'قوسِ عدم استحکام' (arc of instability) کا باقاعدہ نظریہ وضع کیا ہے۔ 'عدم استحکام کی قوس بنگلہ دیش میں چاٹگام سے شروع ہوتی ہے اور اسلام آباد سے گزرتی ہوئی عدن پر ختم ہوتی ہے۔' (۳۱ دسمبر ۱۹۷۸ء) بریزنسکی کا کہنا ہے کہ 'اس علاقے کا جو ہمارے لیے بے حد اہم ہے سیاسی اور سماجی ڈھانچہ بہت کمزور ہے۔ اگر یہاں عدم استحکام بڑھا تو وہ عناصر برسرِ اقتدار آئیں گے جو ہماری اقدار کے خلاف ہیں اور ہمارے حریفوں سے ہمدردی رکھتے ہیں۔' سیدھے لفظوں میں وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ بنگلہ دیش، ہندوستان، پاکستان اور عرب ممالک میں ہم کو اپنی سرگرمیاں تیز کردینی چاہئیں تاکہ ان علاقوں میں وہ عناصر اقتدار پر قابض نہ ہونے پائیں جو محبِ وطن ہیں اور امریکی مفادات کے خلاف ہیں۔ چنانچہ یہ کوئی اتفاقی حادثہ تو نہیں کہ عین اس روز (۱۰ فروری ۷۹ء) جب کہ شاہ کے آخری وزیر اعظم ڈاکٹر شاپور بختیار فرار کی تیاری کر رہے تھے اور تہران کے در و دیوار امریکہ برباد کے نعروں سے گونج رہے تھے امریکہ کے وزیر دفاع مسٹر ہیرلڈ براؤن ریاض میں سعودی عرب کے حکمرانوں سے خفیہ بات چیت میں مصروف تھے اور امریکہ کے وزیرِ توانائی شلیے زنگر کہہ رہے تھے کہ 'امریکہ کو اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر پیش قدمی کرنی چاہیے خواہ اس کے لیے فوجی طاقت کیوں نہ استعمال کرنی پڑے' (۲۵ فروری) اور

یا اثر برطانوی ہفت روزہ 'اکانومسٹ' امریکہ کو مشورے دے رہا تھا کہ تیل پیدا کرنے والے دوست ملکوں (سعودی عرب، عراق، کویت، بحرین اور عرب امارات) کے گرد مسلح فولاد کی زنجیر (ring of armed steel) کا حصار کھینچ دیا جائے۔' (۳ مارچ)

مگر امریکہ کا مفاد کیا ہے جس کے تحفظ کی خاطر فوجی طاقت استعمال کرنے کی دھمکی دی جارہی ہے۔ امریکہ کا مفاد دراصل امریکی کمپنیوں کا مفاد ہے جو سعودی عرب اور امارتوں کے تیل پر قابض ہیں۔ (ان امریکی کمپنیوں کو ۱۹۷۹ء کے پہلے نو مہینوں میں ۲۵/ارب ڈالر کا خالص نفع ہوا۔) اس علاقے کے تیل کی یومیہ پیداوار ساڑھے تین کروڑ پیپے ہیں۔ امریکہ، مغربی یورپ اور جاپان میں جتنا تیل استعمال ہوتا ہے اس کا ایک تہائی انھیں ملکوں سے جاتا ہے۔ ایرانی انقلاب کے بعد امریکہ کو سب سے بڑی تشویش یہی ہے کہ کہیں ایران کی دیکھا دیکھی عرب ملکوں میں بھی عوامی تحریک زور نہ پکڑے اور عرب شیوخ کی مطلق العنان حکومتیں جو امریکہ کی دوست ہیں معزول ہوجائیں۔ 'عرب ممالک میں نظامِ حکومت کی تبدیلی مغرب کے مفاد کے خلاف ہوگی کیونکہ عرب بادشاہتیں اور امارتیں ہمیشہ مغرب نواز اور کمیونسٹ دشمن رہی ہیں۔' ('اکانومسٹ') گویا سیاسی استحکام کے معنی یہ ہوئے کہ مشرق وسطیٰ کے تیل پر اینگلو امریکی کمپنیوں کا بدستور تسلط رہے اور عرب ملکوں میں مطلق العنان غیر جمہوری حکومتیں بدستور قائم رہیں۔

ہیرلڈ براؤن کے خفیہ دورے کا مقصد یہ تھا کہ ایرانی انقلاب کی وجہ سے مشرق وسطیٰ میں جو صورت حال پیدا ہوئی ہے سعودی عرب کو اس کی 'نزاکت' کا احساس دلایا جائے اور لگے ہاتھوں اس کشیدگی کو بھی دور کرنے کی کوشش کی جائے جو کیمپ ڈیوڈ معاہدے کے باعث امریکہ اور سعودی عرب کے تعلقات میں رونما ہوئی ہے۔ سعودی عرب نے امریکہ کے نئے فوجی منصوبے کی (جس کا ذکر آگے آئے گا) تائید تو نہ کی البتہ شمالی یمن کو فوجی امداد دینے کی تجویز پر فریقین میں اتفاق رائے ہوگیا۔ چنانچہ امریکہ نے شمالی یمن کو چالیس کروڑ ڈالر کا فوجی سامان فراہم کرنے کا وعدہ کیا اور یہ سامان ظہران، نجران اور خمیس موشیط کے سعودی ہوائی اڈوں پر اترنے لگا۔ اس کے علاوہ 'امریکہ کی مسلح افواج کے کئی ہزار آدمی سعودی عرب پہنچ گئے ہیں اور مشرق وسطیٰ کے ذرائع کے مطابق سعودی عرب، شمالی یمن، عمان اور بحرین میں امریکی افواج

کے دس ہزار کے قریب افراد متعین ہیں۔[1]

امریکہ کا نیا فوجی منصوبہ جون میں منظرِ عام پر آیا۔ اس منصوبے کے مطابق ایک لاکھ دس ہزار سپاہیوں کی ایک خود کفیل 'طوفانی فوج' مشرق وسطیٰ بالخصوص خلیج فارس میں فوری اقدامات کے لیے ہر وقت تیار رہے گی۔ اس فوج کو بحرِ ہند میں مقیم آٹھ امریکی جنگی اور طیارہ بردار جہازوں کا تعاون حاصل ہوگا اور عمان کی بندرگاہ مصیرہ اور بحرین کے بحری اڈوں کو استعمال کرنے کی اجازت ہوگی۔ بحرین میں جنگی جہازوں کی تعداد بڑھا کر پانچ کردی جائے گی۔ اس کے علاوہ بحرِ ہند میں جزیرہ گارسیا کے بحری اڈے کی توسیع بھی جاری ہے۔ مسٹر ہیرلڈ براؤن نے اپنی پریس کانفرنس میں علانیہ اعتراف کیا کہ اگر امریکہ یا اس کے اتحادیوں کی تیل کی سپلائی کو خطرہ ہوا تو امریکہ اس فوج سے فوراً کام لے گا۔ 'لہٰذا مشرق وسطیٰ ہمارے لیے بے حد اہم ہے اور چونکہ یہ مستحکم علاقہ نہیں ہے لہٰذا ہم تصادم میں ملوث ہو سکتے ہیں' (۲۴ جون)

عرب ملکوں کے اندرونی معاملات میں مداخلت کے اس جارحانہ منصوبے کے خلاف عربوں کا ردعمل بہت شدید ہوا ہے۔ عراق اور کویت نے اس کو 'جنگل کے قانون' سے تعبیر کیا ہے اور کہا ہے کہ امریکہ ۱۹ ویں صدی کی Gunboat Diplomacy پر اتر آیا ہے۔ سعودی عرب کے شاہ خالد، ولی عہد فہد اور وزیر خارجہ تینوں نے منصوبے کی مذمت کی ہے اور یہ اندیشہ ظاہر کیا ہے کہ عرب عوام امریکہ سے اتنی نفرت کرتے ہیں کہ امریکی فوجوں کا عرب علاقوں میں داخلہ جلتی پر تیل کا کام کرے گا اور مسٹر شمس اردکانی ایرانی سفیر متعینہ کویت نے کہا ہے کہ 'خلیج کی امارتوں اور ایران کو حقیقی خطرہ امریکہ سے ہے سوویت یونین سے نہیں۔ ہم کو یقین ہے کہ امریکہ ہم پر وار کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دے گا کیونکہ ایران کے انقلاب نے تیل، تجارت اور جاسوسی کے سب سے بڑے امریکی اڈے کو نیست و نابود کردیا ہے' (۵ جولائی ۷۹ء)

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ عمان کے سلطان قابوس کو امریکیوں نے شیشے میں اتار لیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ عمان میں (زوفر کے علاقے میں) مسلح عوامی جہد برسوں سے جاری ہے۔ سلطان نے شاہِ ایران کی فوجوں کی مدد سے زوفر کی تحریک پر قابو پالیا تھا مگر شاہ کی معزولی اور ایرانی فوجوں کی واپسی کے بعد یہ تحریک پھر زور پکڑ رہی ہے لہٰذا سلطان چاہتا ہے کہ دوسرے عرب

ملکوں کو بھی اس میں ملوث کر لے۔ سلطان کے ہاتھ میں تاش کا دوسرا پتہ آبنائے ہرمز ہے جہاں پر خلیج فارس اتنی تنگ ہو جاتی ہے کہ اگر دو تین تیل بردار جہاز وہاں ڈبو دیئے جائیں تو عراق، کویت، بحرین اور ابوظہبی کے تیل کی نکاسی بند ہو جائے گی (اس آبنائے سے روزانہ ایک سو تیل بردار جہاز گزرتے ہیں)۔ سلطان نے امریکہ سے ساز باز کرلی ہے اور اب اس کی کوشش ہے کہ آبنائے ہرمز کے تحفظ کی آڑ لے کر کوئی منصوبہ بنایا جائے۔ جس میں امریکہ، جاپان، مغربی جرمنی اور برطانیہ کے علاوہ سعودی عرب، خلیج کی امارتیں اور ایران سب شریک ہوں۔ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی جارہی ہے چنانچہ حال ہی میں ایران اور عمان کے درمیان ایک معاہدے پر دستخط ہوئے ہیں جس میں 'آبنائے ہرمز کے تحفظ کی خاطر اہم حربی تنصیبات کی تکمیل کی ضمانت دی گئی ہے'۔[۳]

'ڈان' کے نامہ نگار کے مطابق 'عمان پلان کی توثیق امریکہ اور برطانیہ نے کر دی ہے اور لندن کی تنظیم اکمو (International Maritime Consultative Organization) نے بھی اس منصوبے کو منظور کر لیا ہے۔۔۔عمان نے اپنا منصوبہ امریکہ اور بعض یورپی ملکوں کے سامنے اس لیے پیش کیا تھا کہ آبنائے سے ان کو بھی فائدہ پہنچتا ہے لہٰذا ان سے مالی امداد طلب کی گئی تھی'۔ ان 'تنصیبات' کی نوعیت ہر چند کہ صیغۂ راز میں ہے لیکن معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والا انسان بھی آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ جو 'حربی تنصیبات' امریکہ کی مدد سے لگائی جائیں ان کی غرض وغایت کیا ہوگی۔ امریکہ اب ایران میں چور دروازے سے داخل ہونے کی فکر میں ہے البتہ اس سازش میں ایرانی حکومت کی باقاعدہ شرکت انتہائی حیرت انگیز ہے۔

مہدی بازارگان کی وزارت کے استعفے پر اسی پس منظر میں غور کرنا چاہیے۔ یوں تو مہدی بازارگان نے نظم ونسق میں مولویوں کی مداخلت کو ہمیشہ ناپسند کیا اور وہ احتجاجاً دو بار استعفیٰ بھی دے چکے تھے لیکن ۶ نومبر کے استعفیٰ کا بڑا سبب جیسا کہ بی۔ بی۔ سی نے ۱۰ نومبر کو اعتراف کیا، ایرانی کابینہ کا امریکہ کی جانب بڑھتا ہوا جھکاؤ تھا۔ وزیر خارجہ ڈاکٹر ابراہیم یزدی کی امریکہ نوازی سے ہر شخص واقف ہے۔ وہ اٹھارہ سال امریکہ میں رہ چکے ہیں۔ ان کی بیوی امریکی ہیں اور وہ اپنی امریکی شہریت سے وزیر خارجہ بننے کے بعد دست بردار ہوئے تھے۔ ان

کے خلاف یہ شکایت بھی تھی کہ ہوانا کانفرنس سے واپس آتے ہوئے انھوں نے امریکی سرمایہ داروں سے نیویارک میں ملاقات کی تھی اور ان کو ایران میں کاروبار دوبارہ شروع کرنے کی دعوت دیتے ہوئے یہ یقین بھی دلایا تھا کہ تمہارے سرمائے کو آئندہ کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔ آیت اللہ خمینی کے صاحبزادے حجتہ الاسلام احمد خمینی نے حال ہی میں ٹیلی وژن سے ایک تقریر میں ابراہیم یزدی کے انھیں امریکی رجحانات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ 'آیت اللہ خمینی جس ملک کو ایران کا سب سے بڑا دشمن سمجھتے ہیں، ان کے بعض مفاد پرست رفقا اسی ملک کے آگے جھک رہے ہیں۔' لیکن 'اونٹ کی پیٹھ پر آخری تنکا' وہ خفیہ بات چیت تھی جو صدر کارٹر کے دستِ راست مسٹر بریزنسکی اور مہدی بازارگان اور ابراہیم یزدی کے درمیان الجزائر میں ہوئی۔ اس ملاقات کی اجازت امام خمینی سے نہیں لی گئی تھی اور نہ کابینہ کو اس کی خبر تھی۔ ملاقات کی تفصیلات تو منظر عام پر نہیں آئیں البتہ الجزائر سے واپسی پر مہدی بازارگان کی حکومت نے پہلا کام یہ کیا کہ ایران اور سوویت یونین کے ۵۸ سالہ معاہدے کی دفعہ ۵ اور ٦ کو یک طرفہ طور پر منسوخ کر دیا۔ ان دفعات میں سوویت یونین نے ایران کی آزادی اور یک جہتی کی ضمانت دی تھی اور یہ شرط بھی مان لی تھی کہ ایران پر بیرونی طاقت کے حملے کی صورت میں سوویت یونین ایران کی فوجی مدد کرے گا۔ یہ معاہدہ امریکہ کو ہمیشہ کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا مگر رضا شاہ نے اپنی تمام امریکہ نوازیوں کے باوجود اس معاہدے کو کبھی منسوخ کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی البتہ مہدی بازارگان کی حکومت نے بلا کسی اشتعال کے اس معاہدے کو کالعدم قرار دے دیا۔

امریکہ کے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار کرنے کی یہ کوشش امام خمینی کے مؤقف کی کھلی خلاف ورزی تھی۔ اسی اثنا میں امریکہ کی حکومت نے شاہ کو صیہونیت نواز یہودی ڈاکٹر کسنجر اور راک فیلر کے اصرار پر بغرضِ علاج نیو یارک آنے کی اجازت دے دی۔ (واضح ہو کہ کسنجر اس سے پہلے شاہ سے میکسیکو میں مل چکا تھا اور راک فیلر وہ سرمایہ دار ہے جس کے بینک، چیز مین ہیٹن میں ایران کے بارہ ارب ڈالر جمع ہیں) اس اشتعال انگیز اقدام سے ایرانیوں کے جذبات اور مشتعل ہو گئے۔ ان کو یقین تھا کہ شاہ کی بیماری فقط بہانہ ہے۔ امام خمینی مہدی بازارگان کی کابینہ سے اس بنا پر بھی خفا تھے کہ وہ مجلس خبرگان کے بعض فیصلوں کے حق میں نہ تھی۔

مثلاً مجلس نے مسودۂ آئین میں اپنی طرف سے ایسی دفعات بڑھا دی تھیں جو اصل مسودے میں نہ تھیں۔ ان دفعات کی رو سے امام خمینی کی حیثیت ایک مطلق العنان مذہبی آمر کی ہو جائے گی اور ان کو وہ اختیارات حاصل ہوں گے جو شاہ کو بھی نہ تھے اور نہ آئندہ صدرِ مملکت کو ہوں گے۔ ان دفعات کی، جن کا مقصد ایران کو مکمل تھیوکریسی میں تبدیل کر دینا تھا، جمہوریت پسند حلقوں کی طرف سے شدید مخالفت ہوئی اور قانونی پابندیوں کے باوجود طلبا نے ان کے خلاف مظاہرے شروع کر دئے۔ اُدھر ملاؤں کی جارحانہ حکمت عملی کو کُردستان میں بڑی زک پہنچی تھی اور امام خمینی کو مہدی بازارگان کی مصالحتی تجاویز ماننی پڑی تھیں۔ لہٰذا مہدی بازارگان نے یہ سمجھ کر کہ ملاؤں کی ساکھ ملک میں بہت گر گئی ہے اور لوگ ان سے عاجز آ چکے ہیں ملاؤں سے ٹکر لینے کا فیصلہ کر لیا۔ البتہ انہوں نے امام خمینی سے براہِ راست تصادم سے بچنے کی خاطر مجلس خبرگان کو اپنا ہدف بنایا چنانچہ ایک دستاویز تیار کی گئی جس میں مجلس خبرگان پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ وہ اپنے اختیارات سے تجاوز کر گئی ہے۔ اس کی مدت فقط ایک ماہ تھی لیکن اس نے اپنے فرائض مقررہ مدت میں پورے نہیں کیے۔ مزید برآں مجلس کو مسودے پر فقط اظہار رائے کی اجازت دی گئی تھی مگر اس نے مسودے میں نئی دفعات بڑھا کر امام خمینی، اسلامی انقلابی کونسل اور کابینہ سب کے احکام کی خلاف ورزی کی ہے۔ ان الزامات کے پیشِ نظر مجلس کو فوراً مستعفی ہونے کا مشورہ دیا گیا تھا اور مطالبہ کیا گیا تھا کہ اصل مسودۂ آئین پر فوری استصوابِ رائے کیا جائے۔ یہ دستاویز ابھی مہدی بازارگان کی کابینہ میں زیرِ غور تھی کہ امام خمینی کو اس کی خبر ہو گئی۔ مجلس خبرگان کا تو بال نہ بیکا ہوا البتہ مہدی بازارگان کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ ان پر امریکہ سے خفیہ ساز باز کرنے اور مجلس خبرگان کو توڑ کر اسلامی نظام کی بیخ کنی کرنے کے سنگین الزامات لگائے گئے[۳] اور مظاہرے شروع ہو گئے جن میں امام خمینی سے وفاداری کے اعلان کے علاوہ شاہ ایران کو امریکہ سے ایران واپس لانے کا مطالبہ بھی شامل تھا۔

اور تب ۴ نومبر کو طلبا کے ایک مسلح گروہ نے امریکی سفارت خانے پر قبضہ کر کے عملے کے تقریباً ۷۰ افراد کو یرغمال بنا لیا۔ ۶ نومبر کو بازارگان کی کابینہ مستعفی ہو گئی اور امام نے عنانِ اختیار اسلامی انقلابی کونسل کے سپرد کر دی۔ ایران میں 'آیا تو کریسی' قائم ہو گئی اور وہ جو ہلکا سا

پردہ تھا وہ بھی اٹھ گیا۔

اسلامی انقلابی کونسل بڑی پر اسرار اور خفیہ تنظیم ہے۔ اس میں غالب اکثریت ملاؤں کی ہے۔ کونسل کے ارکان کو جن کی تعداد پندرہ بتائی جاتی ہے امام خمینی نامزد کرتے ہیں اور وہ فقط امام کے روبرو جواب دہ ہوتے ہیں۔ کونسل میں سب سے طاقت ور گروپ آیت اللہ بہشتی کا ہے جو کونسل کے جنرل سیکریٹری اور حزبِ اسلامی جمہوریہ کے قائد ہیں۔ دوسرا گروہ ابوالحسن بنی صدر کا ہے۔ وہ اس وقت وزارتِ خارجہ، مالیات واقتصادیات سمیت حکومت کے آٹھ محکموں کے سربراہ ہیں۔ دراصل ایران کے وزیر اعظم ان دنوں وہی ہیں۔[۴] ابوالحسن بنی صدر ۱۹۳۵ء میں ہمدان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد آیت اللہ احمد بنی صدر مجتہد تھے۔ ابوالحسن بنی صدر ۱۹۶۵ء میں پیرس چلے گئے اور وہاں انہوں نے صادق قطب زادہ (ریڈیو اور ٹیلی وژن کے موجودہ سربراہ) کے ساتھ مل کر ایرانی طلبا کی ایک الگ اسلامی تنظیم بنائی اور سوربون یونیورسٹی کے شعبہ اقتصادیات میں داخلہ لے لیا۔ اکتوبر ۱۹۷۸ء میں جب امام خمینی پیرس میں وارد ہوئے تو ابوالحسن بنی صدر ان کے مشیرِ اقتصادیات بن گئے۔ بینک، بیمہ کمپنیاں اور صنعتی ادارے ابوالحسن بنی صدر ہی کے مشورے پر ریاست کی تحویل میں لیے گئے تھے۔

ابوالحسن بنی صدر کا جھکاؤ فرانس کی جانب ہے۔ ان کا خیال ہے کہ فرانس اگر امریکہ کے اثر سے آزاد ہوکر ایران سے مساوی سطح پر دوستانہ تعلقات قائم کرلے تو دونوں فائدے میں رہیں گے۔ انھوں نے پیرس کے بااثر اخبار 'لی ماند' کے نامہ نگار سے ملاقات کے دوران اپنے مؤقف کی کھل کر وضاحت کی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ 'ایرانی فوج کے ڈھانچے کو امریکی غلبے سے آزاد کر کے اس میں بنیادی تبدیلیاں لائی جائیں۔ اس کی تنظیم، اس کے افسروں کی درجہ بندی اور اُس کی آئیڈیالوجی کا رشتہ ایران کے سابق سرپرستوں سے منقطع کرلیا جائے اور ہماری فوج ملک کے اندر استبداد اور ملک کے باہر چوکیداری کا وسیلہ نہ رہے'۔[۵]

ایسی صورت میں بنی صدر کے بقول 'فرانس ہمارے لیے اسلحہ جات کا سب سے بڑا سپلائر ہوسکتا ہے۔ ہم اب امریکی اسلحہ ہرگز نہیں چاہتے کیونکہ یہی اسلحے امریکہ کے اثر واقتدار کا ذریعہ ہوتے ہیں'۔

بنی صدر کے خیال میں افسر شاہی کی بڑے پیمانے پر تطہیر ملک کی آزادی کے لیے بے حد ضروری ہے۔ 'دس لاکھ سرکاری ملازمین جو بیشتر بد دیانت ہیں ہماری تیل کی آمدنی ہضم کر جاتے ہیں۔ ہماری کوشش یہ ہوگی کہ ہر پانچ میں سے چار سرکاری ملازموں کو تعمیری کاموں پر لگائیں۔' یہ ارادہ بہت نیک ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ تطہیر کے نام پر تخفیف کی تلوار جب چلتی ہے تو اس کی زد میں عموماً بابو اور چپراسی یعنی نچلے درجے کے ملازمین آتے ہیں اور افسر طبقہ بالکل بچ جاتا ہے۔ بنی صدر کا کہنا ہے کہ 'مگر امریکی سامراج سے نمٹے بغیر گھریلو اصلاحات ہمیشہ معرض خطر میں رہیں گی لہٰذا ہم نے فعال خارجہ پالیسی کا تہیہ کیا ہے جس کا مقصد دونوں بڑی طاقتوں کے غلبے سے آزادی ہے بالخصوص اپنے خاص دشمن (امریکہ) سے جس سے ہماری مستقل ٹھنا ٹھنی ہے۔'

بنی صدر نے تجارت اور مالیاتی نظام پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ 'اس نظام نے ایراں کو بین الاقوامی سرمایہ داری بازار کی زنجیروں سے باندھ دیا ہے۔ ہم اس میں بنیادی تبدیلیاں کریں گے۔ ہماری نئی جمہوریت کے بنیادی مقاصد میں ایک مقصد ایسی کرنسی (سکہ) ہے جو ڈالر کی گرفت سے آزاد ہو اور مختلف الجہت تجارت جس کی محرک ملکی پیداوار ہو نہ کہ اشیائے صرف۔ بالخصوص چھوٹی چھوٹی پیداواری وحدتیں، جو دیہی علاقوں میں نہ کہ شہروں میں نصب ہوسکیں۔' اسی پالیسی کے تحت ابوالحسن بنی صدر نے یہ اعلان کیا ہے کہ ایران آئندہ تیل کے دام ڈالر کی بجائے جرمن یا سوئس مارک میں قبول کرے گا۔ اس فیصلے سے ڈالر کی ساکھ کو ضرور دھکا لگے گا لیکن بین الاقوامی ساہوکارے کا نظام ہنوز بہت مستحکم اور مربوط ہے اور ترقی یافتہ سرمایہ دار ملکوں کی کرنسیاں برابر ایک دوسرے کی مدد کرتی رہتی ہیں۔ چنانچہ ایران نے اگر اپنے بارہ ارب ڈالر امریکی بینکوں سے نکال کر مغربی جرمنی یا سوئزرلینڈ کے بینکوں میں رکھوائے تو بھی یہ رقمیں گھوم پھر کر بین الاقوامی سرمایہ دار کمپنیوں ہی کے تصرف میں آئیں گی اور ان میں اکثریت امریکیوں کی ہے جن کے صنعتی اور تجارتی اداروں کی شاخیں تمام غیر سوشلسٹ ملکوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ البتہ عرب ممالک (جن کے ۱۵۹ ارب ڈالر امریکی بینکوں میں جمع ہیں) ہندوستان، ایران، انڈونیشیا اور تیسری دنیا کے ملک آپس میں مل کر اگر کرنسیوں کا اپنا الگ کوئی



نظام وضع کریں تو مشرق کے بھی ترقی پذیر ملک مغربی ساہوکارے کے چنگل سے آزاد ہوسکتے ہیں۔ ابوالحسن بنی صدر کی گفتگو کی جو تفصیلات 'لِ ماند' نے شائع کی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ بنی صدر کے پاس ایران کی اقتصادی، سیاسی اور انتظامی اصلاح کا باقاعدہ منصوبہ موجود ہے اور غالباً اس منصوبے کو خمینی صاحب کی تائید بھی حاصل ہے لیکن ان کا یہ خیال درست ہے کہ امریکی سازشوں کو شکست دیئے بغیر یہ اصلاحی تدابیر اختیار نہیں کی جاسکتیں۔ اُدھر امریکی سفارت خانے پر ایرانی طلبا کے قبضے کے بعد امریکہ نے جو جارحانہ رویہ اختیار کیا ہے اس کی وجہ سے ایران کے داخلی مسائل پس پشت چلے گئے ہیں۔ امریکہ برابر دھمکی دے رہا ہے کہ اگر امریکیوں کو رہا نہ کیا گیا تو وہ طاقت کا استعمال کرے گا۔ ایسی صورت میں امریکہ اور ایران کے درمیان فوجی تصادم کا ہونا بعید از قیاس نہیں۔ اگر امریکہ نے ایران پر حملہ کیا تو جنگ کے شعلے پورے مشرق وسطیٰ کو اپنی لپیٹ میں لے لیں گے اور عالمی امن خطرے میں پڑ جائے گا۔

مغربی دنیا میں بالخصوص امریکہ اور برطانیہ میں امریکیوں کے یرغمال پر جو تہلکہ مچا ہوا ہے وہ حیرت انگیز نہیں ہے۔ یہ وہی ملک ہیں جو آخر وقت تک شاہ کی حمایت کرتے رہے تھے اور ان کی اب بھی یہ خواہش ہے کہ شاہ کسی نہ کسی صورت دوبارہ برسرِ اقتدار آجائے۔ ان کو ایرانیوں کے جذبات واحساسات سے نہ پہلے کبھی ہمدردی تھی نہ اب ہے۔ شاہ کے ہاتھ ایرانیوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ ایران میں جن دنوں انسانی خون سڑکوں پر بہہ رہا تھا تو نہ پاپائے روم کو کبھی شاہ سے رحم کی درخواست کا خیال آیا نہ امریکہ اور برطانیہ کے اربابِ اختیار کو۔ البتہ امریکی سفارت خانے پر قبضہ کیا ہوا گویا قیامت آگئی۔ اب ہر طرف سے رحم کی اپیلیں ہورہی ہیں حتیٰ کہ بقول بی بی سی 'عالمِ اسلام کے مقتدر رہ نما' تنکو عبدالرحمٰن بھی رحم کی اپیل کرنے والوں میں شامل ہوگئے ہیں۔ موصوف ملیشیا کے سابق وزیراعظم ہیں اور جدہ میں قائم اسلامی سیکریٹریٹ کے سیکریٹری جنرل بھی رہ چکے ہیں۔ ایران اور پاکستان سمیت ۴۵ر اسلامی ملک اس تنظیم کے رکن ہیں۔ اسی دوران میں امام خمینی نے اتحادِ اسلام کے نام پر اسلامی ملکوں سے اپیل کی ہے کہ وہ امریکہ کے خلاف جدوجہد میں ایران کا ساتھ دیں۔ دیکھیں اس اپیل پر لبیک کی صدا کِدھر سے بلند ہوتی ہے۔

یرغمال پر ہائے وائے ہو رہی ہے مگر کسی کی نگاہ امریکہ کی اشتعال انگیزیوں کی طرف نہیں جاتی۔ امریکی حکومت نے شاہ کو علاج کے بہانے نیویارک آنے کی دعوت دی تھی تو کیا اس کا خیال تھا کہ اس قران السعدین پر ایران والے خوش ہو کر بغلیں بجائیں گے؟ کیا امریکہ اس حقیقت سے بے خبر تھا کہ ایران کے لوگ اپنی ۳۵ سالہ تباہیوں اور بربادیوں کا ذمے دار امریکہ کو ٹھہراتے ہیں کیونکہ امریکہ کی پشت پناہی کے سبب ہی سے شاہ کو من مانی کرنے کا موقع ملا تھا؟ کیا ایرانی کبھی یہ بھول سکتے ہیں کہ ۱۹۵۳ء میں سی۔ آئی۔ اے نے ایرانی جنرلوں سے سازش کر کے ڈاکٹر مصدق کا تختہ الٹا تھا اور شاہ کو دوبارہ تخت پر بٹھایا تھا۔ کیا ایرانیوں کو یاد نہیں کہ ابھی پچھلے سال تک ۴۵ ہزار امریکی مشیران پر مسلط تھے اور امریکی کمپنیاں ان کے تیل پر قابض تھیں اور ایران کی صنعت وتجارت پر امریکی فرموں کی اجارہ داری تھی اور ایران کا ۱۲ ارب ڈالر کا اثاثہ امریکی بینکوں کے تصرّف میں تھا؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ شاہ کے کبھی پرانے جنرل امریکہ میں مقیم ہیں؟ ان حالات کے پیشِ نظر اگر ایرانی یہ سمجھیں کہ ہمارے موجودہ سیاسی اور اقتصادی بحران سے فائدہ اٹھا کر امریکہ ایک بار پھر شاہ کو ہمارے سر تھوپنے کے درپے ہے تو کیا اُن کا ردعمل غلط ہوگا؟

کہا جاتا ہے کہ شاہ کو کینسر ہے اور ان کی زندگی خطرے میں ہے لہٰذا امریکہ نے خالص انسانی ہمدردی کی بنا پر ان کو امریکہ آنے کی اجازت دی تھی۔ اس کے پیچھے کوئی سیاسی مقصد نہ تھا۔ ممکن ہے کہ شاہ کو کینسر ہو مگر کیا وہ میکسیکو میں رہ کر علاج نہیں کرا سکتے تھے؟ وہ نیویارک کے ہسپتال میں روزانہ ایک لاکھ روپے خرچ کر رہے ہیں۔ وہ چاہتے تو کیا میکسیکو میں رہ کر دنیا کے بڑے سے بڑے ماہر سرطان کو علاج کے لیے طلب نہیں کر سکتے تھے؟ اور اب تو 'امریکہ کے طبّی حلقے بھی اس یقین کا اظہار کر رہے ہیں کہ شاہ کے ساتھیوں کے اس دعوے کے باوجود کہ ان کی خاطر خواہ دیکھ بھال فقط امریکہ میں ہو سکتی ہے، شاہ کا علاج دوسرے کئی ملکوں میں بھی ہو سکتا تھا۔' اس کی تصدیق میکسیکو کے نیشنل کینسر انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر نے بھی کر دی اور کہا کہ 'شاہ کا علاج میکسیکو میں بھی ہو سکتا تھا۔'[۲]

امام خمینی کا یہ ارشاد بجا ہے کہ ایران کا سب سے بڑا دشمن امریکہ ہے۔ لہٰذا ہم اس سے

لڑیں گے لیکن وہ ان جمہوریت پسند عناصر سے بھی آمادۂ پیکار ہیں جو امریکی امپیریل ازم سے جنگ میں ان کے سب سے معتبر اور مستعد رفیق ہو سکتے تھے۔ امام خمینی کو اس تضاد کو حل کرنا پڑے گا اور جمہوریت کو از سرِ نو بحال کرنا ہوگا کیونکہ امریکی سامراج کو جمہوری طاقتوں کی مدد ہی سے شکست دی جا سکتی ہے اور اگر جمہوری عناصر بدستور موردِ عتاب رہے تو امام خمینی کی جمہوریت دشمنی کی منطق ایران کو ایک نہ ایک دن امپیریل ازم سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور کر دے گی۔

امام خمینی پر یہ الزام لگایا جا رہا ہے کہ انہوں نے سارا ڈرامہ اپنے گرتے ہوئے وقار کو بحال کرنے کے لیے کھیلا ہے، وہ شاہ اور امریکہ کے خلاف نفرت کی مہم چلا رہے ہیں تاکہ لوگوں کی توجہ ملک کے اقتصادی اور سیاسی مسائل کی طرف سے ہٹ جائے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انہوں نے نئے آئین کو منظور کروانے اور مجلسِ شورائی ملی کے انتخابات میں اپنے آدمیوں کو بھاری اکثریت سے جتوانے کی خاطر یہ بین الاقوامی بحران پیدا کیا ہے لیکن ان اقدامات کے لیے جواز بھی تو امریکہ ہی نے فراہم کیا ہے۔ اگر امریکہ ایران کے خلاف معاندانہ رویّہ نہ اختیار کرتا، اگر امریکہ ایران کے اندر اور باہر انقلاب دشمن عناصر سے ساز باز نہ کرتا اور شاہ کو چور دروازے سے نیویارک نہ لاتا تو امام خمینی کو بحران پیدا کرنے کا موقع کیوں ملتا؟

بہرحال امام خمینی کی تھیوکریسی جس کو اب آئینی شکل دے دی گئی ہے، ایران کے اقتصادی اور سیاسی مسائل کا حل نہیں ہے بلکہ اس سے تو مسائل اور پیچیدہ ہو جائیں گے اور ایران کے دشمنوں کو سازش کے نئے موقعے ہاتھ آئیں گے۔ یہ بھی امرِ واقعہ ہے کہ ایرانی محبانِ وطن کی بہت بڑی تعداد نیک نیتی سے یہ سمجھتی ہے کہ تھیوکریسی کا نفاذ ایرانی معاشرے کے حق میں روڑا ثابت ہوگا۔ وہ بجا طور پر محسوس کرتے ہیں کہ 'ولایت فقیہہ' کی آڑ میں لوگوں کو انسانی حقوق سے محروم کیا جا رہا ہے اور شخصی حکومت کے لیے راہ ہموار ہو رہی ہے۔ تھیوکریسی کے خلاف یہ بدگمانی بلاوجہ نہیں ہے کیونکہ قرونِ وسطیٰ میں تھیوکریسی کا مشرق و مغرب دونوں میں یہی کردار رہا ہے۔ اور آج بھی مشرقِ وسطیٰ میں جن ملکوں میں تھیوکریسی رائج ہے وہاں درحقیقت شخصی حکومت ہی کا دور دورہ ہے، ریاست کا سیاسی ڈھانچہ خالص آمرانہ ہے، سربراہِ ریاست کو ریاست کے باشندے منتخب نہیں کرتے بلکہ یہ منصب اس کو ورثے میں ملتا ہے گویا

ریاست اس کی ذاتی ملکیت ہوتی ہے۔ نہ رعایا کی چنی ہوئی مجلس قانون ساز، نہ رعایا کے روبرو جواب دہ وزارتیں، نہ انسانی حقوق کی کوئی ضمانت، نہ تحریر، تقریر اور تنظیم کی آزادی۔ ایسے نظامِ مملکت کو آمرانہ نہ کہیے تو کیا کہیے۔ شرعی عدالتیں قائم کرنے اور شرعی سزائیں دینے سے اس آمریت کی نوعیت نہیں بدل سکتی۔

دورِ حاضر کی تھیوکریسی کا اقتصادی ڈھانچہ بھی ایسا نہیں جس سے عوام کو فیض پہنچتا ہو بلکہ خالص سرمایہ دارانہ ہے۔ صنعتی اور تجارتی کاروبار، فیکٹریاں اور کارخانے، بینک اور بیمہ کمپنیاں، دکانیں اور دفاتر غرضیکہ دولت پیدا کرنے اور اس کو تقسیم کرنے کا سارا نظام سرمایہ داری اصولوں پر چلتا ہے۔ دولت اور دولت آفرینی کے ذرائع کا وہی چند ہاتھوں میں ارتکاز اور وہی اپنے ہم مذہب محنت کاروں کی قوت کا آزادانہ استحصال، جو سرمایہ داری کی خصوصیت ہے تھیوکریٹک ریاستوں میں بھی پوری شان وشوکت سے جلوہ گر ہے۔ یہی آمرانہ اور امیرانہ تھیوکریسی خمینی صاحب تھوڑی بہت ترمیم کے ساتھ ایران میں بھی نافذ کرنا چاہتے ہیں لیکن ایرانیوں نے اپنی جانیں اس لیے تو قربان نہیں کی تھیں کہ ایک آمر کو ہٹا کر دوسرے آمر کو اپنے اوپر مسلط کرلیں۔

ایران کو قومی اتحاد اور یک جہتی کی جتنی ضرورت آج ہے شاید پہلے کبھی نہ تھی لیکن امام خمینی جس جمہوری آئین کو مُلک میں نافذ کررہے ہیں اس کی وجہ سے ایرانیوں کے درمیان پھوٹ پڑنے کا سخت اندیشہ ہے۔ آیت اللہ کاظم شریعت مداری کے محترم عالم نے نئے آئین پر کڑی نکتہ چینی کی ہے۔ جبہ ملی دیموکراتیک نے اور ان کے علاوہ کردوں، بلوچوں اور ترکمانوں نے استصواب رائے کا بائیکاٹ کردیا ہے اور آذربائجان میں بھی آئین کے خلاف زبردست مظاہرے ہورہے ہیں۔ یہ صورتِ حال مستقبل کے لیے کوئی نیک شگون نہیں ہے۔ آج کل تو خیر قوم کے جذبات بہت مشتعل ہیں لیکن موجودہ بحران جب ختم ہوگا اور حالات معمول پر آجائیں گے تو ایرانی حکمرانوں کو بے شمار مسائل کا سامنا کرنا ہوگا اور ان کو یہ بھی سوچنا ہوگا کہ وہ جیالی قوم جس نے شاہ کو مار بھگایا دوسرے آمروں کو بھی شاید زیادہ دن برداشت نہ کرے۔

اس وقت جب کہ یہ آخری سطریں لکھی جارہی ہیں امریکی حکومت۔ یرغمالیوں کی آڑ لے کر ایران پر فوجی حملے کے لیے فضا سازگار کرنے میں مصروف ہے۔ امریکی بینکوں میں جمع شدہ

ایرانی اثاثہ منجمد کردیا گیا ہے، ایران کی اقتصادی ناکہ بندی کی تدبیریں ہورہی ہیں اور مغربی یورپ اور جاپان پر دباؤ ڈالا جارہا ہے کہ وہ بھی ایران کے خلاف امریکہ کا ساتھ دیں۔ اس کے علاوہ امریکی حکومت کے نمائندے بحرِ ہند کے ساحلی ملکوں میں بحری اور ہوائی اڈے حاصل کرنے کے لیے دوڑ بھاگ کررہے ہیں۔ امریکہ کی یہ جارحانہ سرگرمیاں نہ صرف ایران کی آزادی کے لیے انتہائی خطرناک ہیں بلکہ ان کی وجہ سے عالمی امن کو بھی شدید خطرہ لاحق ہے۔ حکومتِ پاکستان کا یہ اعلان کہ وہ ایران کی اقتصادی ناکہ بندی اور امریکہ کی فوجی مداخلت کے خلاف ہے پاکستانی عوام کے جذبات واحساسات کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ مگر حالات روز بروز زیادہ تشویش ناک صورت اختیار کرتے جاتے ہیں لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ مشرق کے سب ملک ایک آواز ہوکر امریکہ کو مجبور کریں کہ وہ ایران کے خلاف جارحانہ اقدامات سے فی الفور باز آجائے اور نزاعی مسائل کو پرامن گفت وشنید کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کرے۔

سبطِ حسن

کراچی، ۲۷ دسمبر ۱۹۷۹ء

حوالہ جات وحواشی

1- *Economist* (London), 13th October 1979.

2- *Dawn*, 11 November 1979.

3- *Guardian* (London), 6 November 1979.

4۔ وزارتِ دفاع کے نگراں آیت اللہ خمینی کے معتمد خاص آیت اللہ خامیانی ہیں۔ البتہ سنتے ہیں کہ مصطفیٰ چامران سابق وزیر دفاع ابھی تک محکمے سے وابستہ ہیں۔ وزارتِ داخلہ حجتہ الاسلام رفسنجانی کے حوالے کی گئی ہے۔ عدالتوں اور انقلابی کمیٹیوں کی ذمے داری آیت اللہ مہدوی کو دی گئی ہے۔

5- *Le Monde* (Paris), 10 November 1979.

6- *Dawn*, 24 November 1979.

پہلا باب

قاچاری دَور

ایرانیوں کے نظامِ فکرو احساس کی تشکیل میں یزدان واہرمن کی آویزش کے تصور کو بڑا دخل ہے۔ اس آویزش کی جھلک اُن کے مذہبی عقائد میں، حکماء کی تعلیمات میں اور شاعروں کے کلام میں جا بجا ملتی ہے۔ یہ درست ہے کہ دنیا کی شاید ہی کوئی قوم ہو جس میں نیکی اور بدی، خیر اور شر کے تصادم کی داستانیں موجود نہ ہوں۔ (کیونکہ جب سے انسانی معاشرے کی وحدت پارہ پارہ ہوئی ہے اور زبردست اور زیردست طبقے وجود میں آئے ہیں، اُن میں طاقت آزمائی ہورہی ہے اور اسی طاقت آزمائی کا ذہنی پیکر وہ دیو مالائی افسانے ہیں جن میں زندگی اور موت، نور اور ظلمت مجسم شخصیت بن کر باہم نبرد آزما ہوتے ہیں) لیکن اس تصور کو جس تسلسل سے ایرانیوں نے اپنی فنی تخلیقات میں تحلیل کیا ہے اُس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔ ضحاک اور کاوہ آہن گر کی جنگ اسی انقلابی تصور کی ایک شمع تمثیل ہے جس سے ایرانی ادیبوں کی بزمِ خیال آج بھی روشن ہے۔

کہتے ہیں کہ ضحاک نامی ایک شہزادہ تھا۔ بڑا ذہین، دلیر اور زیرک، ایک روز ابلیس اس کے پاس درویش کے روپ میں آیا اور کہنے لگا کہ اگر تم میرے مشورے پر عمل کرنے کا عہد کرو

تو میں تم کو ہفت اقلیم کی بادشاہت دلوا سکتا ہوں۔ ضحاک بہت خوش ہوا اور بولا کہ آپ مجھ کو جو حکم دیں گے، میں اس کی پوری پوری تعمیل کروں گا۔ ابلیس نے کہا کہ دیکھو تمہارا باپ بہت بوڑھا ہو چکا ہے۔ سلطنت کا بوجھ اب اس کے بس کا نہیں رہا۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ تم اس کو قتل کردو اور خود بادشاہ بن جاؤ۔ ضحاک بڑا فرمانبردار تھا اور اپنے باپ سے بہت محبت کرتا تھا لہٰذا اس نے ابلیس کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ ہفت اقلیم کی بادشاہت کی اگر یہی شرط ہے تو مجھ کو ایسی بادشاہت نہیں چاہیے۔ ابلیس بولا تمہاری مرضی لیکن تم قول دے چکے ہو اور اگر تم نے بدعہدی کی تو تمہارا انجام بہت برا ہوگا۔ آخر بہت پس و پیش کے بعد ضحاک نے ابلیس کی بات مان لی اور باپ کو قتل کر کے خود بادشاہ بن گیا۔ ابلیس نے ضحاک کو بہت شاباشی دی۔ اس کے دونوں بازو بڑے پیار سے چومے اور غائب ہو گیا۔ مگر ابلیس کے غائب ہوتے ہی ضحاک کے شانوں سے دو کالے ناگ نکلے اور اپنے پھن ہوا میں لہرانے لگے۔ ضحاک ڈر کے مارے کانپنے لگا اور پورے دربار میں دہشت سے سناٹا چھا گیا۔ کئی پہرے دار تلواریں لے کر لپکے کہ سانپوں کا سر قلم کر دیں مگر کوئی ہتھیار کارگر نہ ہوا۔ تب ابلیس ایک بوڑھے طبیب کے بھیس میں نمودار ہوا اور ضحاک سے مخاطب ہو کر بولا کہ تمہاری تقدیر میں یہی لکھا تھا اور تقدیر کا لکھا کوئی نہیں مٹا سکتا۔ لہٰذا سانپوں کو مارنے کا خیال چھوڑ دو، البتہ ان کو اگر روزانہ دو آدمیوں کا مغز کھلایا جائے تو وہ تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے بلکہ تمہاری جان کی حفاظت کریں گے۔

اب یہ روز کا معمول ہو گیا کہ دو آدمی پکڑ کر لائے جاتے اور ان کا مغز سانپوں کی خوراک بن جاتا۔ اسی طرح ہزاروں بے گناہ ہلاک ہوئے مگر کسی میں اتنی جرأت نہ تھی جو بادشاہ کے اس ظلم کے خلاف آواز اٹھاتا۔

ہوتے ہوتے ایک دن کاوہ آہن گر کی باری بھی آ گئی۔ سپاہی آئے اور اس کے دو بیٹوں کو پکڑ کر لے گئے۔ تب کاوہ سے ضبط نہ ہو سکا۔ اس نے اپنی دھونکنی کے چمڑے سے ایک پرچم تیار کیا اور بازار میں جا کر چیخنے لگا کہ لوگو! تم کب تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہو گے اور ضحاک کے سانپوں کا لقمہ بنتے رہو گے۔ کاوہ آہن گر کی للکار سن کر ہزاروں عورت مرد اس کے پرچم تلے جمع ہو گئے انہوں نے ضحاک کے محل پر دھاوا کر دیا۔ ضحاک قتل ہوا اور ایران میں

عدل و انصاف کا درفشِ کاویانی ایک بار پھر لہرانے لگا۔

درفش کاویانی ایران کی انقلابی روایت کی بڑی درخشاں علامت ہے۔ کاوہ آہن گر اگرچہ افسانوی کردار ہے لیکن دنیا کے کسی دیو مالائی ادب میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ یونانی دیو مالا کا باغی ہیرو پرومیتھوس جس نے انسان کو آگ کا استعمال سکھایا، ہر چند کہ بنی نوع انسان کا محسن ہے مگر خود انسان نہیں ہے، وہ کوہ اولمپس کے خداؤں کی نافرمانی کی بھیانک سزا کو بڑے عزم و استقلال سے برداشت کرتا ہے لیکن ان کو شکست دینے کا یارا اس میں نہیں ہے۔ پھر وہ بالکل اکیلا ہے، اس کے برعکس کاوہ ایک محنت کش انسان ہے اور وہ تنہا نہیں لڑتا بلکہ پوری خلقت کو ایک خونخوار حاکم کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرتا ہے۔

کاوہ آہن گر کوئی فرد نہیں بلکہ ایک فلسفۂ زیست ہے۔ وہ کبھی مانیؔ اور مزدکؔ کے قالب میں ظہور کرتا ہے اور کبھی ابومسلم خراسانی، سن باز، یعقوب ابن لیث، بہافرید زوزانی، استاد سیس خراسانی، یوسف ابرم، ابوعیسیٰ اسحاق اصفہانی، حکیم مقنع مروی، عبداللہ بن میمون اہوازی، بابک خرمی اور منصور حلاج کے پیکر میں ایرانیوں کے قومی تشخص اور آزادیٔ وطن کی نمائندگی کرتا ہے۔ ان شہیدانِ وفا میں کوئی سیاسی رہبر ہے، کوئی مصلحِ قوم ہے، کوئی مفکر ہے، کوئی صوفی ہے اور کوئی شاعر۔

آج جس قومی آزادی کی تحریک کے باعث رضا شاہ پہلوی کو ملک سے بھاگنا پڑا ہے، وہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے بلکہ ایران کے تاریخی ارتقا کا منطقی عمل ہے۔

ایران کی تحریکِ آزادی کے دو دور قابلِ ذکر ہیں۔ پہلا دور جو ایران پر عربوں کے غلبے کا دور تھا اور دوسرا مغربی سامراج کے اثر و نفوذ کا دور جو انیسویں صدی میں شروع ہوا اور آثار بتار ہے ہیں کہ اب شاید جلد ختم ہو جائے۔

عرب حملہ آور ایران پر ساتویں صدی عیسوی میں غالب آئے لیکن ایرانیوں نے عربوں کے تسلط کو ہنسی خوشی کبھی قبول نہیں کیا بلکہ غیر ملکی اقتدار سے نجات پانے کی برابر کوشش کرتے رہے۔ چنانچہ شاید ہی کوئی زمانہ ایسا گزرا ہو جب ایران کے کسی نہ کسی حصے میں خلفاء بنی اُمیہ اور بنی عباس کے خلاف مسلح بغاوت نہ ہوئی ہو۔ بنی امیہ کے خلاف بنی عباس کی فتح یابی کے

جہاں اور اسباب تھے وہاں بڑا سبب ایرانیوں کی حمایت تھا۔ انہوں نے ابومسلم خراسانی کی قیادت میں بنی عباس کا اس خیال سے ساتھ دیا تھا کہ بنی امیہ کے ظلم واستبداد سے نجات ملے گی اور عباسیوں کو جو ایرانیوں کی فوجی طاقت کے سہارے برسرِ اقتدار آئیں گے ایرانیوں کے اشاروں پر چلنا ہوگا۔ چنانچہ ترکوں کی مداخلت سے پیشتر تک عباسی سلطنت کے نظم ونسق پر ایرانی ہی چھائے رہے اور ایرانی تہذیب ہی کا سکہ چلتا رہا۔ غور سے دیکھا جائے تو جس تہذیب کو عموماً اسلامی تہذیب سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ درحقیقت عجمیوں ہی کی کوششوں کا ثمر ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خلفائے بنی عباس کا دربار دیکھتے ہی دیکھتے ساسانی دربار میں تبدیل ہوگیا۔ ایرانی لباس درباری لباس قرار پایا۔ خلیفہ اور خلیفہ زادوں کی شادیاں ایرانی لڑکیوں سے ہونے لگیں۔ نوروز، مہرگان اور رام کے ایرانی تیوہار سرکاری طور پر منائے جانے لگے اور دربار میں ہر جگہ ایرانیوں کو عربوں پر ترجیح دی جانے لگی۔ علومِ دینی میں بھی جو رتبہ عجمی علما نے حاصل کیا وہ عربوں کو نصیب نہ ہوا۔ امام ابوحنیفہ اور امام غزالی جیسے اسلامی شریعت کے ستون ایرانی تھے۔ احادیث نبوی کو ترتیب دینے والے امام بخاری، امام مسلم، ابن ماجہ، قزوینی، ترمذی اور نسائی ایرانی تھے۔ پہلی مستند عربی گرامر کا مؤلف سینبویہ ایرانی تھا۔ خلیفہ امین اور مامون کا استاد ابن حمزہ کسائی ایرانی تھا۔ مشہور مؤرخ طبریؔ، عوفیؔ اور ابنِ قطیبہ ایرانی تھے۔ فرقہ معتزلہ جو روشن خیال مسلمانوں کی پہلی فکری تحریک تھی اس کا بانی واصل بن عطا ایرانی تھا۔ ابوریحان البیرونی اور شیخ بوعلی سینا ایرانی تھے، رہا تصوف سو اس کا تو سارا نظام ہی ایرانیوں کا وضع کردہ ہے۔ اسی بنا پر علامہ اقبال جو تصوف کو ناپسند کرتے تھے مگر مولانا روم کے مرید تھے، عجمی فکر اور فلسفے کے سخت مخالف تھے۔ اُنکا خیال تھا کہ عجمی ذہنیت ہی اسلام کے زوال کا باعث ہوئی۔

لیکن ایران والے عجمی تہذیب کے اس غلبے پر قانع نہیں ہوئے بلکہ اپنی سیاسی آزادی کے لیے برابر جدو جہد کرتے رہے۔ چنانچہ مسلح بغاوتوں کے علاوہ جب بھی کوئی احتجاجی تحریک اٹھی، ایرانیوں نے اُس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، بلکہ سوادِ اعظم کے مسلمہ عقیدوں کے خلاف وقتاً فوقتاً جو فرقے بنتے رہے وہ بھی ایرانی ذہنوں ہی کی پیداوار تھے۔ مثلاً خرمی، مبیضہ اور تمرہ وغیرہ کے بانی ایرانی تھے۔ یہ تحریکیں بظاہر مذہبی تھیں لیکن اُن کے محرکات اور مضمرات سیاسی تھے۔ یہی

وجہ ہے کہ عباسیوں نے ان تحریکوں کو بڑی سختی سے کچلا۔ اسی طرح قرامطہ کی تحریک جس و عالمگیر شہرت ملی، اس کا بانی محمد علی رے، تہران کا رہنے والا تھا۔ وہ کانوں میں کام کرنے والے زنگی مزدوروں اور غلاموں کا سرغنہ تھا۔ یہ زنگی چودہ برس تک (۸۶۹ء تا ۸۸۳ء) بغداد کے خلاف مسلح بغاوت کرتے رہے۔

عباسی دور کے بیشتر مؤرخ ان تحریکوں پر کفر الحاد، زندیقیت اور مزدکیت کے فتوے لگاتے ہیں اور اُن کی تعلیمات کو حددرجہ مسخ کر کے پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ کوئی ایسی اخلاقی برائی نہیں جو ان سے منسوب نہ کی گئی ہو اور لوٹ مار، قتل وغارت گری کوئی ایسا الزام نہیں جو ان پر عائد نہ کیا گیا۔ پھر بھی انہیں مؤرخین کی تحریروں میں جا بجا ایسے اشارے مل جاتے ہیں جن سے ان تحریکوں کے اصل مقاصد پر روشنی پڑتی ہے اور پتہ چلتا ہے کہ ان کے بانی آزادی اور مساوات کے مدعی تھے اور ایک ایسا معاشرہ تعمیر کرنا چاہتے تھے جس میں عدل وانصاف کی حکومت ہو۔ افسوس ہے کہ اب تک ہمارے کسی دانشور نے ان تحریکوں کا غیر جانبداری سے مطالعہ کرنے کی زحمت نہیں کی ہے۔ مشکل یہ ہے کہ ان تحریکوں کے حامیوں کی تصنیفات چن چن کر ضائع کردی گئیں اور محقق مخالفین ہی کی کتابوں سے نتائج اخذ کرنے پر مجبور ہے۔

نادر شاہ (۱۷۳۶ء تا ۱۷۴۷ء) کے قتل کے بعد ایران کے تخت پر زند قبیلے کا سردار کریم خان قابض ہوگیا اور کریم خان کی وفات کے بعد (۱۷۹۰ء) قاچاری قبیلے کا سردار آغا محمد خاں برسرِ اقتدار آیا۔ اس نے تہران کو اپنا دارالحکومت بنایا جہاں قاچاری تقریباً سوا سو سال تک حکومت کرتے رہے۔

ایران انیسویں صدی میں ایک نہایت پسماندہ فیوڈل ریاست تھا۔ اس ملکِ بے آئین میں طاقت کا مرکز بادشاہ کی ذات تھی اور اس کا ہر فرمان قانون کی حیثیت رکھتا تھا۔ عوام کی نمائندگی تو کجا کوئی مجلسِ امرا بھی نہ تھی جو بادشاہ اور عہدہ دارانِ سلطنت کو من مانی کرنے سے باز رکھتی۔ رعایا شہری حقوق سے یکسر محروم تھی بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ لوگ شہری حقوق کے تصور ہی سے ناآشنا تھے۔ زمینیں شاہی خاندان کے افراد اور نوابوں، رئیسوں کے تصرف میں تھیں جو عیش وعشرت میں مگن رہتے تھے۔ البتہ غریب کاشتکاروں کی زندگی انتہائی افلاس اور



تنگ دستی میں بسر ہوتی تھی۔ مجرموں کی کھال کھینچنا، اُن کو زمین میں زندہ دفن کر دینا یا میخوں سے دیواروں اور درختوں میں جڑ دینا، گھوڑوں کی طرح اُن کے پیروں میں نعل ٹھونکنا، جسم میں سوراخ کر کے ان میں موم بتیاں گاڑنا اور ان جلتے ہوئے زندہ شمعدانوں کو گلی کوچوں میں پھرانا، روز مرہ کی سزائیں تھیں۔ حکومت کے مظالم کی مخالفت کرنے والوں کو ان وحشیانہ سزاؤں کا خاص طور سے نشانہ بنایا جاتا تھا تاکہ کوئی سرکش سر اٹھانے کی جرأت نہ کرے۔ پھر بھی احتجاج کی آوازیں اٹھتی رہتی تھیں۔ چنانچہ سلیمان خاں نامی ایک شاعر کے جسم میں جب موم بتیاں گاڑی گئیں اور جلاد اس کا سر قلم کرنے آگے بڑھا تو سلیمان خاں نے مولانا رومؔ کا یہ شعر پڑھا

یک دست جامِ بادہ و یک دست زلفِ یار
رقصے چنیں میانۂ میدانم آرزو است!

(میری آرزو ہے کہ میدانِ کارزار میں رقص کرتے وقت میرے ایک ہاتھ میں شراب کا پیالہ ہو اور دوسرے ہاتھ میں محبوب کی زلف)

ایک اور شہیدِ جفا نے، جب جلاد کی ضرب خالی گئی تو اپنی پگڑی زمین پر پھینک دی اور یہ شعر پڑھا

اے خوش آن عاشقِ سرمست کہ در پای حبیب
سر و دستار نداند کہ کدام اندازد!

(یعنی مبارک ہے وہ سرمست عاشق جس کو خبر نہیں ہوتی کہ دوست کے قدموں پر اس کا سر کہاں گرا اور پگڑی کہاں گری!)

قاچاری اس وقت برسرِ اقتدار آئے جب انقلابِ فرانس کی گونج سے یورپ کے درو دیوار لرز رہے تھے، نپولین کا ستارہ عروج پر تھا، برطانیہ اور فرانس کی رقابت تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی اور زارِ روس ایران پر للچائی نظریں ڈال رہا تھا مگر برطانیہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ اس کے مشرقی مقبوضات، بالخصوص ہندوستان کے قرب و جوار میں نپولین یا زارِ روس کے قدم جمیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایران سامراجی طاقتوں کی سازشوں کی آماجگاہ بن گیا۔ ۱۷۹۹ء میں لارڈ ویلزلی گورنر جنرل ہندوستان نے پہلے مہدی علی حشمت جنگ کو اور پھر سر جان میلکم کو تہران، سفیر بنا کر

بھیجا اور برطانیہ اور ایران کے درمیان دوستی اور تجارت کے پہلے معاہدے پر دستخط ہو گئے لیکن نپولین بھی خاموش بیٹھنے والوں میں نہ تھا۔ ۱۸۰۶ء میں پہلے جنرل رومیو بطور سفیر تہران میں وارد ہوا، اور اس کے پر اسرار قتل کے بعد نپولین نے ژوبر کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا۔ اُس کے جواب میں مرزا محمد رضا ۱۸۰۷ء میں پیرس میں سفیر مقرر ہوئے اور اسی سال فرانس اور ایران کے درمیان ایک تجارتی معاہدہ ہو گیا۔

اس قوت آزمائی میں انگریزوں کا پلہ بھاری رہا۔ نپولین کے زوال کے بعد کوئی طاقت اُن کے راستے میں حائل نہ تھی۔ ایران کے بازار انگریزی مال سے بھر گئے اور ایرانی معیشت جو جاگیردارانہ استحصال کے ہاتھوں پہلے ہی خراب وخستہ تھی، بالکل ہی تہہ وبالا ہو گئی۔ ریاستی امور میں انگریزوں کا عمل دخل اتنا بڑھا کہ ۱۸۳۴ء میں فتح علی شاہ قاچار کی وفات کے بعد جب اس کی اولاد میں جانشینی کا جھگڑا شروع ہوا تو انگریزوں نے اس کے پوتے محمد علی شاہ کے حق میں مداخلت کی اور فوج کی مدد سے جس کا سالار سر ہنری بیتھوئن تھا، محمد علی کو تخت پر لا بٹھایا۔

یہ بحث تو فضول ہے کہ جدید خیالات اور نظریات مشرق میں سامراجی قوتوں کے اثر و نفوذ کے بغیر بھی از خود نشو ونما پاسکتے تھے یا نہیں۔ البتہ تاریخی اعتبار سے ہم بس اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اہلِ مشرق میں اصلاحِ احوال کا احساس مغربی علوم وفنون سے روشناس ہونے کے بعد انیسویں صدی کی ابتدا میں پیدا ہوا۔

مصر میں رفیع الطہطاوی (۱۸۰۱ء۔ ۱۸۷۳ء) نے جو پانچ سال پیرس میں رہ چکے تھے اور روشن خیال فرانسیسی مفکرین سے بہت متاثر تھے اپنی تعلیمات کے ذریعے مصریوں کو مغربی خیالات سے آگاہ کیا تھا اور وطنیت کے جذبے کو اُبھارا تھا۔ اسی طرح ہندوستان میں راجہ رام موہن رائے (۱۷۷۲ء۔ ۱۸۳۳ء) کی 'برہمو سماج' تحریک، ترکی میں 'تنظیمات' کی تحریک جس کا آغاز ۱۸۳۹ء میں سلطان عبدالحمید کے عہد میں 'تنظیماتِ خیریہ' کے اعلان سے ہوا اور ایران میں 'بابی تحریک' بیداریٔ مشرق کی ابتدائی شکلیں تھیں۔

بابی تحریک کے پسِ پشت شیعوں کا یہ عقیدہ تھا کہ ہماری نجات کا ذریعہ امام مہدی ہیں۔ امام مہدی اثنا عشری فرقے کے بارہویں امام ہیں۔ وہ بچپن ہی میں سامرہ کے غار میں غائب

ہو گئے تھے۔ (۸۷۳ء) مگر شیعوں کا خیال ہے کہ وہ مرے نہیں بلکہ ہنوز زندہ ہیں اور جب دنیا میں ظلم اور ناانصافی اور فسق وفجور بہت بڑھ جائیں گے تو امام مہدی ظہور کریں گے اور تب ہر جگہ عدل وانصاف کی حکمرانی ہوگی۔ چنانچہ احمد کسروی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ:۔

> "مشروطیت کی تحریک سے پیشتر ایرانیوں کی امید کا واحد ذریعہ امام غائب تھے۔ ایرانیوں کو یقین تھا کہ ظہورِ امام ہی پر ان کی آئندہ خوشیوں کا اور ملک کی نجات کا دارومدار ہے۔ وہ ہر روز امامِ عصر سے جلد ظہور کرنے کی التجا کرتے رہتے تھے۔"[1]

فتح علی شاہ قاچار کے عہد میں شیخ احمد احسائی نامی ایک ایرانی مجتہد نے یہ کہنا شروع کیا کہ امام مہدی دراصل رحلت کر گئے تھے۔ البتہ وہ اپنی وفات کے ایک ہزار برس بعد دوبارہ پیدا ہوں گے اور وہ وقت آ گیا ہے اور یہ کہ جس طرح مدینۃ العلم حضرت رسولؐ خدا کے 'باب' (دروازہ) حضرت علی تھے اسی طرح میں امام مہدی کا 'باب' ہوں۔ ایران میں یہ تحریک 'شیخین' کے نام سے مشہور ہوئی۔ مگر شیعہ مجتہدوں نے احسائی کی شدت سے مخالفت کی۔ ۱۸۲۶ء میں جب شیخ احسائی انتقال کر گئے تو سید کاظم رشتی ان کے جانشین مقرر ہوئے۔ وہ کربلا میں رہتے اور درس دیتے تھے۔ کاظم رشتی ۱۸۴۳ء میں وفات پا گئے لیکن انہوں نے مرتے وقت کسی کو اپنا جانشین نہیں بنایا۔ البتہ یہ اشارہ ضرور کیا کہ امامِ عصر کا ظہور اب دور نہیں ہے۔

یہ تھا وہ پس منظر جس میں سید محمد علی نامی شیراز کے ایک عالمِ دین نے اپنے باب ہونے کا اعلان کیا۔ سید محمد علی کی بابی تحریک مذہبی تحریک ضرور تھی لیکن اس کے اقتصادی اور سیاسی محرکات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ محمد علی باب شیراز کے تاجر خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ شیراز، یزد اور کرمان کے تاجروں کو تہران سے یہ شکایت تھی کہ حکومت شمالی علاقوں کے تاجروں کی طرفداری کرتی ہے اور جنوبی ایران کے تاجروں کے ساتھ اس کا سلوک معاندانہ ہے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ قاچاریوں نے شیراز اور کرمان وغیرہ میں لوگوں پر بڑے مظالم ڈھائے تھے لیکن تہران کے شیعہ مجتہدوں نے ان مظالم کی مذمت کرنے کے بجائے قاچاریوں کی حمایت کی تھی۔ اس لیے جنوبی ایران والے شیعہ مجتہدوں کو ناپسند کرتے تھے۔ دراصل بابی تحریک ان

شہروں کے متوسط اور تعلیم یافتہ طبقوں کا ردعمل تھی۔ عام مایوسی اور شکست خوردگی کے احساس کے خلاف۔

محمد علی باب اپنی تقریروں میں اُمرا سلطنت کی عیش کوشیوں اور افسرانِ حکومت کی بدعنوانیوں پر کڑی تنقیدیں کرتا اور لوگوں سے کہتا کہ گھبراؤ نہیں وہ دن جلد آنے والا ہے جب ایران میں نہ کوئی امیر ہوگا نہ کوئی محتاج، نہ آقا ہوگا نہ غلام، بلکہ سب کو مساوی حقوق حاصل ہوں گے اور ظلم واستحصال کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس نے اپنے خیالات کی تشہیر کی خاطر ایک کتاب بھی لکھی جس کا نام 'بیان' تھا۔

محمد علی باب کی ان باتوں کا عام لوگوں بالخصوص سوداگروں، ہنرمندوں اور نچلے طبقے کے مولویوں پر بڑا اثر ہوا اور وہ باب کے مرید ہونے لگے مگر شیعہ مجتہدوں نے محمد علی باب کی شدت سے مخالفت کی، اس پر کفر کا فتویٰ لگایا اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ محمد علی باب اور اس کے مریدوں کو قتل کر دیا جائے۔ حکومت بھی باب کے سیاسی نظریات سے خائف تھی اور بابی تحریک کو اپنے لیے خطرہ خیال کرتی تھی۔ چنانچہ محمد علی باب کو قلعہ 'ماہ کوہ' میں قید کر دیا گیا مگر بابیوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔

۱۸۴۸ء میں جب محمد علی شاہ کا انتقال ہوگیا تو بابیوں نے مسلح بغاوت کا عزم کیا۔ چنانچہ سات سو بابی صوبہ ماژندران کے شہر برفروش کے قریب ایک قلعے میں جمع ہوئے اور بغاوت کی تیاری کرنے لگے۔ جلد ہی ان کی تعداد دو ہزار سے زیادہ ہوگئی اور آس پاس کے کاشتکار اور دستکار بھی ان میں شامل ہونے لگے۔ ان کے قائد کا نام محمد علی برفروش تھا۔ اس نے 'عدل وانصاف' کی حکومت کا اعلان کیا۔ تمام جائیداد مشترکہ ملکیت قرار دی گئی اور ہر شخص پر لازم ہوگیا کہ وہ اجتماعی اصولوں کے مطابق محنت کرے اور روزی کمائے۔

مقامی حکام نے اس شورش کو کچلنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ تب اُن کی سرکوبی کے لیے شاہی فوج بھیجی گئی۔ مگر بابیوں نے اس کو بھی مار بھگایا۔ برفروش کی مانند شیخ طبرسی، یزد، نیریز، تبریز اور دوسرے کئی مقامات پر بھی بغاوت کا لاوا پھوٹ پڑا۔

مگر اس تحریک کی بنیادی خامی یہ تھی کہ محمد علی باب نے لوگوں کو کسی واضح سیاسی اور

اقتصادی منصوبے کے تحت منظم کرنے کے بجائے ان کے مذہبی توہمات کو ہوا دی تھی اور ان کو روحانی فضائل وکرامات کے طلسم میں پھنسا کر اپنی ذات کا گرویدہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بابی تحریک شاہی استبداد کے خلاف کوئی ملک گیر تحریک نہ بن سکی بلکہ انتہا پسندوں کا ایک فرقہ بن گئی جس کے عقائد عام ایرانیوں کے عقائد سے مختلف تھے۔ محمد علی باب کے مرید بڑی سے بڑی قربانی سے بھی گریز نہ کرتے تھے لیکن وہ کوئی ایسی مرکزی تنظیم قائم نہیں کر سکے جو بغاوتوں کی رہنمائی کرتی۔ انھوں نے قرونِ وسطیٰ کے ایرانی انقلابیوں کی مانند قلعہ بند ہو کر لڑنے کا جو طریقہ اختیار کیا وہ بھی ان کے حق میں مہلک ثابت ہوا۔ اس کی وجہ سے ان کا عوام سے رہا سہا رابطہ بھی منقطع ہو گیا۔ کمک اور رسد کی راہیں بھی مسدود ہو گئیں اور حکومت کو محصورین کے خلاف جوابی کارروائی کا پورا پورا موقع مل گیا۔

محمد علی باب کو ۱۸۵۰ء میں قتل کر دیا گیا اور قلعہ بند بابیوں کا قلع قمع کرنے کے لیے تیس ہزار سپاہیوں کا لشکر روانہ ہوا۔ بابی ہر جگہ بڑی بہادری سے لڑے لیکن محصورین نے فوج کی اس یقین دہانی پر کہ ہتھیار ڈال دو تو تمھیں معاف کر دیا جائے گا، جب ہتھیار ڈال دیے تو جوانوں، بوڑھوں، عورتوں، بچوں سب کو بڑی بے دردی سے ہلاک کر دیا گیا۔ اِکا دکا بابی جو بچ رہے تھے وہ روپوش ہو گئے۔ البتہ اگست ۱۸۵۲ء میں ایک سر پھرے بابی نے سلطان ناصر الدین قاچار پر قاتلانہ حملہ کیا تو بابیوں پر دوبارہ تشدد شروع ہوا۔ ان کو چن چن کر گرفتار کیا گیا اور بڑے بھیانک طریقوں سے موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ کہتے ہیں کہ فقط تہران میں ایک دن میں اسّی بابیوں کو سخت جسمانی ایذائیں دے کر قتل کیا گیا۔ ایران کی شعلہ نفس شاعرہ قرۃ العین طاہرہ بھی ان مقتولین میں تھیں۔

ایران میں سامراجی طاقتوں کی ریشہ دوانیاں یوں تو انیسویں صدی کے اوائل میں شروع ہو گئی تھیں لیکن ایران سامراجی معیشت اور سیاست کے تابع دراصل سلطان ناصر الدین کے عہد میں ہوا۔ یہ شخص پچاس برس تک ایران کی گردن پر سوار رہا۔ اس کی نا اہلی اور ناعاقبت اندیشی سے فائدہ اٹھا کر برطانیہ اور روس نے ایران کو جی بھر کے لوٹا اور قرضوں اور ٹھیکوں کے ذریعے ترقی کی تمام راہیں مسدود کر دیں۔

قاچاریوں کے سوا سو سالہ دورِ حکومت میں کوئی ایک فرمانروا بھی ایسا نہ ہوا جس کو وطن کا درد ہوتا یا جو ذاتی مفاد ہی کی خاطر اصلاحِ احوال کی فکر کرتا۔ ملک میں فیوڈل عناصر اتنے طاقتور تھے کہ تجارت پیشہ طبقے کو آگے بڑھنے کا موقع ہی نہ ملتا تھا اور نہ سرمائے کا ارتکاز ہو سکتا تھا۔ حالانکہ سرمائے کے ارتکاز کے بغیر جدید صنعتی نظام کی بنیاد نہیں پڑ سکتی۔ ادھر برطانیہ اور روس ایرانی معیشت کی جڑوں کو دیمک کی طرح چاٹ رہے تھے۔ ان کی یہی کوشش تھی کہ ایران ان کو خام مال، روئی، تمباکو وغیرہ فراہم کرتا رہے اور ان کی مصنوعات کی منڈی بن جائے۔ وہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ ایران میں مشینی صنعت و حرفت کو فروغ ہو۔

سلطان ناصر الدین ۱۸۴۸ء میں تخت پر بیٹھا۔ جب یورپ میں بورژوا قومی انقلاب کی تحریکیں عروج پر تھیں اور فیوڈل بادشاہتوں کا خاتمہ ہو رہا تھا۔ لیکن یحییٰ آرین پور کے بقول 'کشورِ ایران ان انقلابی دگرگونیوں سے بالکل بے خبر تھا۔' نظم و نسق کے مصارف بڑھتے جاتے تھے البتہ آمدنی میں اضافے کی کوئی صورت نہ تھی۔ حتیٰ کہ سرکاری ملازمین کو تنخواہیں بھی وقت پر نہیں ملتی تھیں۔ ایسی صورت میں قرض کے سوا چارہ نہ تھا۔ انگریز بخوشی قرض دینے کو تیار تھے مگر ساہوکار بلا ضمانت قرض کہاں دیتا ہے۔ چنانچہ مالی ضروریات کے لیے ۱۸۵۸ء میں ایک انگریزی کمپنی انڈو یورپین ٹیلی گراف کمپنی کو ٹیلی گراف لائن بچھانے کی رعایت دی گئی۔ اس ایک نشانے سے انگریزوں نے دو شکار کیے۔ ہندوستان اور لندن کے درمیان اپنا مواصلاتی رابطہ درست کر لیا اور ایران میں چودہ مرکز قائم کیے جو جاسوسی کے اڈے بھی تھے اور قبائلیوں میں رشوت بانٹنے کے مرکز بھی۔ ۱۸۷۳ء میں سلطان ناصر الدین شاہ کو یورپ کے سفر کے لیے جب روپے کی پھر ضرورت پڑی تو رائٹر نامی ایک انگریز کو پورے ایران میں ریلوے لائن بچھانے کا ٹھیکہ دیا گیا اور کانکنی کی رعایت بھی۔ ۱۸۸۹ء میں انگریزوں نے تہران میں پہلا بینک امپیریل بینک آف پرشیا کے نام سے کھولا اور اس طرح ایرانی سرمائے ہی کے ذریعے ایران کو اپنا دستِ نگر بنانے کا انتظام کر لیا اور مراعات کا بازار گرم ہو گیا۔ چنانچہ سلطان نے نوٹ چھاپنے کا اختیار بھی اسی بینک کو دے دیا۔ اس درمیان میں ٹھیکہ حاصل کرنے والے انگریزوں کی تعداد اتنی بڑھی کہ خود لارڈ کرزن کو شکایت کرنی پڑی۔ ۱۸۹۰ء میں ٹیلبوٹ نامی ایک انگریز کو دریائے

کارون پر جہاز رانی کا ٹھیکہ دیا گیا۔ قالین سازی ایران کی قدیم صنعت ہے، جو مقامی تاجروں کی اجارہ داری تھی۔ انگریزوں نے ایران میں جگہ جگہ اپنی فیکٹریاں قائم کر لیں اور ایرانی دستکاروں کو ملازم رکھ کر خود قالین بنانے اور برآمد کرنے لگے۔ پانی سر سے اونچا ہوتا جارہا تھا اور ایرانیوں کا پیمانۂ صبر لبریز ہوتا جارہا تھا۔

۱۸۹۰ء میں ناصر الدین شاہ نے پندرہ ہزار پونڈ سالانہ کے عوض ایک انگریز کمپنی کو ایران میں تمباکو کی کاشت اور خرید و فروخت کی اجارہ داری پچاس برس کے لیے دے دی۔ اس رعایت سے پورے ایران میں تہلکہ مچ گیا۔ کیونکہ اس سے پیشتر جو ٹھیکے تقسیم ہوئے تھے ان سے تھوڑے لوگ براہِ راست متاثر ہوئے تھے۔ تمباکو کی اجارہ داری سے ایران کے شہر، دیہات سبھی متاثر ہوئے تھے چنانچہ ایرانی قوم ایک دم چیخ اٹھی۔ ایرانی مجتہدوں نے فتویٰ دے دیا کہ تمباکو پینا، تمباکو کاشت کرنا اور اس کی خرید و فروخت سب حرام ہے۔

لوگوں نے حقہ پینا ترک کردیا، یہاں تک کہ جب سلطان نے فتوے کے دوسرے دن حقہ طلب کیا تو شاہی ملازموں نے حقے کو ہاتھ لگانے سے انکار کردیا۔ آخر اس ملک گیر مقاطعے سے مجبور ہوکر سلطان نے اجارہ داری کا معاہدہ منسوخ کردیا۔ مطلق العنان شہنشاہی کی یہ پہلی شکست تھی لیکن اب سوال پانچ لاکھ پونڈ کی واپسی کا تھا جو سلطان نے کھا پی کر اڑا دیے تھے۔ ناچار یہ رقم امپیریل بینک سے چھ فیصد سود پر قرض لی گئی اور سود کی سال بہ سال ادائیگی کے لیے خلیجِ فارس کی بندرگاہوں، بوشہر اور خرم شہر کی محصولات کی وصولی انگریزوں کے ہاتھ رہن رکھ دی گئی۔

سلطان کے خلاف نفرت اور برہمی بڑھتی جاتی تھی۔ چنانچہ ۱۸۹۶ء میں سلطان کی پچاس سالہ جوبلی سے چند روز پیشتر سید جمال الدین افغانی کے ایک شاگرد مرزا محمد رضا کرمانی نے ناصر الدین شاہ کو گولی مار کر ہلاک کردیا۔

ایران میں پہلوی دور کا آغاز اس وقت ہوا جب دنیا میں ملوکیت کا دور ختم ہونے کے قریب تھا۔ بادشاہوں کے ایوانِ اقتدار ریت کے گھروندوں کی مانند گر رہے تھے۔ زارِ روس، قیصرِ جرمنی، آسٹریلیا، ہنگری اور ترکی کی شہنشاہیاں خاک میں مل چکی تھیں۔ ہر طرف سلطانی جمہور کا غلغلہ تھا۔ مشرقی ملکوں میں آزادئ وطن کی تحریکیں عروج پر تھیں اور کرۂ ارض کا چھٹا حصہ

سوشل ازم کے آفتاب تازہ سے روشن تھا۔

بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں دو ایسے اہم تاریخی واقعات پیش آئے جن کے سبب سے لاکھوں، کروڑوں انسانوں کی تقدیریں بدل گئیں۔ پہلا واقعہ ۱۹۱۴ء۔ ۱۹۱۸ء کی عالمگیر جنگ کی صورت میں رونما ہوا اور دوسرا انقلاب روس کی شکل میں۔ ۱۹۱۴ء کی عالمگیر جنگ سامراجی طاقتوں کی باہمی رقابتوں کا نتیجہ تھی۔ اس جنگ کی وجہ سے جو تباہی مچی اس کے اقتصادی، سیاسی، اخلاقی اور نفسیاتی اثرات سے دنیا کا کوئی گوشہ محفوظ نہ رہ سکا۔ آگ اور خون کا یہ ہلاکت خیز کھیل ابھی جاری تھا کہ روس میں انقلاب آ گیا۔ ایسا انقلاب جس نے سرمایہ داری، جاگیرداری نظام کو جڑ سے ہلا دیا اور روس میں محنت کشوں کی پہلی سوشلسٹ ریاست قائم ہوگئی۔ مگر روسی انقلاب کے اثرات روس کی سرحدوں تک محدود نہ رہے بلکہ بہت دور رس اور دیرپا ثابت ہوئے۔ بالخصوص مشرق میں جہاں بھی محکوم قوموں نے اس انقلاب کو اپنے حق میں آزادی کی نوید سمجھا۔ محکوم ملکوں کی وطنی تحریک ایک نئی منزل میں داخل ہوگئی۔

مشرقی ملکوں میں وطنیت کا جذبہ یوں تو عرصے سے آہستہ آہستہ پرورش پا رہا تھا لیکن پہلی جنگ عظیم کے بعد وطنیت باقاعدہ ایک فلسفۂ زیست بن کر ابھری اور وطنیت کے معنی ومفہوم اور اس کی قدروں میں بڑی وسعت پیدا ہوگئی۔ اب ہر قوم اپنے آپ سے یہ سوال کرنے لگی کہ ہم درحقیقت کون ہیں؟ ہماری اصل کیا ہے؟ ہماری جڑیں کہاں ہیں؟ ہم اپنی قومی شخصیت کو کس طرح پہچانیں اور پھر اس شخصیت کو کن خطوط پر ترقی دیں؟ یہ تھے وہ سوالات جن کی خلش نے مشرقی قوموں کو اپنے ماضی کی تلاش وتحقیق پر آمادہ کیا۔ چنانچہ تاریخ کے ان نقوش میں جو صدیوں کی بے توجہی کے باعث دھندلے پڑ گئے تھے، نیا رنگ بھرا گیا۔ پرانی تہذیب، پرانی زبان اور پرانے علوم وفنون سے ناواقفیت کی وجہ سے معاشرے میں جو احساسِ بیگانگی پیدا ہوگیا تھا اس کو رفع کرنے کی تدبیریں سوچی جانے لگیں۔ اسلاف کے کارنامے افسانوں، ناولوں، نظموں اور ڈراموں کا موضوع بن گئے۔ پرانے زمانے کے تاریخی اور نیم تاریخی ہیروؤں کو قوم کے مثالی کرداروں کے روپ میں دوبارہ زندہ کیا جانے لگا۔ کلاسیکی رقص، موسیقی، مصوری اور دوسرے فنونِ لطیفہ کی بدولت لوگوں کے جذبات واحساسات کو قومی تفاخر کی روحانی غذا میسر آئی

اور ان میں جو خود آگہی اور خود اعتمادی پیدا ہوئی اس کی وجہ سے وطنیت کی تحریک کو بڑی تقویت حاصل ہوئی۔

اس تاریخی عمل کے مظاہر ہم کو مصر، ترکی، ایران، عراق، ہندوستان اور چین غرضیکہ مشرق کے ہر ملک میں ملتے ہیں۔ مصر میں جب عرب وطنیت نے زور پکڑا تو عہد فراعنہ کی تاریخ اور تہذیبی آثار کو قومی ورثے کا رتبہ عطا ہوا۔ ترکوں نے پانچ ہزار برس پرانی حتیٰ کہ تہذیب کے وارث ہونے کا دعویٰ کیا اور وہ اپنی جڑیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے توران تک پہنچ گئے۔

اہلِ عراق کو ناز تھا کہ دنیا میں تہذیب کا سب سے پہلا گہوارہ دجلہؔ وفرات کی وادی ہے اور اسی سرزمین پر بابل کے شہنشاہ حمورابی نے دنیا کا پہلا تحریری آئین نافذ کیا تھا۔ ہندوستانیوں نے وادئ سندھ کی تہذیبِ قدیم کا سراغ لگایا اور اپنا رشتہ آریاؤں کی آمد سے قبل کی دراوڑی تہذیب سے جوڑا۔ ایرانی اس لحاظ سے خوش قسمت تھے کہ عربوں اور تاتاریوں کے سات سو سالہ تسلط کے باوجود ان کا تہذیبی تسلسل کبھی نہیں ٹوٹا۔ ان کی زبان زندہ رہی جب کہ دوسری تمام پرانی زبانوں کے نام ونشان تک مٹ گئے اور ان کے ہیروؤں کے کارناموں کو فردوسیؔ نے زندۂ جاوید بنادیا۔

قومی تفاخر کا یہ رجحان ترکی اور ایران میں نسلی عصبیت کی شکل میں رونما ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دونوں ہی ملک عرب توسیع پسندی کے زخم خوردہ تھے۔ وطن پرست ترکوں کو عربوں سے یہ شکایت تھی کہ ان کے اصولِ حیات کی پیروی کے باعث ترکوں کی قومی شخصیت مسخ ہوگئی اور وہ مغرب میں رہتے ہوئے مغربی قوموں کی طرح ترقی نہ کرسکے۔

حقیقت یہ ہے کہ عثمانیوں کے دور میں ترکی پر عرب اور ایرانی اتنے حاوی تھے کہ غیرت مند ترکوں کے لیے آزاد فضا میں سانس لینا مشکل تھا۔ ان کی درباری اور تہذیبی زبان فارسی تھی، مذہبی زبان عربی تھی اور ادب کی زبان عربی، فارسی اور ترکی کا ملغوبہ جس کو عام ترک سمجھ بھی نہ سکتا تھا یہی زبان بالائی طبقوں میں بولی جاتی تھی لہٰذا عوام اور خواص کے درمیان بیگانگی کی خلیج بڑھتی جاتی تھی۔ ترک کی اصطلاح اجڈ گنواروں کے لیے مخصوص تھی، پڑھے لکھے حضرات اپنے آپ کو ترک کہتے ہوئے شرماتے تھے۔

ترک وطنیت کی تحریک اسی شرمناک صورتحال کا قدرتی ردعمل تھی چنانچہ ترکی وطنیت کی اساس دو اصولوں پر رکھی گئی۔

۱۔ نسلی عصبیت کہ ہم ترک ہیں، ہماری زبان ترکی ہے اور ہم قدیم ترک تہذیب کے جانشین ہیں۔

۲۔ مغربی تمدن یعنی مغرب کی معیشت اور معاشرت، مغربی طرزِ حکومت اور مغربی طریقۂ تعلیم کا رواج۔ کمال اتاترک اور اُن کے رفقاء نے ترکی کی نئی ریاست کو انہیں اصولوں پر منظم کیا۔ ملوکیت اور خلافت کو اس بنا پر ختم کردیا گیا کہ یہ دونوں ادارے اپنی افادیت کھو چکے ہیں اور ترکی وطنیت کے فروغ کی راہ میں حائل ہیں۔ عربی رسم الخط ترک کر کے لاطینی رسم الخط اختیار کیا گیا۔ عربی گرائمر مسترد ہوگئی اور ترکی لغت سے عربی فارسی کے الفاظ یک لخت خارج کردیے گئے۔ ترکوں نے عثمانی دور کی مشرقی روایتوں سے یہاں تک قطع تعلق کرلیا کہ اب ان کے نام بھی خالص ترکی ہوتے ہیں۔ اب کوئی ترک عربی یا فارسی نام نہیں رکھتا۔

ایرانیوں نے اپنی تاریخ، اپنی تہذیب اپنی زبان اور اپنے ادب پر ہمیشہ فخر کیا ہے۔ اسی کے ساتھ عربوں اور ترکوں سے ان کی نفرت کی روایت بھی بہت پرانی ہے۔ وہ عربوں کو بڑی حقارت سے گوہ خور اور ترکوں کو خرکار کہتے تھے اور ان کے عہدِ اقتدار کو ایران کی تاریخ کا دورِ سیاہ سمجھتے تھے۔ مشروطہ کے زمانے میں یہ رجحانات بڑی شدت سے ابھرے اور جب رضا خاں سپہ دار تخت پر قابض ہوا تو اس نے قومی تفاخر کے ان رجحانات سے خوب فائدہ اٹھایا۔

ہر ریاست نظریاتی ریاست ہوتی ہے۔ یہ ریاستی نظریہ کبھی سیاسی ہوتا ہے، کبھی اقتصادی اور کبھی مذہبی اس کے ذریعے ریاست کے باشندوں کو اطاعت کا خوگر بنایا جاتا ہے۔ ان کے دل ودماغ کو ریاست کے اغراض و مقاصد کے مطابق ڈھالا جاتا ہے اور یہ بات ذہن نشین کرائی جاتی ہے کہ ان کا اور ریاست کا مفاد مشترکہ ہے، حالانکہ حقیقت میں ریاست ایک طبقاتی ادارہ ہے جس کا بنیادی مقصد برسرِ اقتدار طبقے کے مفادات کا تحفظ ہوتا ہے۔

رضا خاں سپہ دار کو اپنی ریاست کے جواز اور استحکام کے لیے اگر کوئی نظریہ درکار تھا تو اس ضرورت کو ایرانیوں کی نسلی عصبیت نے پورا کردیا۔ لہٰذا نسلی عصبیت نئی ایرانی ریاست کا

سیاسی نظریہ قرار پائی۔ رضا خاں سپہ دار رضا شاہ پہلوی بن گیا۔ ایرانِ جدید کا رشتہ ہخا منشی اور ساسانی دور سے جوڑا گیا کہ ایرانی تاریخ کا سنہرا زمانہ وہی تھا۔ 'وحشی گری عرب' کو ایرانی معاشرے کی تمام خرابیوں کا ذمے دار ٹھہرایا گیا۔ اس کے برعکس ایران کی سابقہ عظمت کا سہرا پرانے بادشاہوں کے سروں پر باندھا گیا تا کہ لوگوں کے ذہن میں یہ بات بیٹھ جائے کہ ایرانی تاریخ کا مرکز بادشاہ کی ذات ہوتی ہے اور ایران بادشاہ ہی کی کوششوں سے دوبارہ بڑی طاقت بن سکتا ہے۔ تاریخ کی کتابیں اسی زاویے سے لکھی جانے لگیں۔ درسی کتابوں میں بھی اسلام سے قبل کے کارناموں کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جانے لگا۔ تاریخی افسانوں، ڈراموں اور ناولوں میں اُن ایرانیوں کو ہیرو بنا کر پیش کیا گیا جو کسی نہ کسی وقت میں عربوں سے لڑے تھے۔ آثار قدیمہ کی کھدائی پر خاص توجہ دی گئی اور قدیم فارسی زبان اور ادب کے سیکھنے سکھانے کا انتظام کیا گیا۔ اس شاعری کی حوصلہ افزائی کی گئی جس میں شاہ پرستی کا پہلو نکلتا ہو یا اطاعت و بندگی کی تلقین کی گئی ہو۔ فوجیوں کی تعلیم و تربیت میں شاہنامے کے حصوں کو نمایاں جگہ دی گئی۔ فردوسی کو ایران کا سب سے بڑا قومی شاعر قرار دیا گیا چنانچہ ۱۹۳۶ء میں فردوسی کا جشن، ایران کے گوشے گوشے میں بڑی دھوم دھام سے منایا گیا اور اس کی یادگار قائم کی گئی۔

ہٹلر سے بھی ساز باز کی ایک وجہ یہی نسلی عصبیت تھی کیونکہ رضا شاہ کی مانند ہٹلر بھی آرین قوم کی بڑائی کو سیاسی حربے کے طور پر استعمال کرنے کا قائل تھا اور ریاست کو جارحانہ نسل پرستی کی بنیادوں پر مستحکم کرنا چاہتا تھا۔ ہٹلر کہتا تھا کہ یورپ کے جس حصے میں جرمن آباد ہیں وہ جرمن ریاست کا اٹوٹ انگ ہے۔ رضا شاہ میں اس قسم کا دعویٰ کرنے کی طاقت تو نہ تھی البتہ اس نے بمبئی، پونا، کراچی اور دوسری جگہوں کے دولت مند پارسیوں کا تعاون حاصل کرنے کی پوری کوشش کی اور ان کو یہ باور کرایا کہ ایرانی ریاست پارسیوں کے مذہب اور تہذیب کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ ایرانِ جدید کا زرتشتیوں کے ساتھ یہ طرزِ عمل خالص پروپیگنڈہ نہ تھا بلکہ ایرانی محققوں اور دانشوروں نے اپنے زرتشتی ورثے کے مطالعے میں بڑے خلوص کا ثبوت دیا اور زرتشتیات کے علمی ذخیرے میں بیش بہا اضافے کیے۔ عربی ناموں کا رواج رفتہ رفتہ بہت کم ہو گیا اور نئی نسل کے تعلیم یافتہ لوگوں نے ہخامنشی اور ساسانی دور کے نام اختیار کر لیے۔

البتہ اسلام پسند حلقوں نے اس تہذیبی احیا کو ہمیشہ شک کی نظر سے دیکھا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اسلاف پرستی کی مہم دراصل اسلام دشمن عناصر کی سازش ہے جو وطنیت کی آڑ میں اسلام کی بیخ کنی کے درپے ہیں۔ چنانچہ ایک ایرانی ادیب رضا خاں سپہ دار کے دور کی علمی اور ادبی سرگرمیوں پر تنقید کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

'درآن بیست سالہ از ادبیات گرفتہ تا معماری واز مدارس گرفتہ تا دانش گاہ ہمہ مشغول زردشتی بازی وہخا منشی سازی اند'

یعنی ان بیس برسوں میں ادبیات سے لے کر تعمیرات تک اور مدرسوں سے یونیورسٹیوں تک ہر شخص زردشتی بازی اور ہخامنشی سازی میں مشغول رہا۔ جلال آل احمد اس 'زردشت بازی' کی مثال دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ 'مجھے یاد ہے کہ جرمنی کی دوا ساز کمپنی ''بائر'' نے اپنی ایسپرین کا ایک اشتہار بنایا تھا جس میں ایک بیمار عورت جو غالباً ملکۂ وقت ہے بستر پر لیٹی ہے اس کا سر شاہ کی گود میں ہے اور کوروش اور اردشیر اور اسی قبیل کے دوسرے بزرگ طاقِ آسمان سے باہر آ کر ملکہ کی عیادت کر رہے ہیں اور پارسیوں کا فرشتۂ رحمت 'فروہر' اس منظر پر اپنے پروں کا سایہ کیے ہوئے ہے'[۲]

رضا شاہ کے بیٹے نے باپ کی حکمتِ عملی کو خوب فروغ دیا۔ رضا خاں سپہ دار نے پہلوی حسب نسب اختیار کیا تھا بیٹا آریہ مہر یعنی آریاؤں کا سورج بن گیا۔ باپ نے فردوسیؔ کا جشن منایا تھا، بیٹے نے ایرانی شہنشاہیت کا ڈھائی ہزار سالہ جشن منایا۔

دوسرا رجحان جس کو ترقی دینے میں روشن خیال ادیبوں اور دانشوروں نے حکومت سے تعاون کیا، مغربی علوم وفنون اور مغربی ادب کی ترویج و اشاعت تھی چنانچہ سیاسیات، اقتصادیات، عمرانیات، تاریخ، فلسفہ اور ادب کی بے شمار تصنیفات فارسی میں ترجمہ ہوئیں۔ ان میں کلاسیکی تخلیقات بھی تھیں اور دورِ جدید کی مطبوعات بھی۔ ان ترجموں کی بدولت ایران کے پڑھے لکھے لوگ بالخصوص طلبا مغربی افکار ونظریات سے برابر روشناس ہوتے رہے۔ اس اعتبار سے پہلوی دور کو اگر ترجموں کا دور کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

لیکن پہلوی دور میں ایرانیوں کو اپنے ملک کے سیاسی اور اقتصادی مسائل پر اظہارِ رائے

کی آزادی کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ کوئی اخبار یا رسالہ اشاروں کنایوں میں بھی شاہ اور اس کے نظم ونسق پر اعتراض نہیں کر سکتا تھا اور اگر کرتا تو اسے اپنے کیے کا سخت خمیازہ بھگتنا پڑتا تھا۔ کتابوں کے ناشر طبع زاد تحریروں کی طباعت واشاعت سے گریز کرتے تھے کیونکہ سنسر والے مسودوں کی جانچ پڑتال طباعت سے پہلے نہیں بلکہ طباعت کے بعد کرتے تھے۔ اگر سنسر طبع شدہ کتاب کو نامنظور کر دیتا تو کتاب کے چھپے ہوئے نسخے بحق سرکار ضبط ہو جاتے تھے۔ اس مالی نقصان کے خوف سے ناشر حضرات مسودوں کے انتخاب میں بڑی احتیاط برتتے تھے۔ لہٰذا ارباب قلم عموماً اُن موضوعات پر قلم اٹھاتے تھے جن کا ایران کے موجودہ دور سے تعلق نہ ہوتا تھا۔

پہلوی حکومت ادیبوں سے اتنی خوفزدہ رہتی تھی کہ ان کی بے ضرر اصلاحی تحریروں کو بھی برداشت نہیں کیا جاتا تھا مثلاً ۱۹۷۵ء میں ایک گشتی ناٹک کمپنی نے سعید سلطان پور کا ایک ڈراما 'اساتذہ' کھیلا۔ اس ڈرامے میں اساتذہ کا کردار پیش کیا گیا تھا جو طلباء کی معلومات میں اضافہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر ناکام ہو کر سیاسی عمل کی باتیں شروع کر دیتے ہیں۔ اسی ناٹک کمپنی نے سوویت ادیب میکسم گورکی اور جرمن ادیب بارتولد بریخت کے ڈرامے بھی اسٹیج کیے تھے۔ حکومت نے ان ڈراموں پر ریاست دشمن رجحانات کا الزام لگایا اور ناٹک کمپنی کے پورے طائفے کو دو تا گیارہ سال قید سخت کی سزا دے دی۔

۱۹۴۱ء — ۱۹۵۳ء کا زمانہ نسبتاً آزادی کا زمانہ تھا۔ اس دور کے ادیب مارکسزم اور سوشلزم سے بہت متاثر تھے اور انہوں نے ملک کے معاشرتی اور سیاسی مسائل پر کھل کر تنقیدیں کی تھیں۔ انہوں نے پہلی بار ترقی پسند ادیبوں کی انجمن — کانون نویسندگان — بھی بنائی تھی۔ ۱۹۴۳ء میں کانون نویسندگان کی جانب سے ایرانی ادیبوں کی ایک کانفرنس ہوئی تھی اور کانفرنس میں کئی مقالے پڑھے گئے تھے لیکن ۱۹۷۰ء میں کانون نویسندگان کو خلاف قانون جماعت قرار دے دیا گیا اور اس کے سرگرم کارکن گرفتار کر لیے گئے۔ ایک ممتاز ادیب بزرگ علوی نے مشرقی جرمنی میں پناہ لی۔ صمد بہرنگی کو جو بچوں کی کتابیں لکھتا تھا دریا میں ڈبو دیا۔ جلال آل احمد کو اس کی قیام گاہ میں قتل کر دیا گیا اور ساواک نے جلال کے اہل خاندان کو تجہیز و تکفین کی اجازت بھی نہیں دی اور خسرو گل سرخی کو ایک جھوٹے مقدمے میں پھنسا کر پھانسی دے دی گئی۔

بہت سے ادیب اس تشدد اور دہشت انگیزی کی تاب نہ لا سکے۔ بعضوں نے شاہ سے سمجھوتہ کر لیا یا فراری ادب کے تجربے کرنے لگے یا گردو پیش سے بے تعلق ہو کر اپنی ذات میں گم ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سیاسی گھٹن کے باعث احتجاجی ادب کی روایت آہستہ آہستہ کمزور ہو گئی۔ پہلوی دور کا فارسی ادب قنوطیت، بے بسی، مایوسی اور شکست کا شکار ہو گیا ادبی تحریریں بالخصوص نظموں اور غزلوں میں 'دیوار'، 'تنہائی'، 'مکڑی کے جالے'، 'اندھیرا' اور اسی نوع کی دوسری علامتوں کی بھرمار ہو گئی۔ صادق ہدایت ایرانِ جدید کی چوٹی کے ادیبوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کا ایک مختصر ناول 'بوف کور' (اندھا الو) ہے جو دورِ حاضر کا بہترین ناول خیال کیا جاتا ہے۔ یہ ناول پہلوی ادیبوں کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کی بڑی سچی تصویر ہے۔ ناول یوں شروع ہوتا ہے۔

'در زندگی زخم های هست که مثلِ خوره روح را آهسته در انزوامی خورد ومی تراشد. این درد ها رانمی شودبه کسی اظهار کرد، چون عموماً عادت دارند که این دردهای باور نه کردنی راجزو اتفاقات وپیش آمد های نادر و عجیب به شمارند. زیرا بشر هنوز چاره ودوای برایش پیدا نه کرده و تنها داروی آن فراموشی به توسط شراب و خواب مصنوعي به وسیلۀ افیون و موادِ مخدره است. ولی افسوس که تاثیر این گونه داروها موقت است و بجای تسکین پس از مدتی برشدت درد میافزاید.'[۳]

یعنی 'زندگی میں اتنے زخم ہیں جو کوڑھ کی طرح روح کو تنہائی میں کھائے جاتے ہیں۔ اس دکھ کا اظہار بھی ممکن نہیں کیونکہ لوگ ایسی ناقابل یقین تکلیفوں کو اتفاقات عجوبہ پر محمول کرتے ہیں...... انسان نے ابھی تک اس درد کی دوا دریافت نہیں کی ہے۔ لوگ اس غم کو شراب پی کر یا افیون اور اسی قسم کی دوسری خواب آور منشیات استعمال کر کے بھلانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن افسوس کہ ان دواؤں کا اثر بہت عارضی ہوتا ہے اور وہ تسکین دینے کے بجائے تکلیف

میں اور اضافہ کر دیتی ہیں۔

خود صادق ہدایت (۱۹۰۳ء۔ ۱۹۵۲ء) کی زندگی اسی احساسِ تنہائی کی نذر ہو گئی۔ وہ جب تک تودہ سے وابستہ رہے ان کو کبھی تنہائی محسوس نہیں ہوئی بلکہ وہ ایک مصروف اور با مقصد زندگی گزارتے رہے۔ البتہ تودہ سے علیحدگی کے بعد وہ بالکل بے سہارا ہو گئے اور ذہنی سکون کی تلاش میں سرگرداں پھرتے رہے۔ کبھی بمبئی، کبھی برلن، کبھی پیرس اور جب فوج اور سی۔ آئی۔ اے نے ڈاکٹر مصدق کی حکومت کو برطرف اور ڈاکٹر مصدق کو قید کر دیا تو صادق ہدایت اس المیے کی تاب نہ لا سکے۔ انہوں نے پیرس میں خودکشی کر لی۔

پہلوی کارفرماؤں نے ادیبوں کو عوامی تحریکوں سے دور رکھنے اور ان کی قوت تخلیق کو شل کرنے کی غرض سے جسمانی اذیت، قید اور قتل کے علاوہ ایک اور نسخہ بھی تیار کیا تھا جس سے یورپ کے فاشسٹ بھی بے خبر تھے اور یہ نسخہ تھا چرس اور افیون کا استعمال۔ چنانچہ ساواک کے گماشتے ادیبوں کو جیل خانے میں چرس نوشی یا افیون کی طرف مائل کرتے اور یہ زہر ان کو مفت فراہم کرتے، یہاں تک کہ ادیبوں کو منشیات کی لت پڑ جاتی اور جیل سے نکلنے کے بعد وہ کسی کام کے نہ رہتے تھے۔

لیکن جبر و استبداد کی ان حشر انگیزیوں کے باوجود ایرانیوں کا کاروانِ آگاہی آگے بڑھتا رہا۔ شمعیں جلتی اور بجھتی رہیں مگر انجمن زندہ رہی اور انجمن کو روشنیوں سے منور کرنے والوں کے عزم و استقلال میں بھی کمی نہیں آئی۔ شاعروں اور ادیبوں نے کبھی ظلم اور ناانصافی کے پرانے قصوں کے حوالے سے، کبھی طنزیہ تمثیلوں کے سہارے، کبھی علامتی اور رمزیہ اندازِ بیان اختیار کر کے لوگوں کے مسائلِ حیات پر غور کرنے کی دعوت دی۔ مثلاً صادق چوبک اپنی ایک کہانی میں کوّوں کی آڑ لے کر رضا شاہ پہلوی پر طنز کرتا ہے۔ اس قصے میں بادشاہ اپنے محل کے جھروکے میں کھڑا دوربین سے باہر کا منظر دیکھ رہا ہے۔ دفعتاً اس کی نگاہ اپنے مجسمے پر پڑتی ہے جو شہر کے چوک میں نصب ہے اور جس کے اردگرد سینکڑوں کوّے منڈلا رہے ہیں۔ وہ بادشاہ کے تاج پر ٹھونگیں مارتے ہیں، اس پر بیٹ کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس غلاظت سے مجسمے کا چہرہ ڈھک جاتا ہے۔ یہ دیکھ کر بادشاہ کو بہت غصہ آتا ہے اور وہ حکم دیتا ہے کہ شہر کے سب کوّوں

کو مار دیا جائے یا گرفتار کرلیا جائے۔ کوّوں کو شاہی فرمان کی خبر ہوتی ہے تو وہ سیاہ لباس پہن کر روتے پیٹتے ملک سے بھاگ جاتے ہیں۔

پروین اعتصامی ایران کے دورِ جدید کی سب سے ممتاز شاعر خاتون تھیں۔ وہ ۱۹۰۶ء میں تبریز میں پیدا ہوئیں لیکن بچپن ہی میں اپنے والد یوسف اعتصام الملک کے ہمراہ تہران آ گئیں اور بقیہ عمر وہیں رہیں۔ انہوں نے ۱۹۲۴ء میں امریکی کالج سے تعلیم مکمل کی۔ ۱۹۳۴ء میں ان کی شادی چچازاد بھائی سے ہوگئی لیکن دو ماہ بعد علیحدگی ہوگئی اور پھر بقیہ عمر اپنے میکے میں رہیں اور وہیں عالمِ شباب میں ۱۹۴۱ء میں وفات پائی اور قم میں دفن ہوئیں۔

ملک الشعرا بہار نے مرثیہ لکھا جس کا آخری شعر یہ ہے۔

شگفت وعطر بیفشاندو خنده کرد و برفت
نتیجه گل افسرده عاقبت این بود

(ایک پھول تھا کھلا، خوشبو پھیلائی، ہنسا اور رخصت ہوگیا۔ مرجھائے پھول کا انجام یہی ہونا تھا)

پہلوی دور کے سبھی شاعروں کی مانند پروین اعتصامی اپنا مدعا علامتوں اور استعاروں میں بیان کرتی ہیں۔ 'خون کے دو قطروں کے درمیان مناظرہ' اسی نوع کی رمزیہ نظم ہے جس میں بادشاہ کے خون کا قطرہ مزدور کے خون کے قطرے سے مصروفِ کلام ہے۔

یکی به گفت به آن دیگری تو خونِ که ای
من اُوفتاده ام این جا ز دستِ تاجوری

(ایک قطرے نے دوسرے قطرے سے پوچھا تو کس کا خون ہے۔
میں تو بادشاہ کے ہاتھ سے ٹپکا ہوں)

بگفت من به چکیدم زپای خار کنی
ز رنج خار، که رفتش به پا چونیشتری

(اس نے جواب دیا کہ میں ایک لکڑہارے کے پاؤں سے ٹپکا ہوں۔
کانٹے کی تکلیف سے جو پاؤں میں نشتر کی طرح چبھتا ہے)

شاہی قطرے نے کہا اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ خون کے جی قطروں کا رنگ سرخ ہوتا ہے خواہ وہ کسی کے بدن سے ٹپکیں اور رگ سے نکلیں یا شریان سے۔ آؤ ہم دونوں مل کر بڑا قطرہ بن جائیں اور متحد ہو کر سعی و عمل کی راہ پر چلیں تا کہ راستے کے خطروں سے محفوظ رہیں اور چھوٹے چھوٹے ندی نالوں سے بچ کر کسی بڑے دریا میں شامل ہو جائیں۔ اس پر لکڑہارے کے خون کا قطرہ ہنسا۔

به خنده گفت، میان من وتو فرق بسی ست
توئی زدست شهی، من زپای کار گری

(وہ ہنس کر بولا کہ مجھ میں تجھ میں بڑا فرق ہے۔ تو شاہ کے ہاتھ سے ٹپکا اور میں مزدور کے پاؤں سے)

برای همرهی واتحاد با چومنی
خوش است اشک یتیمی دخون رنجیری

(میری ہمراہی اور دوستی کے لیے تو یتیم کے آنسو اور محنت کار کا خون ہی مناسب رہے گا)

تو از فراغ دل وعشرت آمدی به وجود
من از خمیدن پشتی وزحمت کمری!

(تو آرام اور عشرت کی پیدا وار ہے جب کہ میں پیٹھ کے جھکاؤ اور کمر کے بوجھ سے پیدا ہوا ہوں۔)

ترا به مطبخ شه پخته شد همیشه طعام
مرا به آتش آهی و آب چشم تری

(تیری پرورش شاہ کے باورچی خانے میں پکے ہوئے کھانے سے ہوئی ہے...... اور میری پرورش آہوں کی آگ اور بھیگی آنکھوں کے پانی سے)

تو از فروغ می ناب سرخ رنگ شدی
من از نکوهش خاری وسوزش جگری

(تجھ میں سرخی سرخ رنگ کی شراب سے آئی ہے۔ اور مجھ میں کانٹے کی چوٹ اور جگر کی جلن سے)

قضاو حادثه نقش من از میان نه برد
کدام قطرهٔ خون را بود چنین هنری

(میرا نقش تقدیر اور حادثے سے نہیں مٹ سکتا۔ یہ وصف اور کس خون کے قطرے میں ہے)

درین علامتِ خونیں نهان دو صد دریاست
زساحلِ همه، پیداست کشتیٔ ظفری

(اس خونی علامت میں دوسو دریا پوشیدہ ہیں اور انہیں کے ساحل سے فتح کی کشتی نمودار ہوتی ہے۔)

زقید بندگیٔ ایں بستگان شوند آزاد
اگر به شوق رهائی زنند بال وپری

(اطاعت اور غلامی کی قید میں پھنسے ہوئے لوگ اگر رہائی کی خاطر اپنے بازو اور پر ہلائیں تو آزاد ہوسکتے ہیں۔)

پہلوی جبرو استبداد کی اس سے بہتر مذمت اور کیا ہوسکتی تھی......؟ پروین واضح لفظوں میں ایرانیوں کو بتاتی ہے کہ اربابِ اقتدار اور محنت کش عوام کے درمیان اتحاد ممکن نہیں۔ اتحاد تو محنت کاروں اور مصیبت زدوں کے درمیان ہوتا ہے نہ کہ لوٹنے اور لٹنے والوں کے مابین۔ لہٰذا ایرانی عوام کو لازم ہے کہ متحد ہو جائیں۔ اطاعت اور بندگی کا شیوہ ترک کردیں اور اپنے ہاتھ پاؤں کو آزادی کی خاطر جنبش دیں۔

نادر، نادر پور میں ۱۹۲۹ء میں پیدا ہوا۔ اس کا شمار دورِ حاضر کے صفِ اوّل کے شاعروں میں ہوتا ہے۔ اس کے چار پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور وہ فرانسیسی زبان اور ادب پر بھی پوری قدرت رکھتا ہے۔

شعر انگور

چه می گوئید؟
کجا شهداست این آبی که درهر دانهٔ شیرین انگور است!
کجا شهداست؟ این اشک است
اشک باغبان پیر رنجور است
که شب هاراه پمیوده
همه شب تا سحر بیدار بوده
تاکها را آپ داده
پشت راچون چُفته های سو، دو تا کرده
دل هردانه را انه اشک چشمان نور بخشیده
تن هر خوشه را باخون دل شاداب پر ورده
چه می گویند؟
کجا شهداست این آبی که درهر دانهٔ شیرین انگور است
کجا شهداست؟ این خون است
خونِ باغبان پیر رنجور است
چنیں آسان مگیر یدش
چنیں آسان منو شیدش
شماهم ای خریداران شعر من
اگر دردانه های نازک لفظم

و یا در خوشه های روشن شعرم
شراب وشهدمی بیند، غیر از اشک وخونم نیست
کجا شهداست؟ این اشک است، این خون است

شرابش از کجا خواندید، ای مستی نه آن مستی ست
شما از خون من مستید، از خونی که می نوشید
از خون ولم مستید
مرا هر لفظ فریادی ست کز دل می کشم بیرون
مرا هر شعر دریای است
دریای است لبریز از شراب وخون
کجا شهداست، این اشکی که در هر دانۂ لفظ است
کجا شهداست، این خونی که در هر خوشۂ شعراست
چنیں آسان میفشارید بر هر دانہ لبها، وبر هر خوشه دندان را
مرا این کاسۂ خون است
مرا این ساغر اشک است
چنیں آسان مگیریدش
چنیں آسان منو شیدش

(ترجمہ)

تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟
انگور کے میٹھے دانوں میں شہد کہاں بھرا ہے
شہد کہاں؟ یہ تو آنسو ہیں
بوڑھے اور دکھیا باغبان کے آنسو
جو راتوں کو راستہ تاکتا رہتا ہے
اور شام سے جاگ کر صبح کرتا ہے
اور انگور کی بیلوں کو پانی دیتا ہے
جس کی پیٹھ بٹے ہوئے بالوں کی طرح دوہری ہوگئی ہے۔
جو اپنے آنسوؤں سے انگور کے ہر دانے کو روشنی بخشتا ہے

اور ہر خوشے کے بدن کو اپنے خونِ دل سے شاداب کرتا ہے۔

تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟

انگور کے میٹھے دانوں میں شہد کہاں بھرا ہے

شہد کہاں؟ یہ تو خون ہے۔

بوڑھے اور دکھیا باغبان کا خون۔

اے میرے اشعار کے خریدارو!

تم میرے اشعار کو بھی معمولی مت سمجھو

اور نہ ان کو بے توجہی سے پی جاؤ

اگر تم کو میرے نازک لفظوں کے دانوں میں

یا میرے شعروں کے چمکیلے خوشوں میں

شراب اور شہد نظر آئے تو یہ میرے اشک وخوں کے سوا کچھ نہیں

شہد کہاں؟ یہ تو آنسو ہیں۔ یہ تو خون ہے۔

تم میرے خون سے مست ہو، وہ خون جو تم پیتے ہو

میرے خونِ دل سے مست ہو

میرا ہر لفظ ایک فریاد ہے جو میں اپنے دل سے کھینچتا ہوں۔

میرا ہر شعر ایک دریا ہے

شراب اور خون سے لبریز

میرے الفاظ کا ہر دانہ آنسو ہے، شہد کہاں؟

میرے ہر شعر کا خوشہ خون ہے، شہد کہاں؟

ہر دانے کو اپنے لبوں سے اور ہر خوشے کو اپنے دانتوں سے بیقدری سے مت توڑو

میرے نزدیک یہ خون کا پیالہ ہے

میرے نزدیک یہ آنسوؤں کا ساغر ہے

اس کو بے توجہی سے نہ پکڑو

اس کو لا پرواہی سے مت پیو
سرور خشم

....

آهن گران پیر همه پتکها بدست
با چهره های سوخته در نور آفتاب
چون اخترانِ سرخ به تاریکئ غروب
چشمان پر از نوید فرح بخش انقلاب

(بوڑھے آہن گر جن کے ہاتھوں میں ہتھوڑے ہیں۔ سورج کی دھوپ سے جھلسے ہوئے چہرے۔ شام کے اندھیرے میں سرخ ستاروں کی مانند۔ ان کی آنکھوں میں انقلاب کا فرحت بخش پیغام۔)

پتک گران به دست ودهانها پرُ از خروش
فریاد شان گسسته در آفاق شامگاه!
روئیده دردیارِ افق خوشۂ های خشم
افسرده بر لبان شفق بوسۂ های ماه

(ہاتھ میں ہتھوڑا اور منہ میں جوشیلی آوازیں۔ ان کا شور شام کے وقت چاروں طرف بکھرا ہوا۔ ہر سمت ان کے غصے اور جلال کے خوشے اُگے ہوئے جیسے شفق کے ہونٹوں پر چاند کے مغموم بوسے)

پندارشتی غریو خدایان آسمان
پیچیده در کرانۂ خاموش زندگی
بگر فته از فروغِ شفق رنگ انتقام
آن گونه ها کد سوخته از شرم بندگی

(سو، تو سمجھتا ہے کہ آسمان کے خداؤں کا شور ہے جو زندگی کے خاموش ساحل پر پھیلا ہوا

ہے۔ شفق سے انتقام کا رنگ نکلا ہے۔ اطاعت کی شرم سے جلے ہوئے۔)

از سینه ها رسید به لبها سرود خشم
افگنده در حریم دل آسود گان هراس
گفتی بر آستانهٔ این شامگاه تلخ
در هم خزیده سایهٔ مردان ناشناس

(غصے کا راگ سینے سے ہونٹوں پر آ گیا۔ اور اس نے دولت مندوں کے گھروں میں خوف پیدا کر دیا۔ کوئی کہے گویا اس کڑوی شام کی چوکھٹ پر ناشناسوں کے سائے رینگ رہے ہیں)

خواند به پاس روز ظفر بادِشامگاه
شکرانه ای گسستن زنجیر بندگی!
آهن گران پیر همه پتکها به دست
در چشمشان طلیعهٔ خورشید زندگی

(شام کی ہوا فتح کے دن کی خاطر۔ اطاعت کی زنجیر ٹوٹنے کا شکرانہ گا رہی ہے۔ بوڑھے آہن گر جن کے ہاتھوں میں ہتھوڑے ہیں اور جن کی آنکھوں سے زندگی کے سورج کی روشنی نکل رہی ہے۔

احمد شاملو (متخلص بہ ا ــــ بامداد) ۱۹۲۵ء میں تہران میں پیدا ہوا۔ وہ دورِ جدید کے ان شاعروں میں شمار ہوتا ہے جن کی پرورش پہلوی دور میں ہوئی لیکن وہ ان انتہا پسندوں میں نہیں ہے جو پرانی شاعری کو یک قلم مسترد کر دیتے ہیں بلکہ وہ 'شعر کہنہ' اور 'شعر نو' کی تقسیم کو بھی تسلیم نہیں کرتا بلکہ اس کے نزدیک 'شعر اگر شعر است، جادوانگی در خمیر مایه انست واگر نیست که خود شعر نیست'۔[۳۶]

احمد شاملو ایک درجن کتابوں کا مصنف ہے، اب تک اس کے پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ اس نے ہسپانوی شاعر لورکا (جس کو فاشسٹوں نے ۱۹۳۷ء میں قتل کر دیا) کے مشہور ڈرامے 'بلڈ ویڈنگ' کا ترجمہ 'عروسی خون' کے نام سے شائع کیا ہے اور امریکہ کے ترقی

پسند افسانہ نگار ارسکین کالڈویل کی چودہ کہانیوں کا مجموعہ 'قصہ ہائے بابام' کے نام سے شائع کیا ہے۔

احمد شاملو کی ایک نظم 'دررزم زندگی' ہے جس کو ایران کے نئے دور کا رجز کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس نظم میں شاعر اپنے ہم وطنوں کو للکارتا ہے کہ اٹھو اور زندگی اور موت بودو بنود کے درمیان جو پیکار ہو رہی ہے اس میں شریک ہو جاؤ۔

در زیر طاق عرش، بر سفرۂ زمین
در نور و در ظلام

....

در بود
در نبود
هر جا که گشته است نهان ترس وحرص ورقص
هر جا که مرگ هست
هر جاکه رنج می برد انسان ز روز و شب
هر جا که بخت سرکش فریاد می کشد
(ترجمہ)
آسمان کے طاق کے نیچے اور زمین کے دسترخوان پر
روشنی اور تاریکی میں

....

وجود میں
اور عدم میں
جہاں کہیں خوف، لالچ اور عیش کوشی چھپی ہے
جہاں کہیں موت چھپی ہے۔
جہاں کہیں انسان کے روز و شب تکلیف میں بسر ہوتے ہیں

جہاں کہیں تقدیر کی سرکشی کو فریاد کرنا پڑتی ہے۔

....

هر جاکه درد روئی کند سوی آدمی
هر جاکه زندگی طلبه زنده رابه رزم
بیرون کش از نیام
از زور و ناتوانائی خود هر دو ساخته
تیغی دودم

....

جہاں کہیں درد کا رخ انسان کی جانب ہے
جہاں کہیں زندگی زندہ لوگوں سے جدو جہد کا تقاضا کرتی ہے
وہاں پر اپنی تلوار کو جس پر تمہاری طاقت اور کمزوری کی
دہری آب چڑھی ہے
نیام سے کھینچ لو

احمد شاملو کی ایک طویل نظم 'شعری کہ زندگی ست' ہے جس میں شاعر پرانی اور نئی شاعری کا موازنہ پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

موضوع شعرِ شاعر پیشین
از زندگی نه بود
در آسمان خشک خیالش، اُو
جز باشراب ویار نمی کرد گفتگو
وغیره وغیره

پرانے زمانے کے شاعروں کا موضوع سخن
زندگی نہ تھا
وہ اپنے خشک خیالوں کے آسمان میں بیٹھ کر

شراب اور شاہد کے سوا اور کوئی گفتگو نہیں کرتے تھے۔

....

موضوع شعرِ امروز
موضوع دیگری است
امروز شعر، حربۂ خلق است
زیراکه شاعران
خود شاخۂ زجنگل خلق اند
نه یاسمین وسنبل گلخانۂ فلان
بیگانه نیست شاعر امروز
بادرد های مشترک خلق
او با لبان مردم، لب خندمی زند
در دو اُمید مردم را
با استخوان خویش
پیوند زند

(اس کے برعکس) دورِ حاضر کے شعر کا موضوع
کچھ اور ہے۔
آج شعر عوام کا حربہ ہے
اس لیے کہ آج شاعر
خود عوام کے جنگل کی شاخیں ہیں۔
نہ کہ کسی مخصوص فرد کے باغ کی چنبیلی اور سنبل
آج کا شاعر عوام کے مشترکہ دکھوں سے
بے تعلق نہیں ہے۔

وہ عوام ہی کے ہونٹوں سے ہنستا ہے
اور ان کی امیدوں میں اپنی ہڈیوں کا پیوند لگاتا ہے

....

الگوئی شعرِ سآر امروز؟
گفتیم
زندگی ست
آرزوی زندگی ست که شاعر
باآب ورنگ شعر
نقشی به روی نقشهٔ دیگر
تصویر می کند
او شعرمی نویسد
یعنی
اوستِ می نهد به جراهات شهر پیر
یعنی
اوقصه می کند به شب از صبح دلپذیر
او شعرمی نویسد
یعنی
اُو دردهای شهر ودیارش را
فریاد می کند
یعنی اُوباسرودِ خویش روان های خسته را
آباد می کند
او شعری نویسد
یعنی

او قلب های سرد وتهی مانده را ز شوق
سر شار می کند
یعنی
او روبه صبح طالع، چشمان خفته را
بیدار می کند
او شعری نویسد
یعنی
او افتحار نامۂ انسانِ عصر را
تفسیر می کند
یعنی
او فتح نامه های زمانش را
تقریر می کند
......
شاعرِ امروز کے شعر کا پیکر؟
میں نے کہا
زندگی ہے
شاعر زندگی ہی کے چہرے سے
شعر کے رنگ اور روشنی کے ذریعے
ایک نقش کو سامنے رکھ کر دوسرا
نقش بناتا ہے،
وہ شعر لکھتا ہے۔
یعنی
وہ پرانی زندگی کے زخموں کو چھیڑتا ہے

یعنی

وہ رات سے دلکش صبح کا قصہ بیان کرتا
ہے
وہ شعر لکھتا
ہے
یعنی

وہ شہر اور دیہات کے دکھوں کی
فریاد کرتا
ہے
یعنی

وہ اپنے نغموں سے تھکی ماندی روحوں میں
جان ڈالتا ہے
وہ شعر لکھتا
ہے
یعنی

وہ ٹھنڈے اور سنسان دلوں کو جذبۂ شوق
سے سرشار کرتا
ہے
یعنی

اس کا رخ طلوع ہونے والی صبح کی جانب ہوتا ہے اور وہ
سوئی ہوئی آنکھوں کو جگا تا ہے
وہ شعر لکھتا
ہے
یعنی

وہ عصر حاضر کے انسان کے عروج کی تاریخ کی
تفسیر کرتا
ہے
یعنی

وہ اپنے عہد کی فتوحات کی تاریخ
بیان کرتا ہے

حوالہ جات

۱۔ احمد کسروی، 'تاریخ مشروطیت در ایران'۔

۲۔ جلال ال احمد، 'خدمت وخیانتِ روشن فکراں' (تہران)، ص ۱۱۸۔

۳۔ صادق ہدایت، 'بوف کور'، ص ۹۔

۴۔ احمد احمدی وحسین رزم جو، 'سیرِ سخن' جلد دوم (مشہد، ۱۹۴۴ء)، ص ۵۴۲۔

دوسرا باب

بیداری کی لہر

قوموں میں حقوق کا شعور ایک دن میں نہیں پیدا ہوتا بلکہ بیداری کی لہروں کو طاقت پکڑنے میں بہت وقت لگتا ہے۔ بے شمار چھوٹے بڑے واقعات پیش آتے ہیں۔ ان گنت چھوٹی بڑی تحریکیں اٹھتی ہیں۔ تب کہیں زندگی کی موجوں میں روانی آتی ہے، جمود کی دیواروں میں شگاف پڑنے لگتے ہیں اور پھر کوئی زور کا ریلا آتا ہے جو کہنگی کے ملبوں کو خس وخاشاک کی طرح بہا لے جاتا ہے۔

ایرانی معاشرے میں ان دنوں جو اُبال آیا ہوا ہے اُس کی پشت پر ایرانی محبانِ وطن کی سو، سوا سو سال کی جدو جہد کی سرفروشانہ روایتوں کا ایک سلسلہ ہے۔ اس جدو جہد کے محرکات اقتصادی اور سیاسی تھے۔ البتہ ایرانیوں کو خواب غفلت سے جگانے، ان میں اپنے حقوق کا احساس اور ان حقوق کے لیے لڑنے کا حوصلہ پیدا کرنے میں وہاں کے صحافیوں، ادیبوں اور دانشوروں نے بڑی گراں بہا خدمات سرانجام دی ہیں۔ وہ شاہی جبرو استبداد اور سامراجی ریشہ دوانیوں کے مقابل معاشرے کا ہرآول دستہ بن کر سامنے آئے اور فکروفن کے امین ہونے کے ناطے اُن پر جو ذمے داریاں عائد ہوتی تھیں، انہوں نے ان ذمے داریوں کو احسن طریقے پر پورا کیا۔

بیداریٔ ایران کی تاریخ کو چار ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور جس پر انقلاب فرانس کا اثر نمایاں ہے، سلطان ناصر الدین شاہ کے قتل پر ختم ہوا۔ یہی زمانہ سامراجی مداخلتوں کے آغاز کا بھی ہے۔ دوسرا دور ۱۹۰۳ء میں شروع ہوا اور پہلی جنگِ عظیم پر ختم ہوا۔ اسی کو مشروطہ کا دور بھی کہتے ہیں۔ تیسرا دور جس میں روشن خیال ایرانی ادیبوں نے انقلاب روس سے کسبِ فیض کیا اور چوتھا دور جس کو ہم پہلوی دور سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

ایران میں بیداری کی لہریں سب سے پہلے آذربائیجان میں اُٹھیں جو ایران کا مغربی علاقہ ہے اور جس کی سرحدیں ترکی اور روس سے ملتی ہیں۔ روسی قفقاز اور ایرانی آذربائیجان کے باشندے ہم نسل، ہم زبان اور ہم مذہب ہیں۔ ان میں آپس میں رشتے داریاں بھی ہوتی تھیں اور عام طور پر آنا جانا رہتا تھا۔ قاچاریوں کے دور میں استبداد اور افلاس سے تنگ آ کر ہزاروں آذربائیجانی تلاش روزگار میں باکو، تفلس اور دوسرے شہروں میں آباد ہو گئے تھے۔ وہ تیل کے چشموں میں کام کرتے تھے جہاں اُن کا ملنا جلنا روسی اور قفقازی مزدوروں سے ہوتا تھا۔ وہاں مزدوروں کی ٹریڈ یونین سرگرمِ عمل تھیں اور اخبار اور رسالے شائع ہوتے تھے جو لوگوں کو یورپ کے حالات سے مطلع کرتے رہتے تھے۔ کئی انقلابی تنظیمیں بھی تھیں جو خفیہ طور پر زارِ روس کے خلاف لڑتی رہتی تھیں۔ رفتہ رفتہ آذربائیجانی تارکینِ وطن بھی ان تحریکوں سے متاثر ہونے لگے چنانچہ مرزا جعفر نامی ایک آذربائیجانی نے ایران میں ایک چھاپہ خانہ ۱۸۱۸ء میں تبریز میں قائم کیا اور اس طرح ایران میں افکارِ جدید کی نشر و اشاعت کی داغ بیل ڈالی۔ مغربی علوم کی کتابوں کے ترجمے سب سے پہلے تبریز ہی میں شائع ہوئے اور تبریز افکارِ نو اور انقلابی تحریکوں کا مرکز بن گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ایران کی بیشتر سیاسی، تہذیبی اور ادبی تحریکوں کا آغاز تبریز ہی سے ہوا اور آج بھی تبریز ترقی پسند انقلابی سرگرمیوں کا سب سے بڑا مرکز خیال کیا جاتا ہے۔

ایران میں پہلا اخبار جس کا نام 'اعلان نامہ' تھا، ۱۸۳۷ء میں محمد علی شاہ قاچار کے عہد میں تہران سے شائع ہوا۔ اس کے ایڈیٹر مرزا صالح شیرازی تھے اور اس اخبار میں زیادہ تر سرکاری خبریں چھپتی تھیں۔ کچھ عرصے کے بعد تہران، تبریز اور شیراز وغیرہ سے بھی متعدد اخبار اور رسالے شائع ہونے لگے۔ ان میں ملکی اور بیرونی خبروں کے علاوہ ایران کی پستی اور زبوں

حالی کا تذکرہ بھی ہوتا تھا اور حکومت پر نکتہ چینی بھی کی جاتی تھی۔ مگر سلطان ناصر الدین شاہ قاچار نے تخت پر بیٹھتے ہی ان تمام اخباروں کی اشاعت یک قلم موقوف کردی جو حکومت پر اعتراض کرتے تھے اور فرمان جاری کر دیا کہ 'کوئی کتاب، اخبار یا جریدہ حکومت کے ملاحظے کے بغیر شائع نہیں ہوسکتا'۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے کئی ممتاز اہلِ قلم نے قفقاز، استنبول، مصر، لندن، بمبئی، کلکتہ اور برلن میں پناہ لی اور وہاں سے اخبار اور رسالے شائع کرنے لگے۔ یہ اخبار اور رسالے تاجروں، سیاحوں اور دوسرے ذریعوں سے خفیہ طور پر ایران بھیجے جاتے اور بڑے شوق سے پڑھے جاتے تھے۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

ارشاد (باکو)، اختر (استنبول)، قانون (لندن)، حکمت (قاہرہ)، ثریا (قاہرہ)، پرورش (قاہرہ) اور حبل المتین (کلکتہ) ان میں سب سے کثیر الاشاعت 'اختر' تھا جس کے ایڈیٹر آقا محمد طاہر تبریزی تھے۔ اس اخبار کے بارے میں آقا یحییٰ آرین پور لکھتے ہیں کہ:۔

> 'روزنامہ اختر کی شہرت اور مقبولیت کا ایران، قفقاز، ہندوستان اور عراق غرضیکہ جہاں کہیں فارسی دان موجود تھے، یہ عالم تھا کہ قفقاز میں جہاں اخبار بینی کفرو گناہ سمجھی جاتی تھی ان لوگوں کو جو اختر شوق سے پڑھتے تھے "اختری مذہب" کا پیرو کہا جاتا تھا'۔[1]

سلطان ناصر الدین نے اخباروں پر پابندی لگا کر یہ سمجھا تھا کہ اس نے ایرانی قوم کو جدید افکار کے اثر سے محفوظ کرلیا ہے لیکن خیالات تو روحِ عصر کے تقاضوں کا اظہار ہوتے ہیں۔ اُن کو دیوارِ چین بھی نہیں روک سکتی۔ علاوہ ازیں برطانیہ، فرانس اور روس کے ساتھ سفارتی اور تجارتی تعلقات کی وجہ سے ایران کے بعض بالائی طبقوں میں بھی مغربی افکار آہستہ آہستہ پرورش پانے لگے تھے۔ ایرانی تاجروں کی بیرونِ ملک آمدو رفت بڑھتی جارہی تھی۔ بہت سے ایرانی تاجروں نے کلکتہ، بمبئی، مدراس اور مشرقِ قریب کے ساحلی شہروں میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی مگر وہ وطن آتے رہتے تھے۔ اُن کی تجارتی ضرورتوں کا بھی تقاضا تھا کہ ملک کے کاروبار کو جدید طریقوں پر استوار کیا جائے۔ خود سلطان کا وزیرِ اعلیٰ مرزا تقی خان تجارت پیشہ تھا

اسی دوران میں انہوں نے ایک کتاب 'یک کلمہ' لکھی جس میں آئین کی ضرورت قانون کے احترام اور فرد کے حقوق کی حمایت کی گئی تھی۔ مستشار الدولہ پہلے ایرانی دانشور تھے جنہوں نے یہ کہنے کی جرأت کی تھی کہ ایران میں اقتدارِ اعلیٰ کے مالک ایرانی باشندے ہیں اور یہ کہ ریاست کا کاروبار لوگوں کی منشا اور مرضی سے چلنا چاہیے۔ انہوں نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ ریاست کو مذہب سے الگ رکھنا چاہیے۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے حقوق مساوی ہونے چاہیے اور شاہ وگدا کو قانون کی نظر میں برابر کا درجہ ملنا چاہیے۔

ایرانی مؤرخین ان کی کتاب کو آزادی خواہوں کا پہلا منشور کہتے ہیں۔ اس کتاب نے لوگوں کو بیدار کرنے اور اپنے حقوق کا احساس دلانے میں غیر معمولی خدمت سرانجام دی۔ ۱۹۰۵ء میں جب 'انجمن مخفی' کی تشکیل ہوئی تو یہی کتاب اربابِ انجمن کی سیاسی رہنما بنی۔

مستشار الدولہ نے کتاب لکھنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ۱۸۸۶ء میں ایک طویل خط ولی عہد مظفر الدین قاچار کو لکھا اور درخواست کی کہ اس خط کو سلطان کی خدمت میں پیش کر دیا جائے۔ اس خط میں انہوں نے بادشاہ کو حکومت کے استبدادی طرزِ عمل اور درباریوں کی سازشوں سے مطلع کیا تھا اور نظم ونسق میں اصلاح کرنے، ریاست کا آئین وضع کرنے، باشندوں کو شہری آزادی دینے اور ان کے ساتھ مساوی برتاؤ کرنے کی تجویز پیش کی تھی اور آخر میں شاہ کو متنبہ کیا تھا کہ اگر ایران کو آئینی ریاست نہ بنایا گیا تو انجام برا ہوگا۔

سلطان یہ خط پڑھ کر آگ بگولا ہو گیا۔ اُس کو پہلے ہی شک تھا کہ روزنامہ 'اختر' میں سلطان کے خلاف جو مضامین چھپتے ہیں اس کا مصنف بھی مستشار الدولہ ہی ہے۔ مستشار الدولہ کو گرفتار کر کے قزوین لایا گیا اور قید خانے میں زنجیروں سے باندھ کر کندہ مار دیا گیا۔ قید میں ان کو طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں اور کوڑے بھی مارے گئے مگر انہوں نے معافی نہیں مانگی اور پانچ ماہ بعد رہا کر دیئے گئے۔

دوسرا دانشور جس نے عہد ناصری میں ایرانیوں کی ذہنی بیداری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، عبدالرحیم طالبوف تھا۔ وہ تبریز کے ایک مُحلا ہے کا بیٹا تھا۔ تلاشِ معاش میں سولہ سترہ سال کی عمر میں تفلس چلا گیا جو ان دنوں قفقاز اور ایران کے انقلابیوں کا مرکز تھا۔ وہاں اس نے روسی

زبان سیکھی اور روس کے ترقی پسند ادیبوں کی تصنیفات غور سے پڑھیں۔ ہر چند کہ وہ داغستان میں شادی کر کے وہیں کا ہو رہا مگر وطن کی محبت کو وہ کبھی دل سے نہ نکال سکا۔ اس نے بہ کثرت کتابیں نہایت آسان زبان میں لکھیں تاکہ معمولی پڑھا لکھا ایرانی بھی سائنس اور دیگر علومِ جدیدہ کی مبادیات سے واقف ہو جائے۔

ان تصنیفات کی وجہ سے ایران میں اس کو اتنی شہرت ملی کہ جب ۱۹۰۶ء میں مجلس شورائے ملی کا پہلا انتخاب ہوا تو عبدالرحیم طالبوف کو اس کی غیر حاضری میں تبریز سے مجلس کا رکن چنا گیا مگر وہ ضعیفی کی وجہ سے مجلس میں شریک نہ ہو سکا۔ ۱۹۱۲ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔

عبدالرحیم طالبوف کی سب سے مقبول تصانیف 'سفینۂ طالبی' یا کتاب 'احمد' اور 'مسالک المحسنین' ہیں۔ 'سفینۂ طالبی' چھوٹی موٹی انسائیکلو پیڈیا ہے جو مکالمے کے پیرائے میں لکھی گئی ہے۔ اس کتاب میں بیٹا باپ سے سوال کرتا ہے اور باپ اس کو بجلی، بھاپ، دور بین، کیمرہ، تھرمامیٹر، دیا سلائی، کاغذ سازی، خط میخی، کششِ ثقل، ہجری دور، کانسے اور لوہے کا زمانہ، طبقات الارض اور طبقات البحر اور سائنسی انکشافات اور ایجادات کے ابتدائی اصول سمجھاتا ہے۔

'مسالک المحسنین' طالبوف کا خیالی سفرنامہ ہے جس میں اس نے ملک کے اخلاقی، معاشرتی اور تعلیمی مسائل کا علومِ جدیدہ کی روشنی میں جائزہ لیا ہے۔

اسی دور کا ایک اور مصنف حاجی زین العابدین مراغئی ہے جو روسی ادیبوں بالخصوص گوگول سے بے حد متاثر ہے۔ طالبوف کی مانند وہ بھی آذربائیجان کا باشندہ تھا۔ ۱۸۳۸ء میں پیدا ہوا۔ خاندانی پیشہ تجارت تھا مگر کاروبار نہ چلا تو قسمت آزمائی کرنے تفلس چلا گیا۔ اخبار نویسی کا شوق اس کو استنبول، پھر قاہرہ لے گیا جہاں وہ فارسی اخباروں میں لکھتا رہا۔ اس نے ۱۹۱۱ء میں استنبول میں وفات پائی۔

مراغئی کی سب سے مشہور کتاب 'سیاحت نامہ ابراہیم بیگ' ہے، جس کو فارسی ادب میں کلاسیکی مرتبہ حاصل ہے۔ یہ کتاب ایک خیالی سفرنامہ ہے جس میں گوگول کے طنزیہ انداز میں ایرانی معاشرے کی پستی کا نہایت مضحکہ خیز نقشہ کھینچا گیا ہے۔ یہ سیاحت نامہ ۱۸۸۸ء میں پہلے قاہرہ اور پھر استنبول سے شائع ہوا۔ مصنف نے ابتدا میں قہرِ سلطانی کے خوف سے اپنا نام ظاہر نہیں

کیا البتہ شک کی بنا پر جب کئی ایرانی معتوب ہوئے تو حاجی زین العابدین نے اعتراف کرلیا۔

'سیاحت نامے' کے مطابق حاجی ابراہیم بیگ ایک آذر بائیجانی تاجر ہے جو مصر میں رہتا ہے۔ وہ وطن کی سیاحت کے شوق میں استنبول، باطوم، تفلس، باکو، انزلی اور عشق آباد ہوتا ہوا مشہد میں وارد ہوتا ہے۔ استنبول میں اس کی ملاقات مصنف سے ہوتی ہے جو ابراہیم کو رخصت کرتے وقت طالبوف کی کتاب 'احمد' اس کو بطور تحفہ نذر کرتا ہے۔ ابراہیم راستے میں اس کتاب کو پڑھتا ہے تو اس کو بہت غصہ آتا ہے اور وہ مصنف کو خط لکھتا ہے کہ طالبوف نے ایران کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ بڑا تاریک ہے۔ شاید طالبوف نے سب کچھ بلا دیکھے لکھا ہے مگر جب وہ باطوم میں داخل ہوتا ہے اور انبوہ در انبوہ ایرانیوں کو جو ہڈیوں کا ڈھانچہ ہیں، سڑکوں پر پھٹے حال مارے مارے پھرتا دیکھتا ہے تو اس کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ دریافت کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ باطوم پر کیا موقوف ہے، قفقاز کے شہر اور قصبے حتیٰ کہ دیہات بھی تارکینِ وطن ایرانیوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان بدنصیبوں نے حکام کے ظلم اور لوٹ مار سے تنگ آکر روس، ہندوستان، روم غرضیکہ جہاں راہ ملی پناہ لی ہے۔

آخر کار ابراہیم بیگ سرحد پار کر کے مشہد میں داخل ہوتا ہے اور وطن کی خاک کو چومتا اور آنکھوں سے لگاتا ہے۔

> 'ناگاہ ہر چہار جانب سے صدائے ''دور باش'' بلند ہوئی۔ میں نے ہر طرف حیرت سے نظر دوڑائی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک قد آور جوان جس کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں، گھوڑے پر سوار چلا آتا ہے اور تیس چالیس آدمی لاٹھیاں اٹھائے اس کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ ان کے پیچھے ایک سرخ پوش دیو چہرہ انسان گھوڑے پر اکڑا بیٹھا دکھائی دیا جس کو بہت سے مسلح سپاہی حلقے میں لیے ہوئے تھے۔ میں نے آقا رضا سے پوچھا، یہ کیا ہنگامہ ہے۔ وہ بولا ''حاکمِ شہر ہے۔ شکار پر جا رہا ہے۔ جب وہ تمہارے پاس سے گزرے تو ادب سے جھک جانا۔'' میں نے نظر اٹھائی تو دیکھا کہ راستے کے دونوں جانب کھڑے ہوئے لوگ رکوع میں جھکے ہوئے ہیں۔ میں نے کہا ''اگر میں تعظیم میں نہ جھکوں تو کیا

ہوگا؟'' وہ بولا۔ ''تم نے وہ لٹھ بند نہیں دیکھے۔ شاید تم زندگی سے سیر ہو چکے ہو۔'' میں نے کہا، ''نہیں ابھی تو میرے دل میں بہت سے ارمان باقی ہیں۔''

پس جب وہ نزدیک آیا تو میں بڑی عاجزی سے رکوع میں جھک گیا۔

زندہ باد ایران کہ لندن جیسے ہفت اقلیم کے مالک شہر کا حاکم ہر جگہ اکیلا جاتا ہے۔ اور کوئی اس کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتا، لیکن آفرین بر ایران کہ اس کے ایک چھوٹے سے شہر کے حاکم کا جاہ وجلال یہ ہے۔ واقعی سلطنت اسی طور کرنی چاہیے۔

'میں نے آقا رضا سے پوچھا۔'' حاکمِ شہر ان پہرہ داروں کو تنخواہ کہاں سے دیتا ہے؟'' اس نے جواب دیا۔ ''ان کا کوئی مشاہرہ مقرر نہیں ہے۔'' میں نے پوچھا۔ ''پھر ان کی گزر بسر کیسے ہوتی ہے؟'' وہ بولا۔ ''یہ لٹھ بند صبح سے شام تک گلی کوچوں میں گھومتے رہتے ہیں۔ جہاں کہیں دو آدمیوں کو تُو تُو مَیں مَیں کرتے دیکھتے ہیں، ان کو پکڑ کر فراش باش کے پاس لے جاتے ہیں۔ جھگڑا خواہ کتنا ہی معمولی ہو، دو تومان فراش باش کو، پانچ قران نائب کو اور دو تین تومان لٹھ بندوں کو فی کس دینا پڑتا ہے۔ اگر دیہات سے جھگڑے کی خبر آئے تو سوار دوڑائے جاتے ہیں اور وہ دیہاتیوں سے اپنا آزوقہ وصول کرتے ہیں۔ دعویٰ بڑا ہو تو حاکمِ شہر سو پچاس تومان شہزادوں کے لیے اور دس بیس تومان اپنے لیے رکھ لیتا ہے۔'''

ایرانیوں کی ذہنی تربیت میں مرزا ملکم خاں کی ادبی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ وہ ۱۸۳۳ء میں اصفہان کے ایک سنگ تراش یعقوب کے گھر پیدا ہوا۔ یعقوب ارمنی عیسائی تھا جس نے جوانی میں ہی اسلام قبول کرلیا تھا۔ وہ روسی اور فرانسیسی زبانوں سے واقف اور روسی سفارتخانے میں مترجم ہوگیا تھا۔ اُس نے ملکم کو دس سال کی عمر میں فرانس بھجوا دیا۔ ملکم نے وہاں سائنس کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور عمرانیات اور سیاسیات پر مغربی مفکرین کی تصنیفات کا بھی مطالعہ کیا۔ ملکم نو سال کے بعد وطن واپس آیا اور دارالفنون سے وابستہ ہوگیا۔ تہران میں ترقی کرتے کرتے وہ ناصر الدین شاہ کے مترجم کے عہدے تک پہنچ گیا۔ ۱۸۵۶ء میں اس کا تبادلہ

استنبول کے ایرانی سفارتخانے میں ہوگیا اور جب ایرانی وفد نپولین سوئم کے پاس بھیجا جانے لگا تو ملکم، وفد کا ترجمان مقرر ہوا۔ پیرس سے واپس آ کر اس نے ایک رسالہ مملکت کے اصول پر لکھا۔ جس کا نام 'کتابچہ غیبی' یا 'دفترِ تنظیمات' تھا۔ اس نے افکارِ نو کی باقاعدہ نشر و اشاعت کی غرض سے تہران میں روشن خیالوں کی انجمن بھی بنائی۔ ایران میں اس وقت ادبی یا سیاسی انجمن بنانے کی اجازت نہ تھی اس لیے ملکم نے اپنی تنظیم کو 'فری میسن لاج' کا نام دیا جس کا فارسی نام 'فراموش خانہ' تھا۔ البتہ ملکم اس کو 'جامعۂ آدمیت' کہتا تھا۔ شروع شروع میں تو ناصر الدین شاہ یہ سمجھ کر فراموش خانہ پر معترض نہ ہوا کہ مغربی فری میسن کی مانند یہ بھی اُمرا کی عیاشیوں کا اڈہ ہوگا لیکن جب ملاؤں نے شور مچایا اور خفیہ پولیس نے سلطان کو فراموش خانے کی سیاسی سرگرمیوں سے آگاہ کیا تو فراموش خانہ بند کر دیا گیا اور مرزا ملکم خاں کو پولیس کی حراست میں خانقین لے جا کر ملک بدر کر دیا گیا۔

ملکم خاں خانقین سے استنبول گیا اور ترکی کی وزارتِ خارجہ میں ملازم ہوگیا۔ استنبول میں اس نے کامل پاشا، عالی پاشا اور فوا پاشا سے راہ و ربط پیدا کیا جو ترکی کی اصلاحی تحریک (تنظیمات) کے سربرآوردہ افراد تھے۔ وہ استنبول کی ادبی اور سیاسی محفلوں میں بھی شرکت کرتا رہا۔ اسی اثنا میں اس نے دو کتابیں 'مبداء ترقی' اور 'شیخ و وزیر' لکھیں۔

کچھ عرصے کے بعد سلطان ناصر الدین شاہ نے ملکم کو معاف کر دیا اور ملکم تہران واپس چلا گیا۔ ۱۸۷۳ء میں سلطان نے اُس کو اپنے سفرِ یورپ سے پہلے لندن بھیج دیا اور ایران کی طرف سے لندن، ویانا اور برلن میں وزیرِ مختار مقرر کر دیا لیکن حکومت کو جب اس کی انگریز نواز سرگرمیوں کی خبر ہوئی تو ملکم برطرف کر دیا گیا۔ برطرفی کے بعد اس نے لندن سے ۱۸۸۶ء میں اپنا مشہور اخبار 'قانون' جاری کیا، جس میں ایران کی استبدادی حکومت پر کڑی تنقیدیں شائع ہوتی تھیں۔ اسی دوران اس کی ملاقات سید جمال الدین افغانی سے ہوئی اور وہ ان کے حلقۂ مریدان میں شامل ہوگیا۔

'قانون' کا داخلہ ایران میں ممنوع تھا لیکن چوری چھپے ایران میں برابر تقسیم ہوتا تھا۔ اس میں فرانس اور برطانیہ کے سیاسی مفکروں بالخصوص جان استوارٹ مل کی تصنیفات کے ترجمے

شائع ہوتے تھے۔ مثلاً مل کی کتاب 'آزادی' (Liberty) کے بعض حصوں کا ترجمہ ملکم نے کئی قسطوں میں شائع کیا۔ اکثر مضامین آئین پسندی اور نمائندہ حکومت کی ضرورت سے متعلق ہوتے تھے۔

'اصولِ آدمیت'، 'ندائے عدالت'، 'توفیقِ امانت'، 'مفتاح'، 'کلمات متخیلہ'، 'رفیق ووزیر'، 'اصولِ ترقی'، 'مذہب دیوانیاں'، 'انشاء اللہ وماشاء اللہ'، 'شیخ ووزیر' اور 'فرقۂ کج بنیاں'، 'کتابچہ پلتیک' (سیاسیات) ملکم کی مشہور تصنیفات ہیں۔ ان سب میں ملکم نے ایران کی استبدادی حکومت کے جور و بیدادگری پر سخت اعتراض کیا ہے اور شہریوں کے اساسی حقوق، قانون کے احترام، حکومت کی اصلاح اور مغربی تمدن کی تقلید کی وکالت کی ہے۔ اسی کے ساتھ وہ 'اقتصادی احیا، خرافی معتقدات اور مذہبی اوہام پرستی' پر بھی کڑی نکتہ چینی کرتا تھا۔

مرزا ملکم خالص ادیب ہی نہ تھا بلکہ بڑا جہاندیدہ سیاستداں بھی تھا۔ اپنی سیاسی سرگرمیوں کے باعث اس کی شخصیت بہت نزاعی ہے۔ چنانچہ ایک حلقہ اس کو 'یکے از بیدار کنندہ و رہبران نہضت آزادی' اور والتیئر، روسو اور وکٹر ہیوگو کا ہم پلہ سمجھتا ہے جبکہ دوسرا حلقہ اس کو خائن، دغا باز، انگریزوں کا جاسوس، پرلے درجے کا زر پرست، لالچی، عیّار اور مکار کہتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مرزا ملکم خاں انگریزوں کا معتمدِ خاص تھا اور اس نے (رائٹر) کو تمباکو کی مراعات دلوانے کا بیس ہزار تومان معاوضہ لیا تھا۔ البتہ ایرانی مؤرخین کی رائے یہ ہے کہ اپنی تمام ابن الوقتی اور ماجرہ جوئی کے باوجود وہ دل سے چاہتا تھا کہ ایران جدید طرز کی ایک آئینی ریاست بنے اور ترقی کرے۔

ڈرامہ نویسی

ایرانی تارکینِ وطن نے مغربی طرزِ فکر و احساس کو رواج دینے کے لیے ادبی اصناف سے بھی کام لیا۔ ایران میں تمثیل نگاری کی روایت دیلمی فرمانرواؤں کے عہد سے مرثیوں کی شکل میں موجود تھی۔ البتہ مغربی طرز کا پہلا ڈرامہ نگار مرزا فتح علی آخوند زادہ تھا۔ وہ ۱۸۱۲ء میں نوخا میں (جو ابریشم کی آذر بائیجانی صنعت کا مرکز تھا) پیدا ہوا۔ ابتدائی عمر گنجہ میں گزاری جو نظامی گنجوی کا

وطن تھا۔ ۱۸۳۲ء میں وہ تفلس چلا گیا اور گرجستان کے روسی گورنر بیرن روزن کا مترجم ہو گیا اور پھر تمام عمر وہیں بسر کی۔

روسی زبان سے واقفیت کے باعث آخوندزادہ کو روسی اور مغربی ادبیات اور فلسفے کے مطالعے کا اچھا موقع ملا۔ چنانچہ اس نے ہلباخ، دیدرو، ہوبیس اور والتیئر کی تصنیفات سے بہت کچھ سیکھا۔ اس نے پشکن کی ناگہانی موت پر ایک مرثیہ بھی 'مرگِ پشکن' کے عنوان سے لکھا۔ اس مرثیے کا روسی ترجمہ تالستائے نے کیا تھا۔ اسی زمانے میں تفلس میں ایک ناٹک گھر کھلا تو آخوندزادہ نے مولیئر اور شیکسپئر کے ڈراموں سے متاثر ہو کر آذربائیجانی زبان میں جو فارسی اور ترکی کا آمیزہ ہے، چھ کامیڈیاں لکھیں لیکن اس کا شاہکار طنزیہ ڈرامہ 'ستارگانِ فریب خوردہ' یعنی حکایت شاہ سراج ہے۔ یہ ڈرامہ اس نے ۱۸۵۷ء میں لکھا تھا۔

اس ڈرامے کا تعلق شاہ عباس صفوی کے عہد سے ہے جو شہنشاہ اکبرِ اعظم کا ہم عصر تھا۔ کہتے ہیں کہ شاہ عباس کے ساتویں سالِ جلوس میں ایک دُم دار ستارہ نمودار ہوا تو نجومیوں نے پیش گوئی کی کہ یہ منحوس ستارہ سلطنت کی تبدیلی یا مرگِ شاہ کی نشاندہی کرتا ہے۔ بادشاہ بہت پریشان ہوا تو شاہی نجومی جلال الدین محمد یزدی نے یہ ترکیب سمجھائی کہ شاہ چند دنوں کے لیے تخت سے کنارہ کش ہو جائیں اور قتل کے کسی مجرم کو تخت پر بٹھا دیں۔ چنانچہ یوسف نامی ایک ترکش دوز کو جو حُرُوفی فرقے سے تھا، شاہی لباس پہنا کر تخت پر بٹھا دیا گیا اور خود بادشاہ تین روز تک اس کی خدمت کرتا رہا۔ اور جب معینہ مدت ختم ہو گئی تو اس کو قتل کر دیا گیا۔

آخوندزادے نے اس ڈرامے میں شاہ عباس کے عہد کا موازنہ یوسف شاہ کی تین روزہ بادشاہت سے کیا ہے۔ ایک طرف وہم پرست بادشاہ ہے، جو خوشامدی درباریوں اور ملاؤں میں گھرا ہوا ہے۔ اس کے وزیر نالائق، رشوت خور اور خائن ہیں، اور رعایا ظلم و جور کے ہاتھوں پریشان ہے۔ دوسری طرف یوسف شاہ ہے جو شاہی وزیروں کو برطرف کر دیتا ہے اور ان کی جگہ دیانتدار اور انسان دوست افراد کو اپنا مشیر بناتا ہے۔ نجومیوں کو دربار سے نکال کر باہر کرتا ہے۔ کھال کھینچنے اور قطعِ اعضاء کی بہیمانہ سزائیں ممنوع قرار دی جاتی ہیں۔ قانون نافذ ہوتا ہے اور جگہ جگہ عدالتیں قائم کی جاتی ہیں۔ شاہی خزانے کی تمام رقوم رفاہی کاموں پر صرف ہونے لگتی

ہیں اور محصولات منسوخ کردیئے جاتے ہیں۔ یوسف شاہ پل اور سڑکیں بنواتا ہے، کارواں سراؤں کی بنیاد رکھتا ہے، نہریں تعمیر کرتا ہے، اور مدرسے اور شفا خانے قائم کرتا ہے۔

اس علامتی ڈرامے سے آخوندزادے کا مقصد لوگوں کو ناصر الدین شاہ کے عہدِ تظلم کی طرف متوجہ کرنا تھا اور یہ بتانا تھا کہ ملک کی حالت اسی وقت سدھر سکتی ہے جب عوام کا کوئی نمائندہ برسرِ اقتدار آئے اور عوام کی بہبودی کے لیے رفاہی خدمات سرانجام دے۔ آخوند زادہ کی دوسری تصنیف جو ایران میں بہت مقبول ہوئی، 'سہ (۳) مکتوب شہزادہ ہندی کمال الدولہ بہ شاہزادہ ایرانی جلال الدولہ جواب این وآن' ہے یہ کتاب دراصل ایرانی حکام کی لوٹ کھسوٹ اور عوام کی زبوں حالی اور ایرانی معاشرے کے انحطاط کی طنزیہ داستان ہے۔

آخوند زادہ گوگول اور پشکن کا بڑا مداح تھا۔ اور روس کے انقلابی ادیبوں بیلنسکی، چرنشیفکی اور دابرولیوف کی تصنیفات کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ایرانی معاشرہ جس استبدادی دور سے گزر رہا ہے، اس میں فکاہی صنفِ ادب بہت کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ:۔

> 'در روزگارے کہ مردم بہ کارہائے ناپسند خو گرفتہ اندر ظلم وستم وپس ماندگی وموہومات ہمہ جا حکم فرما است، برائے قطعہ ریشۂ فساد وتباہی بہتر از انتقاد حربہ ای نیست و برائے پرورش دادن معنویات مردم وایجاد حس امید واری و نیک بختی بالا تراز ادبیات فکاہی وسیلہ ای وجود ندارد۔' تا کہ 'نعمت ہائے الٰہی را از پنجۂ گرگان وسگاں برہائیم۔'
>
> ('ایسے وقت میں کہ لوگوں کی عادتیں بگڑ گئی ہیں اور ہر طرف ظلم وستم اور رجعت پرستی اور توہمات کی حکمرانی ہے، فساد اور تباہی کی جڑوں کو کاٹنے کا طنز سے بہتر کوئی حربہ نہیں ہے، اور لوگوں کے شعور کو جگانے اور اُن میں اُمید اور بہتر مستقبل کا یقین دلانے کا سب سے اچھا وسیلہ فکاہی ادب ہے تاکہ خدا کی نعمتیں بھیڑیوں اور کتوں کے پنجوں سے آزاد ہو سکیں'۔)

آخوند زادہ فارسی ادب میں فکاہیات کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ کئی دوسرے ایرانی

ادیبوں نے آخوند زادہ کی تقلید میں اس صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی اور شہرت پائی۔ ان میں مرزا آقا تبریزی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ وہ فرانسیسی اور روسی زبانوں پر عبور رکھتا تھا اور ان زبانوں کے ادب سے بخوبی واقف تھا۔ وہ برسوں بغداد اور استنبول میں بہ سلسلۂ ملازمت مقیم رہا مگر بعد میں تہران چلا آیا اور فرانسیسی سفارتخانے میں اوّل منشی کے طور پر کام کرنے لگا۔ اس نے تین طنزیہ ڈرامے لکھے ہیں جو عہدِ ناصری کی لاقانونیت اور استبداد کی سچی تصویر ہیں۔

(۱) سرگزشت اشرف خاں

(۲) طریقۂ حکومت زمان خاں

(۳) حکایت کربلا رفتن شاہ قلی خاں

فارسی ادب میں ہجو کا رواج تو بہت پرانا ہے مگر یہ ہجویں عموماً امیروں کے اشاروں پر دشمن کو بدنام کرنے کی غرض سے لکھی جاتی تھیں۔ البتہ طنز نگاری نسبتاً جدید صنفِ ادب تھی جو مغرب کی راہ سے ایران میں داخل ہوئی۔ طنزیہ ادب کا بنیادی مقصد معاشرے کی اصلاح ہوتا ہے اور یہ صنف گفتار و قلم پر پابندیوں کے زمانے میں خوب پھلتی پھولتی ہے کیونکہ ادیب کو جب اربابِ اختیار کی سخت گیریوں یا معاشرے کی قدامت پرستیوں کے باعث براہِ راست تنقید کا موقع نہیں ملتا تو وہ اظہارِ خیال کے لیے طنز و مزاح سے کام لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طنز نگاری نے مشروطہ کے ابتدائی دور میں بہت فروغ پایا۔ اس صنف کو تین روز ناموں، 'ملا نصرالدین'، 'نسیمِ شمال' اور 'صورِ اسرافیل' نے بہت ترقی دی۔

ملا نصرالدین خواجہ ترکی ادب کا مشہور مزاحیہ کردار ہے۔ اسی مناسبت سے مرزا جلیل محمد قلی زادہ نے اپنے روزنامے کا نام ملا نصرالدین رکھا تھا، جو ۱۹۰۶ء میں تفلس سے جاری ہوا جو ان دنوں جمہوریہ سوویت آذربائیجان کا دارالحکومت ہے۔

جلیل محمد قلی زادہ (۱۸۶۹ء۔ ۱۹۳۲ء) کا باپ، ایرانی تھا مگر قفقاز کے شہر نخجوان میں جا بسا تھا۔ جلیل قلی زادہ آذربائیجانی، فارسی اور روسی زبانوں میں پوری دستگاہ رکھتا تھا اور گوگول اور مولیئر سے بہت متاثر تھا۔ وہ روزنامہ 'ملا نصرالدین' کے اجرا سے قبل کئی طنزیہ کتابیں لکھ چکا تھا البتہ اس کے اصل جوہر 'ملا نصرالدین' میں کھلے۔

'ملا نصرالدین' جمہوری انقلاب کا نقیب تھا اور قفقاز و ایران کے روشن خیالوں کی تحریریں شائع کرنے میں پیش پیش رہتا تھا۔ البتہ اس کے طنز واستہزا کا رُخ خاص طور پر شاہ ایران، سلطان ترکی، امیر بخارا اور قفقاز کے اُمرا کی جانب ہوتا تھا۔' وہ ان کی استعمار پرستی، ظالمانہ قوانین اور مذہبی تعصبات وخرافات کو آڑے ہاتھوں لیتا اور بقول مدیر، ان کے جسموں کو زخمی کرتا، ان کے تضادات کی نشاندہی کرتا اور ان کے پردوں کو چاک کرتا تھا۔'

'ملا نصرالدین' کا مقصد ہنسنا ہنسانا نہ تھا بلکہ لوگوں کو ایک ایسے معاشرے کے لیے جدوجہد پر آمادہ کرنا تھا جس میں 'آقا و گدا اور منعم ومحتاج، حقوق و اختیارات میں مساوی ہوں۔ ایک ایسی حکومت قائم ہو جو اصولِ آزادی کا احترام کرے اور وضع شدہ قوانین کے تحت سزا دے۔ تمام زمینیں کاشتکاروں میں تقسیم کردی جائیں۔ محنت کاروں اور ہنر مندوں کو امور ریاست پر پورا پورا اختیار ہو اور وہ اپنی مجلس میں بحث ومشورے سے تمام کام سرانجام دیں۔'

روز نامہ 'نسیم شمال' تہران سے شائع ہوتا تھا۔ اس اخبار کے مالک و مدیر سید اشرفؔ قزوینی عہد مشروطہ کے شاید سب سے ہردلعزیز شاعر تھے جو عموماً طنزیہ نظمیں لکھتے تھے۔ اشرف کی زندگی افلاس وتنگدستی میں گزری مگر انہوں نے دولت مندوں کے آگے کبھی ہاتھ نہیں پھیلایا۔ وہ خالص عوامی آدمی تھے، عمر بھر عوام میں رہے اور انہیں کے درمیان وفات پائی۔ انہوں نے گدائے خاک نشیں کو امرائے کاخ نشیں پر ہمیشہ ترجیح دی۔ نہ دولت جمع کی، نہ جائیداد پیدا کی، نہ گھر بنایا، نہ شادی کی۔ نہ کبھی کوئی سرکاری عہدہ قبول کیا۔ بلکہ فقیرانہ آئے تھے اور اس دنیا سے فقیرانہ رخصت ہوگئے۔ وہ شاعر ہی نہ تھے بلکہ جنگِ آزادی کے سپاہی بھی تھے چنانچہ استبدادِ صغیر کے زمانے میں جب قزوین میں مسلح جدو جہد شروع ہوئی تو اشرفؔ نے بھی بندوق سنبھال لی۔ محمد علی خاں سپہ سالار اعظم کے لشکر میں شامل ہوگئے اور فتح تہران کی لڑائی میں بڑی جانبازی دکھائی۔ رضا شاہ کبیر پہلوی، اشرفؔ کی شاعری کو بہت ناپسند کرتا تھا۔ قضارا اشرفؔ ایک بار بیمار پڑے تو شاہ کو بہانہ ہاتھ آ گیا۔ اس نے اخبار میں یہ خبر چھپوادی کہ اشرفؔ دیوانے ہوگئے ہیں اور ان کو پکڑ کر پاگل خانے میں بند کروادیا۔ وہیں دو سال بعد ۱۹۳۴ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔

استاد سعید نفیسی نے اشرف پر جو مضمون رضا شاہ کی موت کے بعد لکھا، اس کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اشرف کو پاگل خانے میں زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا تھا۔

مشروطہ کی تحریک سے پہلے ایرانی شعرا عوام سے عموماً دور رہتے تھے۔ ان کی زندگی دربار اور درباریوں کے گرد گھومتی تھی۔ شاعری کی قدریں، شاعری کے اصول اور قاعدے، شاعری کے موضوعات، شاعری کی زبان سب کی ٹکسال دربار تھا۔ درباریوں کی شان میں قصیدے لکھنا، انہیں کے مذاق کی غزلیں کہنا جن میں شاہد و شراب کے تذکرے اور گل و بلبل، شیریں فرہاد کے قصے ہوں، شاعروں کا معمول تھا۔ جن شاعروں کی پہنچ سرکار دربار تک نہیں تھی وہ بھی اپنے جذبات واحساسات کے اظہار کے لیے درباری زبان ہی اختیار کرتے تھے۔ شاعری کے موضوعات مقرر تھے اور کوئی شاعر ان موضوعات سے ہٹنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ عام لوگوں کے دکھ درد کا بیان معیوب بات تھی۔ کبھی کبھار کوئی شاعر اشاروں اشاروں میں ان باتوں کا ذکر کر دیتا ورنہ زندگی کے روز مرہ کے مسائل کو شعر کا موضوع بنانا ادب کی بے حرمتی تھی۔

اسی وجہ سے مشروطہ کے ابتدائی دور میں شعرا کو قومی جذبات اور سیاسی خیالات کے اظہار میں بڑی دشواریاں پیش آئیں کیونکہ اس وقت تک زبان کا کوئی ایسا ڈھانچہ نہیں بنا تھا جن سے شعرا زندگی کے ان نئے تقاضوں کے اظہار میں مدد لیتے۔ ناچار ان کو فارسی کی لوک شاعری کا سہارا لینا پڑا۔ خوش قسمتی سے عوامی ادب وفن کی روایت ایران میں بہت پرانی ہے۔ جنوبی ایشیا کی مانند وہاں بھی فقیر درویش، مراثی مسخرے، بھانڈ نقال موجود تھے جو گاؤں گاؤں پھرتے۔ اپنے تمسخر آمیز لطیفوں اور گیتوں گانوں میں بادشاہوں، امیروں، حاکموں اور ملاؤں پر پھبتیاں کستے اور سننے والوں کو خوش کرتے۔ بعض اوقات کوئی دل جلا فقیر غمِ زمانہ کا مرثیہ دکھی لہجے میں گا کر سناتا تو مجمع بے تاب ہو جاتا۔ خوشی اور غم کے یہ گیت دراصل عوام کے اپنے دل کی آوازیں تھیں۔ اس لیے یہ گیت فوراً لوگوں کی زبانوں پر چڑھ جاتے اور پھر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے تھے۔

ناصر الدین شاہ کے آخری دور کا سب سے نامور شاعر اور ادیب مرزا آقا خاں کرمانی تھا۔ وہ مرزا یحییٰ خاں مازندرانی المعروف بہ 'صبح ازل' کا داماد تھا۔ ایران میں سختیاں ناقابل

برداشت ہوگئیں تو ۱۸۸۸ء میں بھاگ کر استنبول چلا گیا اور وہاں اخبار 'اختر' سے وابستہ ہوگیا۔ استنبول ہی میں اس کی ملاقات سید جمال الدین افغانی سے ہوئی اور وہ ان کا ہم خیال بن گیا۔ ناصر الدین شاہ اخبار 'اختر' کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے بہت خائف تھا۔ اس نے ایرانی سفیر علاء الملک کو ہدایت کی کہ مرزا آقا خاں کی زباں بندی کا بندوبست کیا جائے۔ علاء الملک نے سلطان عبدالحمید کے کان بھرے اور کہا کہ مرزا آقا خاں اور اس کے ہم زلف شیخ احمد روحی ارمنیوں کی سازش میں ملوث ہیں لہٰذا ان دونوں کو گرفتار کر کے طرابوزن میں ۱۸۹۶ء میں قید کر دیا گیا۔

مرزا آقا خاں نے اسیری ہی کے دوران میں اپنی مشہور مثنوی 'نامہ باستان' مکمل کی۔

اس مثنوی میں سلطان ناصر الدین شاہ کی استبدادیت پر ملامت کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ:

پشیزی به از شهر یاری چنین
که نه کیش وارد، نه آئین ودین
به دوزخ به مانی تو تیره روان
همه لعنت آید زپیر و جوان
نشنید و گویند پیران راد
به نیکی نیازند نام تو یاد
که شه ناصر الدین بدی یار کفر
از و گرم گردید بازار کفر
بیازرد و افسرو وازخود براند
به گیتی بجز نام زشتی نخواند

(ترجمہ) 'ایسی شہر یاری سے تو دمڑی (گداگر) ہونا بہتر ہے کہ یہ شخص نہ کوئی اصول رکھتا ہے نہ آئین و مذہب۔ اے بد باطن تجھے دوزخ نصیب ہو اور بوڑھے جوان تجھ پر لعنت کریں۔ دانش مند بیٹھ کر بات چیت کرتے ہیں تو تجھ کو اچھے لفظوں سے نہیں یاد کرتے بلکہ کہتے ہیں کہ ناصر الدین شاہ کفر کا دوست تھا اور کفر کا بازار گرم رکھتا تھا۔ اس نے لوگوں کو آزردہ کیا، دکھ پہنچایا اور خود بھی ملیا

میث ہوا۔ دنیا میں برائی کے سوا کچھ نہ سیکھا۔'

شاعر کو برطانیہ اور زار روس کے بڑھتے ہوئے اثر کا احساس ہے اور وہ یہ نہیں چاہتا کہ ایران ان طاقتوں کی ہوس کا شکار بنے۔

به ایران مباد آن چنیں روز بد
که کشور به بیگانگاں اوفتد
نه خو انم زمانے که ایں نو عروس
بیفتد بزیر جوانان روس
به گیتی مباد آنکه ایں حور دیس
شود .همسر لر دی از انگلیس

(ترجمہ) 'ایران پر خدا وہ برا دن نہ لائے کہ یہ ملک غیر ملکیوں کے ہاتھ چڑھ جائے۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ نئی دلہن روسی جوانوں کے قبضے میں آئے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ حور صفت دوشیزہ برطانیہ کی لیڈی بن جائے۔'

۱۸۹۶ء میں جب ناصر الدین شاہ کو سید جمال الدین افغانی کے ایک شاگرد مرزا رضا خاں کرمانی نے قتل کردیا تو ایران نے ترکی سے مطالبہ کیا کہ سید جمال الدین افغانی کو ایران کے حوالے کردیا جائے۔ سلطان عبدالحمید نے سید کو تو نہ بھیجا البتہ آقا خاں کرمانی اور احمد روحی کو جو مقید تھے ایران روانہ کردیا۔ وہ تبریز لائے گئے اور ولی عہد کی موجودگی میں انہیں قتل کردیا گیا۔ نامۂ باستاں کے علاوہ آقا خاں کی تین اور تصانیف...... 'جنگ ہفتاد و دوملت'، 'انشاء اللہ ماشاء اللہ' اور 'آئینۂ سکندری' بہت مشہور ہیں۔

سلطان ناصر الدین کے عہد میں سیاسی اجتماع یا تنظیم کی اجازت نہ تھی البتہ ۱۸۹۲ء میں ملک گیر احتجاج کی وجہ سے، جب تمباکو کی اجارہ داری کا معاہدہ منسوخ ہوا تو وطن پرستوں کے حوصلے بڑھنے لگے۔ ایران میں اکھاڑوں (زور خانہ) کا دستور بہت پرانا ہے۔ وطن پرستوں نے ان اکھاڑوں کو اپنی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ وہ کشتی لڑنے کے بہانے اکھاڑوں میں جمع ہوتے اور سیاسی امور پر تبادلۂ خیال کیا کرتے تھے۔ زور خانوں کے علاوہ جگہ جگہ 'دائرے' بھی قائم ہونے

لگے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ایران میں بے شمار زور خانے اور دائرے کھل گئے۔ ۱۹۰۴ء میں ان کے نمائندوں کا ایک خفیہ اجلاس تہران میں ہوا اور نو افراد کی ایک کمیٹی بنائی گئی۔ اس کمیٹی کے سپرد ملک کی سیاسی سرگرمیوں کی شیرازہ بندی کرنے اور ایک مشترکہ لائحہ عمل تیار کرنے کا کام سپرد ہوا۔ قومی سطح پر ایک 'انجمنِ مخفی' بھی تشکیل دی گئی اور مختلف شہروں میں اس کی شاخیں کھل گئیں۔

اسی اثنا میں ایک شخص حاجی سید نصر اللہ اخوی نے 'کتاب خانۂ ملی' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جس کا مقصد وطن پرست ادب کی تخلیق و اشاعت تھا۔

تمباکو کی اجارہ داری کے خلاف جو شورش برپا ہوئی تھی اس میں ایرانی تاجروں کا طبقہ پیش پیش تھا کیونکہ چنگی اور محصولات پر مغربی طاقتوں کے تسلط کی زد براہ راست تاجروں پر پڑتی تھی۔ غیر ملکی ٹھیکہ دار ملک کی درآمد و برآمد پر قابض ہوگئے تھے اور انہوں نے ایرانی تاجروں کو اپنا دستِ نگر بنا دیا تھا۔ ایسی صورت میں مغربی سامراج اور شاہی استبداد کے خلاف تاجروں کی نفرت قدرتی بات تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۰۳ء سے آج تک ایران میں آزادی اور جمہوریت کی جو تحریک بھی اٹھی اس میں 'بازاروں' بالخصوص تہران، اصفہان، تبریز اور شیراز کے بازاروں نے بڑا نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ آقا یحییٰ آرین پور، 'صبا تا نیما' جلد اوّل (تہران، ۱۹۷۲) ص ۲۵۔

۲۔ ایضاً، ص ۲۵۹۔

تیسرا باب

مشروطہ کی تحریک

ایرانی مؤرخ ناصر الدین شاہ کے جانشین مظفر الدین شاہ کا ذکر بڑی حقارت سے کرتے ہیں۔ مظفر الدین شاہ کی سوجھ بوجھ بارہ سال کے لڑکوں سے بھی کم تھی۔ نظم ونسق کی صلاحیت اس میں نام کو بھی نہ تھی اور نہ اس کو گردوپیش کے حالات کی کچھ خبر تھی۔ وہ اتنا ڈرپوک تھا کہ بجلی چمکتی یا بادل گرجتے تو چادر میں منہ چھپا لیتا تھا۔ حکومت کی باگ ڈور اس نے صدر اعظم امین السلطان کے ہاتھوں میں دے رکھی تھی اور خود سارا وقت عیاشیوں میں گزارتا تھا۔ امین السلطان کی خوش انتظامی کا یہ حال تھا کہ وہ سرکاری عہدوں اور خطابات وعنایات کا باقاعدہ نیلام کرتا تھا۔

مظفر الدین شاہ نے باپ کے انجام سے کچھ نہیں سیکھا بلکہ وطن فروشی میں ناصر الدین شاہ پر بھی سبقت لے گیا۔ ناصر الدین نے یورپ کے تین سفر کیے تھے اور لاکھوں روپے وہاں عیاشیوں میں اڑائے تھے۔ مظفر الدین کیوں پیچھے رہتا۔ چنانچہ ۱۸۹۸ء میں سفر کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ اس سفر کے لیے دس لاکھ پونڈ جو آج کے حساب سے کئی کروڑ بنیں گے، درکار تھے۔ لہٰذا بیلجیئم کے تین ساہوکاروں سے یہ رقم قرض لی گئی اور کرمان شاہ کی ر... سے درآمد برآمد ہونے والے مال کے محصولات ان کے ہاتھ رہن رکھ دیے گئے۔ اسی طرح ۱۹۰۰ء میں

روس سے ۲۵ لاکھ پونڈ پانچ فیصد سود پر قرض لیے گئے اور شمال مغربی سرحد اور بحر خزر کی بندر گاہوں کے محصولات رہن کر دیئے گئے۔ دوسرے سال شاہ نے یورپ کا دوسرا سفر کیا جہاں فقط پیرس میں اس کے ہوٹل کا روزانہ بل ۲۴۰ پونڈ ہوتا تھا۔

آخر نفرت اور برہمی کا وہ لاوا جو کئی سال سے اندر ہی پک رہا تھا، ۱۹۰۳ء میں پھوٹ پڑا۔ غیر ملکی طاقتوں نے محصولات کی جو نئی شرح مقرر کی تھی اس کے خلاف جگہ جگہ بلوے شروع ہو گئے۔ اسی دوران میں تہران کے حاکم علاؤ الدولہ نے 'بازار' کے ۱۹ ممتاز دکانداروں کو چینی مہنگے داموں فروخت کرنے پر سرِ عام کوڑے لگوائے۔ ان سزاؤں کے خلاف کرمان، مشہد اور دوسرے شہروں میں مظاہرے ہوئے تو کرمان میں ایک مجتہد کو بھی جو جلوس کی قیادت کر رہا تھا کوڑے مارے گئے اور مشہد میں امام علی رضا کے روضے کے قریب جلوس پر گولی چلائی گئی۔ ان حادثات کے خلاف احتجاج کے طور پر تہران کے تاجروں اور علماءِ دین نے ۱۳ دسمبر ۱۹۰۴ء کو زاویۂ حضرت عبدالعظیم میں پناہ لی۔

ایرانی اس طور کی پناہ گیری کو 'بست' کہتے ہیں۔ بست کی روایت بہت قدیم ہے۔ ایرانیوں نے مطلق العنان بادشاہوں تک فریاد کی آواز پہنچانے کا یہ پر امن طریقہ ایجاد کیا تھا۔ زاویۂ عبدالعظیم اتنی مقدس جگہ سمجھی جاتی تھی کہ وہاں پناہ لینے والا گرفتار نہیں ہو سکتا تھا اور بادشاہ کو اس کی شکایت سننی پڑتی تھی۔

اس بست کے وقت تک آئین یعنی مشروطہ کی تحریک نے زور نہیں پکڑا تھا بلکہ احتجاجیوں کا مطالبہ فقط یہ تھا کہ علاؤ الدولہ کو برطرف کیا جائے اور مقدمات کی سماعت کے لیے 'عدالت خانے' قائم کیے جائیں۔

مظفر الدین کو آخر کار یہ مطالبات ماننے پڑے اور ۱۲ جنوری ۱۹۰۶ء کو ایک فرمان، شاہی دستخط سے جاری ہوا تو لوگوں کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ چنانچہ انگریز مؤرخ پیٹر ایوری کے بقول:-

> 'اس دن ایران میں ''زندہ باد ملتِ ایران'' کا نعرہ شاید پہلی بار بلند ہوا۔ یہ تحریک حکومت کی استبدادی پالیسی ہی کے خلاف نہ تھی بلکہ بیرونی مداخلت کے بھی خلاف تھی چنانچہ اس کے محرکات وطنی بھی تھے اور جمہوری بھی۔'[1]

لیکن اہل بست جب زاویۂ عبدالعظیم سے گھروں کو لوٹ آئے تو شاہ اپنے دستخطی اعلان سے منحرف ہوگیا۔ اس وعدہ خلافی نے مظفر الدین کا رہا سہا وقار بھی خاک میں ملا دیا۔ بازارگانوں نے احتجاج میں دکانیں بند کردیں۔ لوگ سڑکوں پر نکل آئے اور اب ہر طرف تحریری آئین کا باقاعدہ مطالبہ ہونے لگا۔

انہیں دنوں آقا سید جمال نامی ایک خطیب نے تہران کے بازاروں میں شاہی استبداد کے خلاف تقریریں شروع کردیں۔ ایک واعظ شیخ محمد بھی ان کا ہمنوا بن گیا۔

۲۱ جون ۱۹۰۶ء کو پولیس نے شیخ محمد کو گرفتار کرنا چاہا، بازاریوں نے مزاحمت کی، پولیس نے گولی چلائی اور ایک طالب علم سید حسین مارا گیا۔ اس حادثے سے شہر میں بے چینی اور بڑھ گئی۔ سید حسین کا جنازہ اٹھا تو پولیس نے دوبارہ گولی چلائی۔ پندرہ ایرانی مارے گئے اور سینکڑوں زخمی ہوئے۔ ہلاک ہونے والوں میں ایک شخص سید زادہ عبدالمجید بھی تھا۔ ذیل کے قطعے میں انہیں حادثوں کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ قطعہ ان دنوں تہران میں ہر شخص کی زبان پر تھا۔

از نوحسین شهید بمیل یزیدهٔ شد
عبدالمجید کشتهٔ عبدالحمید[۲] شد
باوا هزار مرتبه نزدِ خدا قبول
قربانیٔ جدید تو یا ایها الرسول

(ترجمہ) ایک نیا حسین یزید کی سازش سے شہید ہوا اور عبدالمجید کو عبدالحمید نے قتل کیا۔ اے رسول کے ماننے والو! خدا کے نزدیک یہ نئی قربانی ہزار بار قبول ہو۔

تب ۶ جولائی ۱۹۰۶ء کو دوسرے بست کا آغاز ہوا۔ ہزاروں تاجروں، ادیبوں اور دانشوروں نے برطانوی سفارتخانے کے احاطے میں پناہ لی۔ البتہ علمائے دین قم جاکر معصومۂ قم کے روضے میں مقیم ہوئے۔ مشروطہ کی یہ تحریک ایک ماہ تک جاری رہی۔ آخر سلطان کو ہتھیار ڈالنے پڑے اور ۵ اگست کو آئین کے حق میں ایک شاہی فرمان جاری ہوا۔ اس فرمان کی رو سے ۱۹/اگست کو ایک مجلس نمائندگان کا قیام عمل میں آیا اور مجلس دستور ساز کے انتخاب کے قواعد وضوابط مرتب ہونے لگے۔ یہ کام ایک ماہ کے اندر مکمل ہوگیا۔ مجلس کا انتخاب کرنے والے

رائے دہندوں کے لیے یہ شرط رکھی گئی کہ وہ مرد ہوں۔ اُن کی عمر بیس سال سے کم نہ ہو۔ وہ اپنے علاقے میں معروف ہوں۔ پچاس پونڈ سے زیادہ مالیت کی جائیداد کے مالک ہوں یا ان کی آمدنی دس پونڈ سے زائد ہو۔ ان شرائط کے ذریعے انقلاب کے قائدین نے آبادی کی بہت بڑی اکثریت کو حقِ رائے دہی سے محروم کردیا۔ مجلس نمائندگان نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بالواسطہ انتخاب کا طریقہ اختیار کیا۔ اس کے مطابق یہ طے پایا کہ ہر حلقے میں امیدواروں کی ایک خاص تعداد مقرر ہوگی اور یہ امیدوار یکجا ہوکر اپنے حلقے سے مجلس شورائی ملی کے رکن کو منتخب کریں گے۔ مجلسِ نمائندگان کے ان اقدامات سے عام ایرانیوں کو جلد اندازہ ہوگیا کہ انہوں نے جس مشروطیت اور جمہوریت کے لیے قربانیاں دی تھیں وہ ہنوز بہت دور ہے۔ بہر حال ستمبر ہی میں انتخابات ہوگئے اور ۷/اکتوبر ۱۹۰۶ء کو پہلی مجلس شورائی ملی کا افتتاح تہران میں بڑی دھوم دھام سے ہوا۔

مگر ابھی مجلس کو وجود میں آئے مشکل سے تین ماہ گزرے تھے کہ مظفر الدین شاہ کا انتقال ہوگیا اور اس کا بیٹا محمد علی شاہ ۱۹/جنوری ۱۹۰۷ء کو تخت نشین ہوا۔ محمد علی شاہ آذر بائیجان کا گورنر رہ چکا تھا اور اپنی استبدادی کارروائیوں کے باعث وہاں بہت ناپسند کیا جاتا تھا۔ اس کی آئین دشمنی بھی کسی سے پوشیدہ نہ تھی۔ چنانچہ تبریز کے شہریوں نے ایک 'مجلس نظار' بنا رکھی تھی جس کا کام مجلس شورائی ملی میں آذر بائیجان کے نمائندوں کی نگرانی کرنا اور محمد علی شاہ کی آئین دشمن حرکتوں پر نظر رکھنا تھا۔ ان کے خدشات صحیح ثابت ہوئے۔

ایک ایسے ملک میں جہاں جمہور کے نمائندوں کو سیاسی اقتدار میں کبھی برائے نام شرکت کا بھی موقع نہیں ملا تھا مجلسِ شورائی ملی کا وجود بہر حال غنیمت تھا کیونکہ مجلس اپنی تمام خامیوں کے باوجود ایرانی قوم کے سامراج دشمن جمہوری جذبات کی ترجمانی کررہی تھی۔ مظفر الدین شاہ نے چار لاکھ پونڈ کے اینگلو روسی قرضے کی جو تجویز مجلس کی منظوری کے لیے بھیجی تھی، مجلس نے اس کو ۲۲ نومبر ۱۹۰۶ء کو رد کردیا۔ مجلس کی موجودگی کی وجہ سے اخباروں پر جو پابندیاں عائد تھیں وہ بھی بے اثر ہوگئیں۔ ۲۵ نومبر ۱۹۰۶ء کو 'مجلس' جاری ہوا۔ ۲۷ دسمبر ۱۹۰۶ء کو 'ندائے وطن'، فروری ۱۹۰۷ء میں 'تمدن'، ۲۹/اپریل ۱۹۰۷ء کو 'حبل المتین' کا تہران ایڈیشن، ۳۰ مئی

کو 'صورِ اسرافیل' (جس کے ایڈیٹر مرزا جہانگیر خان، مجلس کے رکن بھی تھے) اور اکتوبر میں 'مساوات'۔ اس زمانے کے ادبی رسالوں میں 'نسیم شمال' اور 'نو بہار' زیادہ مشہور تھے۔ 'نسیمِ شمال' کے ایڈیٹر سید اشرف الدین اشرف اور نو بہار کے ایڈیٹر ملک الشعراء بہار تھے۔ یہ سب اخبار اور رسالے مشروطیت کے زبردست حامی اور سامراجی طاقتوں کے سخت دشمن تھے۔ خوش قسمتی سے ان جریدوں کو ملک کے بیشتر ممتاز اہلِ قلم اور شعرا کا بھرپور تعاون حاصل تھا۔ لہٰذا شاہ کے خلاف تنقیدی مضمونوں، نظموں اور کارٹونوں کی بھرمار ہوگئی۔

محمد علی شاہ نے اگر چہ آئین سے وفاداری کا بار بار عہد کیا تھا اور مجلس کو بھی عدم مداخلت کا یقین دلایا تھا لیکن وہ فوج اور شاہ پرست عناصر سے مل کر مجلس کے خلاف مسلسل سازش کرتا رہا تھا۔ برطانیہ اور زارِ روس کی حکومتیں بھی مجلس کے در پے تھیں کیونکہ مجلس نے قرضے کی منظوری دینے سے انکار کر دیا تھا۔ لہٰذا دونوں طاقتوں نے مجلس سے بالا بالا ۳۱/اگست ۱۹۰۷ء کو ایک خفیہ معاہدہ ایران کے بٹوارے کے بارے میں کیا۔ اس معاہدے کی رُو سے ایران کو حلقۂ اثر کے اعتبار سے تین ٹکڑوں میں بانٹ دیا گیا۔ شمال مغربی اور شمال مشرقی علاقے روس کے حصے میں آئے، جنوب مغربی اور جنوب مشرقی علاقے برطانیہ کو ملے اور وسطی علاقے کو شاہ کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ اتفاق سے اسی دن عباس آقا تبریزی نامی ایک آذر بائیجانی نے امین السلطنت کو جس وقت وہ مجلس سے باہر نکل رہا تھا گولی مار کر ہلاک کر دیا اور خودکشی کر لی۔

خفیہ معاہدے کے راز کا افشا ہونا تھا کہ ملک میں غصے کی لہر دوڑ گئی۔ شعر و شاعری کی دلدادہ ایرانی قوم نے اپنے جذبات کا اظہار نظموں میں کیا حتیٰ کہ ادیب نیشاپوری بھی جو پرانی وضع کی شاعری کرتے تھے، اس سانحے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

کے گماں داشت کہ بنگاہ فریدونی را
از چپ وراست کند دشمن چونیں تقسیم

(کس کو خبر تھی کہ فریدوں کے گودام کو
دشمن دائیں بائیں سے اس طرح بانٹ لے گا)

کے روا بود که رامش که نوشروانی
از چپ وراست زدو پهلو گردو به دو نیم

(کیا یہ درست تھا کہ نوشیرواں کی طربِ گاہ کے
دائیں بائیں سے دو ٹکڑے کر دیئے گئے)

ایں روانیست مگر از روش مردم او
که به یکسو نید زخوبیٔ نیا گان قدیم

(یہ درست تو نہیں لیکن جب لوگ اپنے اجداد
کی خوبیوں سے بے خبر ہوجاتے ہیں تو ایسا ہی ہوتا ہے)

خواب نادانیٔ جاویدیٔ ایرا نیها
برواز یادِ که دمه سخن کهف ورقیم

(ایران کی عظمت سے ناواقفیت کے باعث
لوگوں کو پرانے صحیفوں اور نوشتوں کی تعلیم یاد نہ رہی)

دشمن از دوست نه دانسته وزشت اززیبا
آتش از آب نه سنجیده وکوثر ز جهیم

(وہ دوست دشمن اور اچھائی برائی میں تمیز نہ کر سکے۔
اور نہ انہوں نے آگ اور پانی، کوثر اور جہنم کا فرق جانا)

ایرج مرزا جلال الملک شاہ پرست تھے لیکن وطن کی اس خفیہ تقسیم کو وہ بھی برداشت نہ کر سکے۔

گویند که انگلیس باروس
عهدے بست است تازه امسال
(کہتے ہیں کہ برطانیہ نے روس سے اس سال ایک نیا معاہدہ کیا ہے)

کا اندر پلیتک هم ور ایران
زیں بس نه کنند، هیچ اهمال
(کیونکہ ایرانی سیاست میں یہ لوگ بالکل تساہل سے کام نہیں لیتے)

افسوس که کافیان ایں ملک
نبشته وفارغ اند ازیں حال
(افسوس کہ اس ملک کے نگراں
ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں اور اس حال سے بے خبر ہیں)

کز صلح میان گربه وموش
برباد رود دکان بقال
(کہ اگر بلی اور چوہے میں میل ہو جائے تو بقال کی دکان برباد ہو جاتی ہے)

امین السلطنت کی ہلاکت کا کسی کو غم نہیں ہوا کیونکہ لوگ اس کے ماضی سے واقف تھے(امین السلطنت برسوں لندن میں جلا وطنی کے دنوں میں انگریزوں سے وظیفہ پاتا رہا تھا) البتہ عباس آقا تبریزی کو شہید کا مرتبہ ملا اور فخر الواعظین خاورؔی نے اس کے چہلم پر ایک مرثیہ لکھا جس میں شاعر عباس آقا کی قبر سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

اے مزارِ محترم هر چند بزم ماتمی!
نیک ازیں نوگل که خفت اندر توشادو خرمی
(اے محترم مزار! ہر چند کہ بزم ماتم بچھی ہوئی ہے۔
لیکن اس نئے پھول سے اچھا کون ہوگا جو تیری آغوش میں ہنسی خوشی سو رہا ہے)

جائے دارد در تو آں کو عاملے را زندہ کرے
غیبت خوابیدہ در دامن تو مانا مریمی
(تجھ میں اس شخص کو جگہ ملی ہے جس نے ایک عالم کو زندہ کیا
حضرت مریم کی مانند تیرے بطن میں بھی ایک عظیم شخصیت محوِ خواب ہے)

اے جہان غیرت! اے عباس آقا کز شرف
زخم قلب ملک وملت راتو شافی مرھمی
(اے غیرت کے پیکر! اے عباس آقا کہ تیرے شرف سے
ملک وملت کے دل کے زخم کو مرہم نصیب ہوا ہے)

ترک ایرانی ثراد اے آنکہ ھم چون تھمتن
معلیٔ فر فریدوں، مجئی تاج جمی
(اے ترکی نسل کے ایرانی[۳] اے وہ جس نے تہمتن[۴] کی مانند
فریدوں[۵] کی شان وشوکت بلند کی اور جمشید[۶] کی سلطنت کو زندہ کیا)

وہ درۂ یا جوج ظلم رفتہ دست غیرتت
چوں سکندر ساخت زآھن پارہ سدِّ محکمیٔ
(تیرے غیرت مند ہاتھوں نے ظلم وفتنہ کی راہ روکنے کے لیے ایک آہنی دیوار کھڑی
کردی جس طرح سکندر نے یاجوج ماجوج کے خلاف بنائی تھی)

محمد علی شاہ قاچاریوں کی روایتی مطلق العنانی کو بحال کرنے کی فکر میں تھا مگر رائے عامہ کا اصرار تھا کہ اقتدار کی باگ مجلس کے ہاتھ میں ہو اور شاہ کی حیثیت رسمی سربراہ سے زیادہ نہ ہو لیکن خود مجلس کے ارکان کے مابین اتفاق رائے نہ تھا (علمائے دین اور جمہوریت پسندوں کے درمیان سوچ کا فرق دوسرے بست کے دوران ہی کھل کر سامنے آ گیا تھا)۔ علمائے دین مجلس کو اتنے وسیع اختیارات دینے کو تیار نہ تھے۔ ہر چند کہ آئین اور قانونِ اساسی کی تشکیل میں جمہوریت پسند ہی پیش پیش تھے لیکن وہ علما کو ناراض کر کے ملک میں سیاسی بحران نہیں پیدا کرنا چاہتے تھے۔ لہٰذا جمہوریت پسندوں نے اعتدال کی راہ اختیار کی اور قانونِ اساسی کی دفعہ ۳۵

میں اقتدارِ اعلیٰ کی وضاحت اس طرح کی گئی۔

'ریاست کا اقتدارِ اعلیٰ ایک امانت ہے۔ جس کو ایرانی قوم
نے عطیۂ خداوندی کے طور پر شاہ کے حوالے کیا ہے۔'

اس دانستہ ابہام کا مقصد اعتدال پسندوں کے علاوہ شاہ کو بھی یہ یقین دلانا تھا کہ ہم تم کو بے دست وپا نہیں کرنا چاہتے۔ علما کی مزید اشک شوئی کے لیے قانونِ اساسی میں یہ دفعہ بھی رکھی گئی کہ مجلس شورائے ملی قرآن اور سنت کے خلاف کوئی قانون وضع کرنے کی مجاز نہیں ہوگی۔ اس امر کی نگرانی کے لیے پانچ مجتہد جن کو بیس مجتہدوں کی فہرست سے مجلس خود منتخب کرے گی، مجلس کے باقاعدہ رکن ہوں گے اور وہی اس بات کا فیصلہ کریں گے کہ کوئی قانون شریعت کے مطابق ہے کہ نہیں۔ ان کا فیصلہ مجلس کا فیصلہ تصور کیا جائے گا۔ بیشتر علما ان آئینی تحفظات سے مطمئن ہوگئے مگر شیخ فضل اللہ نوری نے جو شاہ سے ملا ہوا تھا قانونِ اساسی کی مخالفت شروع کردی اور جمہوریت پسندوں پر یہ الزام لگایا کہ وہ بہائی ہیں۔

مجلس نے ستمبر ۱۹۰۷ء میں ۱۰۷ دفعات کے آئین اور ۵۱ دفعات کے قانونِ اساسی کی توثیق کردی۔ اس کی رو سے انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ کے شعبے الگ الگ ہوگئے اور ان کے اختیارات کا بھی تعین کردیا گیا۔ سنسر شپ اٹھالی گئی اور ہر شخص کو اظہارِ رائے، اجتماع اور طباعت واشاعت کی مکمل آزادی حاصل ہوگئی بشرطیکہ اس آزادی سے مذہب کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو۔

ایرانی شعرا نے اس آئین کا پرجوش خیر مقدم کیا چنانچہ مشہور طنز نگار اور شاعر دہخدا نے اپنی نظم 'مکتوب قزوین' میں جو ۵ مارچ ۱۹۰۸ء کے 'نسیمِ شمال' میں چھپی تھی، آئینی دور کی پذیرائی کرتے ہوئے لکھا تھا۔

چون گشت نیّر مشروطه طالع از ایران
به گشت روشن از اشراق او روان دخو

(مشروطہ کا سورج جب ایران سے نکلا
تو اس کی روشنی سے دخو کی روح چمک اٹھی)

۱۹۰۷ء کے آئین کی روح اگرچہ جمہوری تھی لیکن یہ دستاویز چونکہ مختلف الخیال

نمائندوں کے مابین افہام وتفہیم سے بنی تھی لہٰذا اس میں بعض بنیادی خامیاں بھی تھیں اور یہی وہ خامیاں تھیں جن سے ایرانی فرمانروا آخر وقت تک ناجائز فائدہ اٹھاتے رہے۔ مثلاً انتظامیہ (بشمول فوج اور پولیس) آئین کی رو سے براہ راست شاہ کے ماتحت تھی اور شاہ کو پورا اختیار تھا کہ جس کو چاہے وزیر اعظم مقرر کرے اور جب چاہے اس کو برطرف کردے۔ شاہی کابینہ کے لیے مجلس کا منتخب شدہ رکن ہونا بھی لازمی نہ تھا نہ وہ انتظامی امور کی حد تک مجلس کے روبرو جواب دہ تھی۔ البتہ وزرا بہ اعتبار عہدہ مجلس میں شرکت کے مجاز تھے۔ اس طرح وہ قانون سازی کے کاموں میں مداخلت کرسکتے تھے اور ارکانِ مجلس پر دباؤ ڈال سکتے تھے۔ گزشتہ ستر سال میں آئین میں بعض تبدیلیاں ہوئیں مگر یہ نقائص بدستور باقی رہے۔

محمد علی شاہ آئینی بادشاہ بن کر رہنے کے لیے تیار نہ تھا۔ انگریز اور روسی بھی اس کو مجلس کے خلاف بھڑکاتے رہتے تھے لہٰذا اس نے مجلس کے کاموں میں رخنہ ڈالنا شروع کیا۔ کبھی شاہی قرضوں کی توثیق کا مطالبہ کرتا، کبھی درباریوں کو قانون سے مستثنیٰ کرنے پر زور دیتا اور کبھی خانوادۂ شاہی کو مجلس کا رکن تسلیم کرنے پر اصرار کرتا۔ جب مجلس نے شاہ کے اشاروں پر چلنے سے انکار کیا تو اس نے شہر کے غنڈوں، بدمعاشوں سے کام لینے کی ٹھانی۔ کئی سرگرم اراکین کو برسرِ عام پٹوایا گیا۔ دو چار کو قتل کی دھمکی بھی دی گئی مگر مجلس نے جب ان تمام دہشت انگیزیوں پر بھی اطاعت قبول نہ کی تو شاہ نے تہران کو فوج کے حوالے کیا اور خود شاہی باغ چلا گیا جو شہر سے باہر شاہی تفریح گاہ تھی۔

فوج نے جون ۱۹۰۸ء میں بہارستان کا محاصرہ کرلیا اور مجلس کو الٹی میٹم بھیجا کہ مرزا جہانگیر خاں ایڈیٹر 'صورِ اسرافیل'، سید محمد رضا شیرازی ایڈیٹر 'مساوات' اور جمہوری پارٹی کے دوسرے سربرآوردہ ارکان کو جلاوطن کیا جائے۔ پریس پر سنسر بٹھایا جائے اور شہریوں کے ہتھیار ضبط کرلیے جائیں۔

ابھی گفتگو جاری تھی کہ عمارت پر بم برسنے لگے۔ ایوان میں بھگدڑ مچ گئی اور فوج نے اندر گھس کر بائیس ممتاز اراکین مجلس کو گرفتار کرلیا اور زنجیروں سے باندھ کر شاہی باغ لے گئی۔ وہاں بادشاہ کے حکم سے مرزا جہانگیر خاں اور حاجی مرزا آقا خاں اور کئی دوسرے لیڈروں کو گلا

گھونٹ کر ہلاک کر دیا گیا۔ پروفیسر براؤن نے 'تاریخ انقلاب ایران' میں گرفتار ہونے والوں کی ایک تصویر چھاپی ہے۔ ان کے ہاتھ پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہیں، گلے میں لوہے کے طوق ہیں اور ایک موٹی سی زنجیر جو طوقوں سے گزرتی ہے ان کو ایک آہنی رشتے میں جوڑ دیتی ہے۔ تصویر کے نیچے یہ شعر لکھا ہے۔

آں کہ دائم ہوس سوختن ما می کرد
کاش می آیدو از دور تماشامی کرد

(جس نے ہمیشہ میری موت کی خواہش کی، کاش وہ آئے اور دُور سے یہ منظر دیکھے)

محمد علی شاہ نے مجلس کو درہم برہم کر کے یہ سمجھا تھا کہ قوم اس کی سفاکانہ کارروائیوں سے خوفزدہ ہو جائے گی لیکن مظالم نے جلتے پر تیل کا کام کیا۔ ملک کے گوشے گوشے میں شاہ کے خلاف نفرت کے شعلے بھڑکنے لگے اور آزادی خواہوں کو یقین ہو گیا کہ اب پُرامن احتجاجوں سے بات نہیں بنے گی بلکہ مطلب برآری کے لیے ہتھیار اٹھانا ہوں گے۔ اس وقت جمہوریت کا سب سے بڑا مرکز تبریز تھا جہاں کے باشندے اپنے سیاسی شعور، جمہوری روایات اور تنظیمی صلاحیتوں کے اعتبار سے سب سے آگے تھے چنانچہ مشروطیت کے حق میں انقلاب کا پرچم ستار خاں کی رہبری میں سب سے پہلے وہیں بلند ہوا۔ آذر بائیجانیوں کو قفقاز کے ہم قوموں اور روسی انقلابیوں سے بھی پوری پوری مدد ملی اور قفقاز کی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی (بالشویک) نے اس جدو جہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ آذر بائیجانیوں کی کمک کے لیے باقاعدہ ایک کمیٹی بنائی گئی اور بہت سے آزمودہ کار قفقازیوں کو تبریز بھیجا گیا تاکہ وہ آذر بائیجانیوں کو اسلحہ سازی کا ہنر سکھائیں اور فنِ جنگ کی تربیت دیں۔[۱]

اسی اثنا میں اصفہان، گیلان اور رشت میں مسلح جدو جہد شروع ہو گئی۔ ۵ جنوری ۱۹۰۹ء کو جب بختیار قبیلے کے سپاہی اصفہان میں داخل ہوئے تو شہریوں نے ان کا بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا۔ گیلان والوں نے حاکمِ شہر کو قتل کر دیا اور شہر کا نظم و نسق خود سنبھال لیا۔ رشت میں آزادی خواہ جن میں بڑی تعداد قفقازیوں کی تھی، سپہ دار اعظم کی قیادت میں آگے بڑھے۔ انہوں نے قزوین پر جو تہران سے فقط ۹۲ میل دور ہے، قبضہ کر لیا اور یہیں ان کا ملاپ

بختیاریوں سے ہوا۔

مگر انگریز اور روسی بھی نچلے بیٹھنے والے نہ تھے، انہوں نے شاہ کی حمایت میں فوجی مداخلت شروع کردی۔ انگریزوں نے بوشہر، بندر عباس اور خلیج فارس کی دوسری بندرگاہوں پر قبضہ کرلیا۔ روسیوں نے تبریز کا محاصرہ کیا مگر تبریزی نو ماہ تک بڑی بہادری سے دشمن کا مقابلہ کرتے رہے۔ یہ بیرونی مداخلتیں انقلابیوں کی پیش قدمیوں کو نہ روک سکیں۔ شاہ نے انقلابیوں کو فریب دینے کی غرض سے ۱۰ رمئی ۱۹۰۹ء کو آئین سے وفاداری کا عہد چوتھی بار کیا لیکن آزادی پسند اب شاہ کے دھوکے میں آنے والے نہیں تھے۔ سپہ دار اعظم اور بختیاری جب تہران کی طرف بڑھے تو شاہ نے ۱۶ رجولائی کو روسی سفارتخانے میں پناہ لی، تہران فتح ہوا۔ انقلابیوں نے شاہ کو معزول کر کے اس کے بارہ سال کے بیٹے احمد شاہ کو تخت پر بٹھایا اور علی رضا خان قاچار عضد الدولہ کو اُس کا اتالیق مقرر کردیا۔ البتہ مجلس کی بحالی میں تاخیر ہوئی کیونکہ بہت سے ارکان جیلوں میں تھے یا اپنے اپنے علاقوں میں روپوش ہوگئے تھے۔ چنانچہ دوسری مجلس کا افتتاح ۱۵ نومبر ۱۹۰۹ء کو ہوا اور تیرہ ماہ کا یہ شاہی دور جس کو اہلِ ایران 'استبداد صغیر' کہتے ہیں، ختم ہوا۔

ایران کے وطن پرست ادیبوں نے مشروطہ کی فتح کی بڑے جوش سے پذیرائی کی۔ ملک الشعرأ بہارؔ نے ۲۴ راگست ۱۹۰۹ء کے 'ایرانِ نو' میں ایک نظم شائع کی جو قوم کے جذبات واحساسات کی پوری ترجمانی کرتی ہے۔

یک چند مارا غم رهنموں شد جاں یار غم گشت دل غرق خوں شد
نام وطن را رخ نیلگوں شد دمرو زه دشمن خواروز بوں شد
زیں جنبش سخت زیں فتح ناگاه الحمدالله الحمدالله
آنا نکه باجور منصوب گشتند در معدهٔ ملک مکروب گشتند
آخر به ملّت مغضوب گشتند ازساجتِ ملک جاروب گشتند
پیرانِ جاهل شیخانِ گمراه الحمد الله الحمد الله

(کچھ عرصے تک غم میرا رہنما رہا اور میری جان دکھ کی دوست بنی رہی اور دل خون ہوتا رہا اور وطن کا چہرہ نیلا ہوگیا تھا۔ بارے دشمن ہارا اور ذلیل ہوا اور الحمدللہ کہ سخت تحریک کے بعد

ہم کو فتح نصیب ہوئی، اور وہ افراد جو ظلم کے ذریعے اقتدار پر قابض ہو گئے تھے اور ملک کے پیٹ میں درد کا باعث بن گئے تھے آخر ان پر قوم کا غضب نازل ہوا۔ ان کا اور جاہل پیروں اور گمراہ شیخوں کا ملک سے صفایا ہو گیا۔)

مشروطہ کی ناکامی کا سبب بنیادی طور پر ایران کی نو آبادیاتی معیشت تھا۔ اس معیشت کو استعماری طاقتوں نے زبردستی نافذ کیا تھا لیکن مجلس میں اتنی قوت نہ تھی کہ وہ نو آبادیاتی معیشت کو جس میں سراسر زیاں ایران کا تھا بدل کر ایک خود کفیل صنعتی معیشت کو رواج دے سکتی۔

ناکامی کا دوسرا سبب یہ تھا کہ وزارت اور مجلس شورائی ملی دونوں میں عنانِ اختیار فیوڈل عناصر کے ہاتھوں میں تھی جو دورِ جدید کے معاشرتی تقاضوں کو فیوڈل ازم کے دائرے میں رہ کر پورا کرنے کے آرزو مند تھے۔ صنعتی سرمایہ داروں اور صنعتی مزدوروں کا جو سماجی انقلاب کی روحِ رواں ہوتے ہیں وجود ہی نہ تھا اور تجارتی سرمائے میں اتنی سکت نہ تھی کہ امورِ مملکت میں کوئی فیصلہ کن کردار ادا کر سکتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مشروطہ پہلے دن ہی سے سیاسی اور اقتصادی بحرانوں میں پھنس گیا۔ عوام کے مسائل حل کرنا اور جمہوری اقدار کو فروغ دینا تو درکنار مشروطہ کوئی پائیدار حکومت بھی نہ قائم کر سکا۔ وزارتیں بنتیں اور ٹوٹ جاتیں، نہ نظم و نسق کی اصلاح ہو سکی، نہ مالیاتی نظام درست کیا جا سکا اور نہ استعماری قوتوں کے عمل دخل میں کوئی کمی آئی۔ مالیات کی درستی کے لیے امریکی ماہرین کی خدمات اس توقع پر حاصل کی گئی تھیں کہ وہ ملکی مالیات کو جدید اصولوں پر منظم کر دیں گے لیکن انگریزوں نے اور ان کے وظیفہ خوار اعلیٰ افسروں نے امریکی ماہرین کی ایک نہ چلنے دی اور وہ تنگ آ کر مستعفی ہو گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ برطانیہ نے ایران کو اپنی معیشت کی اصلاح کا موقع ہی نہیں دیا بلکہ ایسے حالات پیدا کیے کہ حکومت کو قرض لے کر کام چلانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ چنانچہ ۱۹۱۱ء اور ۱۹۱۴ء کے درمیان ایران کو پانچ بار قرض لینا پڑا۔ آغاز جنگ تک یہ رقم اڑسٹھ لاکھ چار ہزار لیرا ہو گئی۔ تیل کی نکاسی شروع ہو گئی تھی لیکن اس خزانے پر اینگلو ایرانی آئل کمپنی قابض تھی جو بیس لاکھ لیرا کے سرمائے سے قائم ہوئی تھی۔

انگریزوں کو تیل کی اہمیت کا پورا پورا احساس تھا لہٰذا انہوں نے بندر عباس، بوشہر اور

خوزستان کے تیل کے چشموں کی حفاظت کے لیے اپنی فوجیں متعین کردی تھیں اور ایران اس کھلی مداخلت کے خلاف احتجاج کی جرأت بھی نہ کرسکتا تھا۔ حکومت کی بے بسی کا اس سے بڑھ کر اور ثبوت کیا ہوسکتا ہے کہ برطانیہ اور روس کے جس خفیہ معاہدے کو مجلس نے ۱۹۰۷ء میں مسترد کردیا تھا اور جس کے خلاف پورے ملک میں احتجاج ہوا تھا، مجلس نے ۱۹۱۲ء میں اسی معاہدے کی توثیق کردی۔ گویا ایران نے ملک کی تقسیم کو تسلیم کرکے اپنے گلے پر خود چھری پھیر لی۔

اسی اثنا میں ایک تیسری سامراجی طاقت نے ایران میں مداخلت شروع کردی۔ جرمنی کو ایرانیوں کے قومی جذبات کا اندازہ تھا۔ لہٰذا اس نے سامراج دشمنی کا سوانگ بھرا اور ایران کے نجات دہندہ کے بھیس میں سامنے آیا۔ برلن میں مقیم ایرانی وطن پرستوں کو سامراجی دشمن سرگرمیوں کی تمام سہولتیں فراہم کی گئیں۔ 'کاوہ' نامی ایک اخبار فارسی میں جاری ہوا اور ایک چھاپہ خانہ کاویانی پریس کے نام سے قائم کیا گیا۔ خود ایران کے اندر ادیبوں کا ایک حلقہ پیدا ہوگیا جو جرمنی کو اپنا بہی خواہ خیال کرتا تھا اور اس کی تعریف و توصیف کرتا تھا۔ ان ادیبوں میں ادیب پیشاوری، غنی زاد اور وحید قابل ذکر ہیں۔

اگست ۱۹۱۴ء میں جب پہلی جنگ عظیم چھڑی تو ایران نے دو ماہ کے اندر اپنی غیر جانبداری کا اعلان کردیا لیکن جنگ کے بعد فریقین نے ایران کی غیر جانبداری کا بالکل احترام نہیں کیا۔ پہلے جرمنی اور ترکی کی فوجیں مغربی سمت سے ایران میں داخل ہوئیں، پھر روس اور برطانیہ کی یلغار شروع ہوئی اور ایران کی سرزمین دیکھتے ہی دیکھتے لڑائی کا میدان بن گئی۔ شمالی علاقوں پر روسی فوجوں نے قبضہ کرلیا۔ مغربی علاقے ترکوں اور جرمنوں کے تصرف میں آئے اور عراق کی سرحد سے بلوچستان تک کے تمام علاقوں پر انگریزی فوجوں کا تسلط ہوگیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا گویا ایران ایک لاش ہے جس کو گدھ نوچ نوچ کر کھانے پر تلے ہوئے ہیں۔ غیر ملکی فوجوں کی لوٹ مار سے شہر برباد اور آبادیاں ویران ہوگئیں اور ہر طرف طوائف الملوکی پھیل گئی۔ مرکزی حکومت کو کوئی خاطر میں نہ لاتا تھا اور نہ نظم وضبط اس کے اختیار میں رہ گیا تھا۔ خود ڈیموکریٹک پارٹی دو ٹکڑوں میں بٹ گئی تھی۔ دائیں بازو کی اکثریت جرمنوں کی حمایت کررہی تھی البتہ بائیں بازو والے جن میں اکثریت مزدوروں اور تاجروں اور پیشہ وروں کی تھی، برطانیہ،

روس اور جرمنی تینوں سامراجی طاقتوں کے مخالف تھے اور مطالبہ کررہے تھے کہ سامراجی فوجیں ملک کو فوراً خالی کردیں۔ لیکن ان کی کوئی نہ سنتا تھا۔

۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب کے بعد روسی فوجیں تو واپس چلی گئیں اور سوشلسٹ روس نے اُن تمام حقوق اور مراعات سے دستبرداری کا اعلان کردیا جو زار کے زمانے میں روس کو ایران میں حاصل تھے البتہ برطانوی فوجوں کا عمل دخل بدستور باقی رہا۔ چنانچہ رضا خاں سپہ دار نے جو قزاق دستوں کا کماندار تھا، برطانیہ ہی کے ایما پر فروری ۱۹۲۱ء میں مرکزی حکومت پر قبضہ کرلیا اور پھر ۱۲ ردسمبر ۱۹۲۴ء کو بادشاہ بن گیا۔ قاچاری خاندان کی ۱۳۱ سالہ حکومت ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔

حوالہ جات

1-Petrer Avery, *Modern Iran*, (London, 1965), p.152.

۲۔ تہران کا حاکم۔

۳۔ آذربائیجان کے لوگ ترک ہیں۔ ان کی زبان ترکی اور ایرانی کا آمیزہ ہے۔

۴۔ رستم۔

۵۔ ایران کا مشہور بادشاہ جو ضحاک کے قتل کے بعد تخت نشین ہوا۔

۶۔ جمشید، نوشیرواں۔

۷۔ آقا یحییٰ آرین پور، بحوالۂ سابقہ، ص ۸۔

چوتھا باب

پہلوی ریاست کا کردار

ایران کا کل رقبہ ۱۶ لاکھ ۲۸ ہزار مربع میل ہے۔ اس اعتبار سے ایران پاکستان سے ڈگنا اور برطانیہ اور اٹلی سے پانچ گنا بڑا ہے، لیکن تقریباً آدھا ملک ریگستان، پہاڑ یا دلدل ہے۔ ایک تہائی علاقہ جنگلوں سے گھرا ہوا ہے اور فقط ۱۷ فیصد زمین آباد یا زیر کاشت ہے۔ بارش کا سالانہ اوسط ایک تا ۸ ۱/۲ انچ ہے۔ سب سے زرخیز خطہ گیلان (رشت) اور مازندران کا ہے جو بحرِ خزر کے جنوبی ساحل پر واقع ہے۔ سب سے ویران اور بنجر سیستان (بلوچستان) کا علاقہ ہے جو پاکستان کی سرحد سے خلیج فارس کے کنارے کنارے اباوان تک اور شمال مشرق میں دشت لوط اور دشت کویر سے گزرتا ہوا تہران تک جاتا ہے۔

ملک کی خاص پیداوار گیہوں، جو، چاول، رائی، کپاس، چائے، تمباکو اور چقندر ہے۔ تیل کے ذخیرے صوبہ خوزستان میں واقع ہیں۔

ایران کی آبادی تقریباً ۳،۵ کروڑ ہے۔ ڈیڑھ کروڑ افراد شہروں اور قصبوں میں اور بقیہ دیہات میں رہتے ہیں۔ آبادی کا سب سے زیادہ ارتکاز تہران کے صوبے میں ہے۔ تہران شہر کی آبادی ۴۵ لاکھ ہے جو ملک کے سات سب سے بڑے شہروں کی مجموعی آبادی سے بھی زیادہ

ہے۔ تہران کے علاوہ اور کسی شہر کی آبادی ۶ یا ۷ لاکھ سے زیادہ نہیں ہے۔

نسلی اور لسانی اعتبار سے ایران کے باشندے مندرجہ ذیل قومیتوں میں بٹے ہوئے ہیں۔

فارسی بولنے والے ایرانی ایک کروڑ ۷۵ لاکھ

آذربائیجانی ۵۰ لاکھ

کُرد ۴۰ لاکھ

ترکمان ۵ء۴ لاکھ

بلوچ ۶ لاکھ

عرب ۲۰ لاکھ

لوری ۲۵ لاکھ

گلاکی ۱۸ لاکھ

مازندرانی ۱۵ لاکھ

ان نسلی اقلیتوں میں سب سے ترقی یافتہ آذربائیجانی ہیں۔ وہ ترکی النسل ہیں اور ان کی زبان آذری، فارسی سے زیادہ ترکی کے قریب ہے۔ آذربائیجان کا صدر مقام تبریز ہے جو صوبائی خود مختاری کی تحریک کا مرکز رہ چکا ہے۔ ترکمان بھی ترک ہیں مگر وہ شمال مشرق کے سرحدی علاقے میں آباد ہیں۔

کُرد وسطی ایشیا کی شاید سب سے مظلوم قوم ہے جو ایران، عراق اور ترکی تین ملکوں میں بٹی ہوئی ہے۔ کُرد چھ سو میل لمبے اور ڈیڑھ سو میل چوڑے علاقے میں آباد ہیں مگر اُن کو تینوں میں سے کسی ملک میں بھی اقلیتی حقوق تک حاصل نہیں ہیں۔ گلہ بانی ان کا ذریعۂ معاش ہے اور وہ اب تک بہت پسماندہ ہیں۔

کُردوں کی تاریخ بہت پرانی ہے چنانچہ ان کا تذکرہ دو ہزار سال قبل مسیح کی لوحی دستاویزوں میں بھی ملتا ہے۔ اہل سومیران کو گوتی، یا کوتی یا کرتی کہتے تھے۔ اشوری اُن کو کردو کہتے تھے اور ترکی کی حتی قوم کا فرمانروا اشوبی لوکا ما (۱۳۷۰ ق۔م) ان کو گوردو اور اُن کے دیوتا کو کیر کہتا ہے۔ وہ کوہ جودی کے گردو نواح میں آباد تھے۔ اُن کی ایک شاخ نے جو کسدی کہلاتی

تھی ۱۸۰۰ ق۔م میں بابل کو فتح کیا اور چھ سو سال تک وہاں حکومت کرتی رہی۔

کردوں کو اپنی آزادی ہمیشہ بہت عزیز رہی ہے اور انہوں نے کبھی کسی غیر قوم کی اطاعت ہنسی خوشی قبول نہیں کی۔ البتہ ہخامنشی شہنشاہوں کے دور میں ان کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کیا گیا، یہاں تک کہ ان کی ایک شاخ راوندی کو زرتشتی معبدوں کا محافظ بنا دیا گیا۔ ساسانیوں نے اس روایت کو قائم رکھا۔

عربوں نے جب عراق اور ایران کو فتح کیا تو کردوں نے اسلام قبول کر لیا لیکن اپنی قومی انفرادیت برقرار رکھی۔ گیارہویں صدی میں جب عباسیوں پر زوال آیا تو کردوں نے شہرزور اور دیارِ بکر (مشرقی ترکی) میں اپنی آزاد ریاستیں بنا لیں مگر آخر کار سلجوقی ترک اُن پر غالب آئے اور کردوں کی ریاستیں ختم ہو گئیں۔ البتہ جب ۱۲۵۷ء میں ہلاکو خاں نے حملہ کیا تو کردوں نے بڑی بہادری سے تاتاریوں کا مقابلہ کیا اور اربیل کی جنگ میں بیس ہزار تاتاری کردوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ ایران میں صفویوں اور ترکی میں عثمانیوں کے اقتدار کے بعد کردوں کی آزادی کا خاتمہ ہو گیا اور وہ ان دونوں ریاستوں میں بٹ گئے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد عراق کی علیحدہ ریاست قائم ہوئی تو کردوں کا ایک بار پھر بٹوارہ ہوا اور وہ تین ریاستوں میں تقسیم ہو گئے اور یہ صورتحال اب تک باقی ہے۔ ترکی میں وہ دیارِ بکر کے آس پاس آباد ہیں۔ عراق میں وہ موصل کے گردونواح میں رہتے ہیں اور ایران میں وہ کردستان اور کرمان شاہ کے اُستانوں میں آباد ہیں اور اُن کا مرکز سنندج ہے۔

ایران کے عرب نژاد باشندے ہر چند کہ تعداد میں کردوں سے کم ہیں لیکن وہ ایران کے سب سے دولت مند علاقے میں جہاں تیل کے چشمے ہیں، آباد ہیں اور ایران کی معیشت کا سارا دارومدار تیل کے انہیں چشموں پر ہے۔ جغرافیائی محل وقوع کے لحاظ سے بھی ان کے علاقے کو بڑی اہمیت حاصل ہے کیونکہ خوزستان کی سرحد عراق سے ملتی ہے اور سمندر پار مگر بہت تھوڑے ہی فاصلے پر کویت کی عرب امارات ہے۔ ابادان اور خرم شہر، دریائے کارون کے کنارے پر جڑواں شہر ہیں۔ وہاں دنیا کی سب سے بڑی ریفائنری (تیل صاف کرنے کا کارخانہ) قائم ہے البتہ صوبائی مرکز اہواز ہے۔ عرب اس خطے میں تقریباً بارہ سو سال سے بسے ہوئے ہیں لیکن اُن کے

ساتھ دوسرے درجے کے شہریوں کا سا سلوک ہوتا ہے۔ تیل کی صنعت کے فروغ پانے کے بعد حکومت نے خوزستان کے شہروں میں فارسی بولنے والے ایرانیوں کو آباد کرنا شروع کر دیا اور تیل کے کارخانوں کی تمام نفع بخش اسامیاں ان کے تصرف میں آ گئیں۔ عربوں کو آس پاس کے گاؤں میں دھکیل دیا گیا اور جو باقی بچے اُن کی اقتصادی اور سماجی حالت وہی ہے جو کراچی کے پسماندہ محلوں میں مکرانیوں اور بلوچوں کی ہے۔

لیکن سب سے بچھڑے ہوئے بلوچ ہیں۔ اُن کا علاقہ بے آب وگیاہ ریگستان ہے جہاں لوگ صحرا نوردی کی زندگی بسر کرتے ہیں یا عرب امارتوں میں محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ وہاں بھی اُن کو سب سے گھٹیا اور محنت طلب کام پر لگایا جاتا ہے اور سب سے کم اُجرت دی جاتی ہے۔

انتظامی سہولتوں کی خاطر ملک کو حال ہی میں ۱۹ صوبوں (اُستان) میں تقسیم کر دیا گیا ہے مگر ان صوبوں کی حیثیت پاکستان اور ہندوستان کی کمشنریوں سے زیادہ نہیں ہے۔ ایران چونکہ وحدانی ریاست ہے لہٰذا صوبوں کو کسی قسم کے آئینی اختیارات یا حقوق حاصل نہیں ہیں۔ صوبوں میں نہ اسمبلیاں ہوتی ہیں اور نہ وزارتیں بلکہ صوبے کا گورنر (اُستان دار) اور دوسرے تمام سرکاری ملازم براہِ راست مرکز کے تابع ہوتے ہیں اور مرکز کے احکام کی بجا آوری ان کا فرض ہوتا ہے۔ صوبے کے نظم ونسق میں وہاں کے باشندوں کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ ہر صوبے میں کئی شہرستان (ضلع) ہوتے ہیں۔ ہر شہرستان میں کئی بخشیش (تحصیل) اور ہر بخشش میں بہت سے دہستان۔ ایران میں سرکاری ملازمین کی مجموعی تعداد دس لاکھ ہے۔ ان میں سے ۳۵ فی صدی سے زیادہ تہران میں متعین ہیں۔ دوسرے صوبوں میں اُن کی فی صد شرح ۳ تا ۶ ہے۔

یوں کہنے کو تو ایران ۱۹۰۶ء کے آئین کی رو سے ایک آئینی ملوکیت تھا اور بادشاہ کی حیثیت آئینی سربراہ کی تھی لیکن اس آئین کا احترام نہ کبھی قاچاریوں نے کیا اور نہ پہلویوں نے۔ رضا خاں سپہ دار کے وقت سے تو خالص شخصی حکومت کا دور شروع ہو گیا اور جو کسر باقی رہ گئی تھی اُس کو رضا شاہ پہلوی نے ۱۹۵۳ء کے کو دیتا کے بعد پورا کر دیا۔ البتہ شاہ کے احکام کو قانونی شکل دینے کے لیے مجلس شورائے ملی آخر وقت تک موجود رہی اور وزارتیں شاہی احکامات

کو نافذ کرتی رہیں۔

مجلس شورائے ملی مشروطہ کی تحریک کے نتیجے میں ۱۹۰۷ء میں وجود میں آئی تھی۔ ابتدا میں مجلس کے ارکان دو سال کے لیے منتخب ہوتے تھے مگر ۱۹۵۶ء میں مجلس کی میعاد بڑھا کر چار سال کر دی گئی۔ چوبیسویں اور آخری مجلس کا انتخاب جون ۱۹۷۵ء میں ہوا تھا۔ اس وقت مجلس کے ارکان کی تعداد ۲۶۷ تھی۔ ۱۹۶۷ء میں شاہ نے آئین میں ایسی ترمیمیں کروالیں کہ بقول 'المینیک ۱۹۷۶ء' وہ حکومت کے تینوں شعبوں —— مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ کا حاکم اعلیٰ بن گیا۔' وزیروں کی نامزدگی اور اُن کی برطرفی دونوں کا اختیار شاہ کو تھا اور مجلس شورائے ملی شاہ کے فیصلوں میں بالکل مداخلت نہیں کر سکتی تھی۔ ۱۹۵۰ء میں ساٹھ ارکان پر مشتمل ایک ایوانِ بالا (سینٹ) بھی قائم کیا گیا۔ اس کے تیس ارکان کو شاہ نامزد کرتا تھا اور بقیہ تیس منتخب ہوتے تھے۔

مشرق کے دوسرے پسماندہ ملکوں کی مانند ایران میں بھی فیوڈل نظام صدیوں سے رائج ہے۔ زرعی اصلاحات سے پیشتر وہاں کی کل زیرِ کاشت زمین چار سو نہایت طاقتور خاندانوں کے قبضے میں تھی۔ بعض خاندان تو تین تین سو گاؤں کے مالک تھے۔ ان میں ۳۷ خاندان ایسے تھے جن کے تصرف میں مجموعی طور پر ۱۹ ہزار گاؤں تھے یعنی گاؤں کی کل تعداد کا ۳۸ فیصد! بیشتر بڑے زمیندار شہروں میں رہتے تھے۔ عموماً اُن کی رشتے داریاں بڑے بڑے تاجروں سے تھیں اور وہ خود بھی تجارت کرتے تھے۔ قاچاری دور میں تو وزارتیں، سفارتیں، صوبے داریاں سب انہیں خاندانوں میں گردش کرتی رہتی تھیں۔ انہوں نے اگرچہ پہلویوں کی اطاعت قبول کر لی تھی لیکن پہلویوں کو ہمیشہ غاصب اور اپنے سے کمتر ہی سمجھا کیے۔ دیہات کی آبادی پر بھی فیوڈل روایتوں کے ناتے ان لوگوں کا اثر و رسوخ پہلوی افسر شاہی سے زیادہ تھا۔

پشتینی نوابوں، جاگیرداروں کی طاقت توڑنے اور دیہات کو مکمل طور پر افسر شاہی کے تحت لانے کا واحد طریقہ یہ تھا کہ ان فیوڈل عناصر کو زمینوں سے بے دخل کر دیا جائے۔ چنانچہ جنوری ۱۹۶۲ء میں زرعی اصلاحات کا پہلا قانون نافذ ہوا —— (امریکی مشیر بھی اصلاحات پر اصرار کر رہے تھے کیونکہ وہ خوزستان میں بڑے پیمانے پر مشینی زراعت کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ دیکھئے باب ۵)۔ اس قانون کے تحت زمینداروں کا حقِ ملکیت ایک گاؤں تک محدود کر دیا گیا

البتہ چائے اور پھلوں کے باغات اور مشینی فارم مستثنیٰ تھے۔ دو زمینداروں کو معاوضہ دیا گیا اور جن کاشتکاروں کو زمینیں ملیں ان سے زمین کی قیمت اضافے کے ساتھ قسطوں پر وصول کی گئی۔ کاشتکاروں کی زمین سے بے دخلی بند کردی گئی اور مزارعوں کے حصے میں جو پیداوار کا ۱/۵ ہوتا تھا ۵ فی صد کا اضافہ کردیا گیا۔ مگر پاکستان کی زرعی اصلاحات کی طرح اس قانون میں بھی اتنے روزن، اتنے خلاء تھے کہ زمینداروں نے ان سے فائدہ اٹھا کر زمینیں اپنے رشتے داروں اور ملازموں کے نام منتقل کردیں یا باغ لگالیے اور فارم قائم کردیئے۔ چنانچہ دس سال کے بعد جب نام نہاد 'سفید انقلاب' کے اعداد وشمار شائع ہوئے تو پتہ چلا کہ پچاس ہزار گاؤں میں سے فقط چودہ ہزار میں قانون پر عمل ہوا ہے۔ ان میں بھی فقط دس فیصدی اراضی کسانوں میں تقسیم ہوئی ہے اور وہ بھی نہایت ناقص قسم کی بنجر! لطف یہ ہے کہ گیارہ سال کے اندر زرعی پیداوار میں ایک فیصد کا بھی اضافہ نہیں ہوا۔ چنانچہ حکومت کو ۱۹۷۷ء میں ڈھائی ارب ڈالر کا اناج درآمد کرنا پڑا۔ البتہ شاہ اپنی فوجی پولیس (امینہ) اور ساواک کے ذریعے دیہات میں بڑے زمینداروں کا زور توڑنے میں بڑی حد تک کامیاب ہوگیا۔

صنعت وتجارت

پہلوی ریاست تھی تو سرمایہ دار ریاست مگر اپنی معیشت کے نوآبادیاتی کردار کے باعث وہ حقیقی معنی میں آزاد اور ترقی یافتہ صنعتی ریاست کبھی نہ بن سکی۔ شاہ اور اس کے خاندان والوں نے اربوں ڈالر بیرونی بنکوں میں جمع کیے۔ صنعت کاروں نے اپنے کاروبار کو خوب پھیلایا۔ موٹروں، ہوائی جہازوں، اور نائٹ کلبوں کی ریل پیل ہوگئی۔ پیرس، لندن، اور نیویارک گھر آنگن بن گئے بلکہ تہران پیرس کو بھی شرمانے لگا۔ اس کے باوجود ملک میں نوآبادیاتی معیشت کی حاکمیت بدستور قائم رہی۔ نوآبادیاتی معیشت سے مراد یہ ہے کہ ایران حسب سابق اپنا سب سے قیمتی خام مال — تیل — ملکی صنعتوں میں استعمال کرنے کے بجائے برآمد کرتا رہا اور جو زرمبادلہ کمایا اس سے کلیدی صنعتوں کو فروغ نہیں دیا بلکہ مغربی مصنوعات درآمد کرتا رہا خواہ وہ روزمرہ ضرورت کی چیزیں تھیں یا اسلحہ جات، فولاد اور مشین ڈھالنے کی فیکٹریاں نہیں لگائیں

بلکہ بھاری صنعتوں پر ہلکی پھلکی صنعتوں کو ترجیح دی۔ اس کے علاوہ بیرونی سرمائے کی جی بھر کر حوصلہ افزائی کی گئی اور مشترکہ کاروبار کے ذریعے مقامی سرمایہ داروں کا ایک ایسا طبقہ پیدا کیا گیا جو غیر ملکی سرمایہ داروں کا دُم چھلا بن گیا اور انہیں کے مفاد کی پاسبانی کرتا رہا۔

کسی ملک کی معیشت کا اندازہ اُس کی برآمدات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ ایران کی سرکاری رپورٹ میں برآمدات کو دو حصّوں یعنی تیل کی برآمدات اور دیگر اشیا کی برآمدات میں تقسیم کردیا گیا ہے۔ ۱۹۷۵ء۔۱۹۷۶ء کے سرکاری بجٹ کے مطابق تیل کی برآمد سے ۲۰،۵ ارب ڈالر وصول ہوئے۔ یہ رقم بجٹ کی کل آمدنی (۲۷،۵ ارب ڈالر) کا ۷۴ فیصدی تھی۔ اس کے مقابل دوسری برآمدات سے فقط ۵۷ کروڑ ڈالر کی آمدنی ہوئی۔ ان برآمدات میں بھی ۹۲ فیصدی خام اشیا تھیں اور صرف ۸ فیصد مصنوعات (قالین سازی بہت پرانی صنعت ہے اور دستکاری میں شمار ہوتی ہے) مختصر گوشوارہ حسب ذیل ہے۔

برآمد شدہ مال	رقم	فیصد شرح برآمدات
کپاس	۱۴،۵ کروڑ ڈالر	۲۲
قالین	۹،۵ کروڑ ڈالر	۱۶،۳
خام تانبہ، جست وغیرہ	۳،۵ کروڑ ڈالر	۶
میوہ جات	۷ کروڑ ڈالر	۱۱
کھال، چمڑہ	۳ کروڑ ڈالر	۵
صابن اور گلسرین وغیرہ	۳ کروڑ ڈالر	۵
سوتی کپڑا	۱،۵ کروڑ ڈالر	۲،۵

درآمدی تجارت کے اعداد و شمار بھی نوآبادیاتی معیشت ہی کی غمازی کرتے ہیں۔ مثلاً ۱۹۷۵ء۔۱۹۷۶ء میں جو مصنوعات درآمد کی گئیں، ان کی مالیت ۱۲ ارب ڈالر سے اوپر تھی یعنی برآمد سے ۲۴ گنا زیادہ۔ درآمدی اشیا میں فقط اسلحہ جات کی مالیت ۸ ارب بیس کروڑ تھی۔ لطف یہ ہے کہ ۷۵ فیصد درآمدی اشیا امریکہ، مغربی یورپ اور جاپان سے آئیں اور بیرونی تجارت میں ۱۱،۵ ارب ڈالر کا جو خسارہ ہوا اُس کو تیل کی آمدنی سے پورا کیا گیا۔

ایران میں مشینی صنعت کا رواج ۱۹۳۴ء میں شروع ہوا جب رضا شاہ اول نے ایک کارخانہ اسلحہ سازی کا قائم کیا اور چند فیکٹریاں شکر، سیمنٹ، تمباکو اور سوتی کپڑوں کی لگوائیں۔ یہ سب ریاست کی ملکیت تھیں البتہ سوتی کپڑے کی کچھ ملیں پرائیویٹ صنعتکاروں نے بھی لگائیں۔

اس طرح ۱۹۴۰ء تک چھوٹی بڑی صنعت گاہوں کی تعداد دو سو تک پہنچ گئی اور صنعتی مزدوروں کی تعداد پچاس ساٹھ ہزار ہوگئی۔ صنعتی سرگرمیوں کا دوسرا دور ڈاکٹر مصدق کے زمانے میں آیا مگر وہ دور بہت مختصر تھا۔ ۱۹۵۳ء کے کودیتا کے بعد شاہ اور اُس کے امریکی مشیروں نے محسوس کرلیا کہ آئندہ انقلاب کا سد باب کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ملکی معیشت کو پوری طرح ریاست کے تابع کیا جائے اور اصلاحِ احوال کی مناسب تدبیریں اختیار کی جائیں۔ چنانچہ ۳۵ کروڑ ڈالر سے، پہلے پانچ سالہ ترقیاتی منصوبے پر عمل درآمد شروع ہوا اور بیرونی سرمائے کی حوصلہ افزائی کے لیے ۱۹۵۵ء میں ایک ادارہ 'مرکز برائے حوصلہ افزائی و تحفظ سرمایہ خارجی' (HETA) کے نام سے قائم کیا گیا۔ اس ادارے کے ضابطوں کی رو سے غیر ملکی سرمایہ کاروں کو اُصل رقم اور نفع اور ڈیویڈنڈ کی کل رقم بیرونی سکوں میں ایران سے باہر لے جانے کی اجازت تھی۔ مزید برآں ان کو پانچ سال کے لیے ٹیکسوں سے مستثنیٰ کر دیا گیا تھا اور ان کے درآمدی سامان پر محصول بھی معاف تھا۔

شاہ نے اپنا صنعتی منصوبہ 'تابع سرمایہ داری' کے اصولوں پر تیار کیا تھا یعنی معیشت میں پبلک سیکٹر (قومی ملکیت) کے بجائے پرائیویٹ سیکٹر (نجی سرمایہ کاری) کو زیادہ سے زیادہ ترقی دینا مگر نجی صنعت کاروں کو مالی امداد اور لائسنسوں، پرمٹوں کے ذریعے اپنی مٹھی میں رکھنا تاکہ یہ نیا طبقہ ہمیشہ حکومت کے تابع رہے۔ نئے صنعت کاروں کی مالی امداد کے لیے متعدد ادارے بھی قائم کیے گئے۔ (مثلاً انڈسٹریل کریڈٹ بینک، انڈسٹریل اینڈ مائننگ ڈیولپمنٹ بینک، انڈسٹریل گارنٹی بینک وغیرہ) فقط تیل، گیس، فولاد کی صنعتیں اور تانبے کی کانیں حکومت کی براہِ راست نگرانی میں رہیں۔

اُن دنوں ایران میں نجی سرمایہ اگر کسی طبقے کے پاس تھا تو وہ 'بازار' بالخصوص تہران کے بازار کے تاجر تھے۔ اُن کی باقاعدہ گلڈ تھی اور وہ بہت منظم تھے۔ انہوں نے مشروطہ کی تحریک

میں اور پھر ڈاکٹر مصدق کی حمایت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ لہٰذا اس طبقے کا زور توڑنے کے لیے ضروری تھا کہ اُن عناصر کی سرپرستی کی جائے جن کا تعلق بازاروں سے نہ ہو۔ شاہ کے اس مقصد کو جزوی طور پر بعض بڑے زمینداروں نے پورا کیا جن کو زرعی اصلاحات کے باعث معقول رقمیں معاوضے میں ملی تھیں لیکن شاہ کے منصوبے کو دراصل 'افسر شاہی سرمائے' اور 'شرکتی سرمائے' نے پروان چڑھایا۔ لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ بازار کے سبھی تاجر وطن پرست تھے اور کسی نے بھی شاہ کے ساتھ تعاون نہیں کیا۔ مثلاً بہ شہر گروپ کا تعلق بازار سے تھا۔ اس نے ۱۹۴۴ء میں کاروبار شروع کیا تھا۔ ۱۹۷۶ء میں وہ ۲۲ کمپنیوں کا مالک اور ۹ کمپنیوں میں حصہ دار تھا لیکن ایران کے دوسرے صنعت کاروں کی طرح اُس کی سرگرمیاں بھی ہلکی پھلکی صنعتوں تک محدود رہیں۔

افسر شاہی سرمایہ

افسر شاہی سرمایہ دوسری جنگِ عظیم کا عطیہ ہے۔ اس سے مراد وہ سرمایہ ہے جو سرکاری اختیارات یا تعلقات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر جمع کیا گیا ہو۔ یہ نئی قسم کا سرمایہ جنگ کے بعد اکثر و بیشتر مشرقی ملکوں میں معیشت کا اہم عنصر بن کر ابھرا۔ یوں تو سرکاری دفتروں میں رشوت کا رواج جنگ سے پہلے بھی تھا لیکن رشوت لینے اور رشوت دینے کے مواقع بہت محدود تھے۔ مثلاً جنوبی ایشیا میں پولیس، پی ڈبلیوڈی، کسٹم اور مال کے محکمے رشوت کے لیے خاص طور پر بدنام تھے۔ پھر بھی رشوت کی مقدار بہت کم ہوتی تھی۔ بہت ہوا تو کسی سرکاری افسر نے رشوت کے پیسوں سے ایک دو مکان بنوا لیے یا دس بیس ایکٹر زمین خرید لی۔ رشوت کی رقم سے وہ صنعت کار یا ملک التجار نہیں بن سکتا تھا۔ البتہ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۵ء کے درمیان فوجی سامانوں کی سپلائی کی وجہ سے سرکاری افسروں کی قسمت جاگ اٹھی اور ناجائز طریقوں سے دولت جمع کرنے کے بے شمار مواقع پیدا ہو گئے۔ اشیائے صرف کی کمیابی اور خرید و فروخت پر کنٹرول سے بھی صاحبانِ اختیار نے خوب فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ بلیک کی رقم ٹھیکیداروں، صنعت کاروں اور سوداگروں کی جیب سے نکل کر وزیروں، سفیروں اور سرکاری افسروں کے گھر پہنچ گئی اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے لکھ

پتی، کروڑ پتی بن گئے۔ لائسنس، پرمٹ اور کنٹرول کا سلسلہ چونکہ جنگ کے بعد بھی بدستور جاری رہا لہٰذا افسر شاہی سرمایہ معیشت کا مستقل جزو بن گیا۔

پروفیسر گونر مرڈل نے اپنی مشہور تصنیف Asian Drama میں سرکاری دفاتر کے 'کرپشن' پر علیحدہ ایک باب باندھا ہے۔ اُن کا دعویٰ ہے کہ فلپائن سے پاکستان تک ہر ملک میں کرپشن کا بازار بڑے پیمانے پر چل رہا ہے اور یہ کہ اس ناجائز کاروبار میں وزرا، اسمبلیوں کے ممبر اور سرکاری افسر برابر کے شریک ہیں۔ انہوں نے مغربی کمپنیوں کو کرپشن کا خاص طور سے ذمے دار ٹھہرایا ہے جو 'جنوبی ایشیا میں صنعتی کاروبار میں سرمایہ لگاتی ہیں۔ براہِ راست یا مقامی کمپنیوں اور حکومتوں سے مل کر کئی سرمایہ کاروں نے مجھ سے ذاتی گفتگو میں بڑی بے تکلفی سے اس بات کا اعتراف کیا کہ وہ حصول مدعا کی خاطر بھاری بھاری رقمیں رشوت دینے سے گریز نہیں کرتے۔'

اس سلسلے میں پروفیسر مرڈل نے امریکی، فرانسیسی، مغربی جرمنی اور جاپانی کمپنیوں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے اور یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ 'میں نے کہیں بھی کسی کو یہ شکایت کرتے نہیں سنا کہ کمیونسٹ ملکوں کے تجارتی ادارے رشوت دیتے یا پیش کرتے ہیں۔'[1] انہوں نے امریکہ کے امدادی فنڈوں کو بھی کرپشن کا ایک سبب قرار دیا ہے۔

افسر شاہی سرمایے کا عمل دخل ایران میں ایشیا کے دوسرے ملکوں سے کہیں زیادہ تھا کیونکہ وزیر ہوں یا چوٹی کے بااختیار سرکاری افسر، سب شاہ کی مرضی سے مقرر ہوتے تھے اور شاہ کے علاوہ کوئی اُن سے باز پرس نہ کر سکتا تھا لہٰذا وہ بے دھڑک رشوت لیتے تھے۔ غیر ملکی فرمیں اُن کو اپنی کمپنی کے حصص بڑی فراخدلی سے پیش کرتی تھیں یا اُن کو مقامی کاروبار میں سرمایہ لگانے کی نفع بخش ترکیبیں بتاتی تھیں۔ چنانچہ فریڈ ہیلی ڈے سرکاری افسروں کی ناجائز زراندوزیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ 'کرپشن ایرانی سول سروس کا لازمی جز ہے بلکہ یہ ملک تو کرپشن کے بغیر موجودہ شکل میں چل ہی نہیں سکتا۔ جن فوجی اور سول افسروں نے اس طریقے پر پیسے بنائے ہیں ان کی تفصیل تو نہیں مل سکتی لیکن اس میں شبہ نہیں کہ یہ کاروبار وسیع پیمانے پر جاری ہے۔ حکومت ایران کے ایک غیر ملکی مشیر نے اس صورتحال کی صفائی میں دلیل

دیتے ہوئے کہا کہ مخدوش صنعتی کاروبار میں سرمایہ لگانے میں لوگوں کو جو ہچکچاہٹ ہوتی ہے اس پر قابو پانے کا سب سے موزوں طریقہ یہی ہے۔'

افسر شاہی سرمائے کے مالک خود براہ راست کاروبار نہیں کرتے تھے، بلکہ اپنے بیٹوں، بھتیجوں کے نام سے کمپنیاں قائم کرتے تھے یا ان کو غیر ملکی کمپنیوں میں شریکِ کار بنا کر اپنا سرمایہ اُن کے ذریعے لگاتے تھے۔

شرکتی اور غیر ملکی سرمایہ

مشرقی ملکوں میں بیرونی سرمائے کا داخلہ مشرق و مغرب کے اقتصادی تعلقات کی تیسری اور آخری کڑی ہے (اس کے ساتھ سامراجی گرفت کا دائرہ مکمل ہوگیا)۔ ان اقتصادی تعلقات کی ابتدا سترہویں صدی میں ہوئی تھی۔ اُس وقت مشرق کا پلہ بھاری تھا اور وہ صنعت وحرفت میں مغرب سے بہت آگے تھا۔ چنانچہ پرتگالی، ولندیزی برطانوی اور فرانسیسی سوداگر مشرقی منڈیوں سے مسالے، سوتی اور ریشمی کپڑے اور دوسری مصنوعات چاندی سونا دے کر نقد خریدتے تھے کیونکہ ان کے پاس کوئی قابلِ فروخت سامان نہیں ہوتا تھا۔ اس تجارت میں اجارہ داری قائم کرنے کی غرض سے تسخیر وتسلط کا سلسلہ شروع ہوا اور ہندوستان، لنکا، جنوبی افریقہ، ملایا، انڈونیشیا، سب مغربی کمپنیوں کے قبضے میں آگئے۔ انیسویں صدی میں یورپ میں صنعتی انقلاب آیا تو مشرق ومغرب کے تعلقات نے پلٹا کھایا۔ اب مغربی ملکوں کو اپنی فیکٹریوں، ملوں کے لیے خام مال اور اپنی مشینی مصنوعات کے لیے محفوظ بازاروں کی ضرورت پیش آئی لہٰذا مشرق کے صنعتی اداروں کو زبردستی نیست ونابود کیا گیا۔ اس طرح مشرق کا ہر ملک خام مال فراہم کرنے کی منڈی اور مغربی مصنوعات کے لیے کھلا بازار بن گیا اور تب تیسرا دور جس کو مالیاتی سرمائے کا دور کہتے ہیں شروع ہوا یعنی پسماندہ ملکوں میں سرمایہ لگا کر نفع کی شرح بڑھانا۔

انگریزوں نے برطانوی مقبوضات میں اپنا سرمایہ ربڑ اور چائے کے باغات میں لگایا یا لوہے، کوئلے، ہیرے، سونے اور دوسری قیمتی معدنیات میں۔ امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار بھی ابتدا میں انگریز کمپنیوں ہی کی اجارہ داری تھا۔ مغربی طرز کے ہوٹل اور بڑی بڑی دکانیں بھی

انہیں کی ملکیت تھیں۔ اسی طرح ریلوے لائنیں بچھانے اور ریل گاڑیاں چلانے کا کروڑوں روپے کا ٹھیکہ بھی انگریزوں ہی کو ملا تھا۔

ایران میں بھی سب سے پہلے انگریز کمپنیوں ہی نے سرمایہ کاری شروع کی مگر تیل میں۔ البتہ دوسری جنگ عظیم کے بعد جب حکومت نے بیرونی سرمائے کو طرح طرح کی سہولتیں فراہم کیں تو امریکی، جرمن، جاپانی، فرانسیسی اور برطانوی سرمایہ کاروں کی فوج کی فوج میدان میں اتر آئی۔ مال غنیمت کی اس تقسیم میں سیاسی غلبے کے باعث سب سے بڑا حصّہ امریکہ کو ملا۔ اس غیر ملکی سرمائے کی مالیت ۱۹۷۷ء میں تین ارب ڈالر سے کچھ کم تھی۔ یہ سرمایہ زیادہ تر ربڑ، ادویات اور دوسری کیمیاوی اشیا تعمیراتی سامان اور معدنیات میں لگا تھا۔ بعد ازاں غیر ملکی کمپنیاں موٹر سازی، اسلحہ سازی اور مشینی فارمنگ میں بھی سرمایہ لگانے لگیں۔ ان کے نفع کی عام شرح ۴۰ تا ۵۰ فیصد تھی۔

بیرونی سرمایہ ایران میں دو طریقوں سے کام کرتا تھا۔ اول مقامی کاروباریوں کے ساتھ مل کر، دوئم براہ راست بلا شرکتِ غیرے۔ مقامی سرمائے کے ساتھ شرکت اس وجہ سے لازمی تھی کہ قانون کی رو سے ایرانیوں کو ۵۱ فیصد حصص دیئے بغیر کوئی غیر ملکی کمپنی ایران میں کاروبار نہیں کرسکتی تھی لیکن جن لوگوں کو سرمایہ دار کمپنیوں کے طور طریقوں کا تجربہ ہے وہ جانتے ہیں کہ اس قسم کی پابندیاں محض رسمی ہوتی ہیں۔ دور کیوں جائیں، خود پاکستان میں بے شمار غیر ملکی کمپنیوں کے بیشتر حصے دار ڈائریکٹر حتیٰ کہ مینجنگ ڈائریکٹر پاکستانی ہیں۔ برما شیل، پاکستان ٹوباکو، پاکستان آکسیجن، سوئی گیس، گلیکسو سب کے مالک غیر ملکی سرمایہ دار ہیں لیکن قانوناً سب پاکستانی کمپنیاں ہیں۔ ان کے حصے دار ڈائریکٹر بھی بیشتر پاکستانی ہیں مگر یہ سب کاغذی کارروائیاں ہیں۔ ان غیر ملکی کمپنیوں کی پالیسی سات سمندر پار اُن کے صدر دفتر میں متعین ہوتی ہے اور نظم ونسق کے اہم فیصلے بھی وہیں ہوتے ہیں۔

'شرکت' کے کاروبار میں یوں تو سبھی غیر ملکی کمپنیوں نے حصّہ لیا لیکن ان کمپنیوں کی فہرست کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ امریکہ اور مغربی جرمنی کی کمپنیاں پیش پیش رہیں۔ مشترکہ کاروبار کی بدولت غیر ملکی کمپنیوں نے جو مراعات حاصل کیں اور جو نفع کمایا اس سے قطع

نظر بہت سے ایرانی صنعت کار اور سرمایہ کار بھی کروڑ پتی بن گئے۔ چنانچہ ایک اندازے کے مطابق ایران میں ۴۵ گھرانے ایسے تھے جو ملک کی ۸۵ فی صدی فرموں کے مالک تھے۔ ان میں کئی صنعت کار درجنوں 'شرکتوں' کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ مثلاً بوشہر انڈسٹریل کمپنی لمیٹڈ جس کے مینجنگ ڈائریکٹر لاجوردی تھے، صابن، فنائل، سوتی کپڑے، پیکجنگ، تعمیراتی مشینیں، زرعی پیداوار وغیرہ کی ۴۷ شرکتی کمپنیوں کی نگراں تھی اور اس کو مشہور امریکی سرمایہ دار گروپ روپانت کا تعاون حاصل تھا۔ اسی طرح ثابت گروپ ۲۱ شرکتوں کا مینجنگ ڈائریکٹر تھا اور جرمن دوا ساز کمپنی HOECHT اور جاپان کی توشیبا اور نپن الیکٹریکل کے تعاون سے فیکٹریاں چلاتا تھا۔ ایک اور کروڑ پتی ہدایت تھا جو اہواز رولنگ اینڈ پائپ ملز (شرکت سہام نوردو لولوئے اہواز) کا مالک تھا اور امریکی کمپنیوں میں حصے دار تھا۔ امریکہ کی ٹریکٹر ساز کمپنی میسی اینڈ فرگوسن 'جو شرکت میسران' کے نام سے دس کروڑ ڈالر سالانہ کا کاروبار کرتی تھی، اس کا نگراں اعتماد اپنی ایران کے سابق وزیر اعظم کا بیٹا تھا۔ ایک اور شرکتی کمپنی 'ایران پلاننگ' تھی جو سڑکیں بنانے کی مشینیں امریکہ سے امپورٹ کرتی تھیں۔ اس کے نگراں امیرا نتظام تھے جو کچھ عرصے پہلے تک ڈاکٹر بازارگان کی حکومت میں نائب وزیر اعظم تھے۔ ایک 'شرکتی قسم' کنسلٹنگ انجینئرز کی تھی جس کے کرتا دھرتا فرمان فرمائیان تھے لیکن شاید 'شرکتی کمپنیوں میں سب سے دولت مند' ایران نیشنل انڈسٹریل مینو فیکچرنگ کمپنی تھی جس کو احمد خیامی چلاتے تھے۔ یہ دراصل جنرل موٹرز (امریکہ) کی شاخ تھی جو ایران میں موٹریں، ٹرکیں، بسیں اور منی بسیں تیار کرتی تھی۔ اُس کو سیسنا ہوائی جہاز کا ٹھیکہ بھی ملا ہوا تھا اور اس میں امریکی نارتھوپ کارپوریشن کا ۴۹ فیصد حصہ تھا۔ احمد خیامی جنرل موٹرز کی موٹروں کو 'پیکان' کے نام سے فروخت کرتا تھا۔ یہ موٹریں ایران میں بنتی نہیں تھیں بلکہ ان کے کل پرزے امریکہ سے آتے تھے اور ان کو یہاں فقط جوڑا جاتا تھا۔ احمد خیامی کو امریکی بیل ہیلی کوپٹر سے سیاہ بردار ہیلی کوپٹر بنانے کا ٹھیکہ ملا ہوا تھا جن میں توپیں بھی لگی ہوتی تھیں۔ نیشنل نے فوج کو حال ہی میں ۵۰ کروڑ ڈالر کے ہیلی کاپٹر سپلائی کیے تھے۔ یہ وہی ہیلی کاپٹر تھے جن سے تہران میں مظاہرین پر گولیاں برسائی جاتی تھیں۔

اخبار فائنشل ٹائمز رقمطراز ہے کہ فرمان فرمائیان، ہدایت، احمد خیامی اور لاجوردی وغیرہ

شاہ اور شاہی خاندان کے افراد سے بڑے قریبی تعلقات رکھتے تھے لہٰذا انقلاب کے بعد وہ ملک سے فرار ہو گئے ہیں۔ البتہ کروڑوں ڈالر اپنے ہمراہ لے گئے ہیں۔

جرمن سرمائے کے تعاون سے جو کمپنیاں چل رہی تھیں اُن میں سے بعض کے نام یہ ہیں:۔

سیمنز (Siemens) شرکت سہام خاص، شرکت علم نو، شرکت بے نظیر، شرکت حیدر زادہ

با اثر گھرانوں کے افراد کو کاروبار میں شریک کر کے یا بڑی بڑی نوکریاں دے کر غیر ملکی کمپنیاں بڑے فائدے میں رہتی تھیں۔ (غیر ملکی کمپنیاں پاکستان میں بھی یہی مجرب نسخہ استعمال کرتی ہیں) اُن کے توسط سے وزیروں اور با اختیار افسروں تک آسانی سے پہنچا جا سکتا تھا۔ دفتروں میں اٹکی ہوئی فائلیں رشوت دے کر جلد حرکت میں آ جاتی تھیں۔ ان شریک کاروں میں بعضوں کی رسائی شاہ تک تھی۔ لہٰذا ان کو بڑے بڑے ٹھیکے مل جاتے تھے اور جو رقمیں بجٹ میں ترقیاتی منصوبوں کے لیے مخصوص ہوتی تھیں وہ بھی یہ حضرات اپنی کمپنیوں کے نام الاٹ کروا لیتے تھے۔ مثلاً ۱۹۷۴ء۔ ۱۹۷۵ء میں تقریباً ایک ارب ڈالر اور ۱۹۷۵ء۔ ۱۹۷۶ء میں ڈیڑھ ارب ڈالر پرائیویٹ صنعت کاروں کے لیے مخصوص تھے۔ ان رقموں کا زیادہ حصہ 'شرکتیوں' ہی کو عطا ہوا۔

مگر براہِ راست کاروبار کرنے والے غیر ملکی اداروں کے تو ٹھاٹھ ہی جدا تھے۔ وہ قانوناً کسی ایرانی کو شریکِ کار بنانے کے لیے مجبور نہ تھے بلکہ اُن کا معاہدہ حکومت کے ساتھ ہوتا تھا۔ یہ وہ صنعت کار تھے جن کو تنصیبات اور تعمیرات کے بڑے بڑے ٹھیکے ملے ہوئے تھے یا حکومت جن سے اسلحہ جات خریدتی تھی مثلاً بوشہر میں ایٹمی توانائی سے چلنے والے دو بجلی گھروں کا ٹھیکہ مغربی جرمنی کی ایک انجینئرنگ فرم کرلیفٹ ورک یونین کو ملا تھا۔ اس پر سات ارب ڈالر لاگت آنے والی تھی مگر جوہری توانائی کے موجودہ ڈائریکٹر ڈاکٹر سحابی کہتے ہیں کہ 'ان بجلی گھروں سے نہ ملک کا بھلا ہونے والا تھا نہ لوگوں کا۔' انہوں نے یہ الزام بھی لگایا ہے کہ معاہدے میں مصارف کی جو رقم متعین کی گئی تھی وہ بہت مبالغہ آمیز ہے مگر اکثر و بیشتر معاہدوں میں مصارف کا تخمینہ بہت بڑھا چڑھا کا پیش کیا جاتا تھا کیونکہ انہیں رقموں سے شاہ کے گماشتوں کو لاکھوں کروڑوں ڈالر رشوت دی جاتی تھی۔ ایسا ہی ایک چھ ارب ڈالر کا ٹھیکہ امریکہ اور برطانیہ کو گیس کا

پلانٹ لگانے کی خاطر دیا گیا تھا۔ آئی۔ ٹی۔ ٹی (انٹرنیشنل ٹیلیفون اور ٹیلی گراف) امریکہ کی سب سے بڑی کمپنی ہے۔ اُس کو ٹیلی فون کا دو ارب ڈالر کا ٹھیکہ ملا ہوا تھا۔ اخبار فائننشل ٹائمز لندن مورخہ ۴ جون ۱۹۷۹ء میں ۲۵ پراجیکٹوں کی تفصیلات شائع ہوئی ہیں، جن کے ٹھیکے غیر ملکی کمپنیوں کو دیئے گئے تھے۔ یہ وہ ٹھیکے ہیں جن کی لاگت پچاس کروڑ ڈالر سے زیادہ تھی۔ ان میں فوجی ٹھیکے شامل نہیں ہیں اور نہ وہ ٹھیکے جن پر پچاس کروڑ ڈالر سے کم خرچ ہوئے۔ ان ۲۵ پراجیکٹوں کی مجموعی لاگت ۵۲ ارب ڈالر تھی۔

مغربی کمپنیاں ایران کی کلیدی صنعتوں میں سرمایہ نہیں لگاتی تھیں اور نہ وہ چاہتی تھیں کہ کلیدی صنعتوں کو فروغ دے کر ایران خود کفیل ہوجائے۔ چنانچہ ایران نے جب کبھی لوہے اور فولاد کی ملیں لگانے کی خواہش ظاہر کی تو مغربی ملکوں نے ایک نہ ایک رکاوٹ کھڑی کردی۔ ایران کو جب ہر طرف سے ٹکا سا جواب مل گیا تب مجبور ہوکر سوویت یونین سے رجوع کیا گیا اور فولاد کا پہلا کارخانہ ۱۹۶۵ء میں اصفہان میں سوویت یونین کی مدد سے لگایا گیا۔ بعینہ یہی افتاد پاکستان کو بھی پیش آئی۔ اسٹیل مل کی تجویز جب کبھی برطانیہ، مغربی جرمنی اور امریکہ کے ماہرین کے سامنے رکھی گئی تو انہوں نے ہمیشہ ٹال مٹول سے کام لیا۔ آخر تھک ہار کر پاکستان کو بھی سوویت یونین سے مدد کی درخواست کرنی پڑی۔ اصفہان اسٹیل ملز کی داستان بیان کرتے ہوئے ایران المینک ۱۹۷۶ء کا مصنف لکھتا ہے کہ:

'ایران نے دوسری جنگ عظیم کے بعد ایک اسٹیل مل لگانے کی کوشش کی۔ کئی برس گزر گئے مگر امریکی اور جرمن ٹال مٹول کرتے رہے۔ آخر کار ایران نے سوویت یونین سے رجوع کیا اور ایک اسٹیل مل لگانے کا معاہدہ ہوا جس کی ابتدائی پیداوار چھ لاکھ ٹن سالانہ تھی جو ایک سال میں بڑھ کر بارہ لاکھ ٹن ہوگئی۔ آج یہ اسٹیل مل کرمان تک پھیلی ہوئی ہے سوویت یونین نے مل کا ڈیزائن تیار کیا، مشینیں بھیجیں، ان کو نصب کیا اور خام لوہے کی معدنیات کی تلاش و جستجو میں ایران کی مدد کی۔ سوویت یونین نے ایرانی ماہروں، مستریوں کو ٹریننگ بھی دی... یہ مل ۱۳ / مارچ ۱۹۷۳ء سے چلنے لگی۔' (ص ۲۱۳)

مگر یہ اسٹیل مل جس مقصد کے لیے لگائی گئی تھی وہ پورا نہیں ہوا بلکہ شاہ کی غلط صنعتی پالیسی کے باعث اس مل کی پیداوار بھی غیر ملکی فیکٹریوں کی نذر ہوگئی۔ فولاد سے مشینیں نہیں بنائی گئیں اور نہ کل پرزے ڈھالے گئے بلکہ اس قیمتی صنعتی پیداوار کو موٹر کاروں، ایئر کنڈیشنروں اور ریفریجریٹروں میں استعمال کر کے ضائع کر دیا گیا۔

کارفرماؤں کے ذکرِ خیر کے بعد ایران کے کاریگروں کا مختصر حال چنداں بے محل نہ ہوگا۔ ایران میں اُن عورتوں مردوں کی تعداد جو زراعت اور صنعت و حرفت میں اجرت پر کام کرتے ہیں ایک کروڑ سے کچھ اوپر ہے۔ ان کی شعبہ وار تقسیم حسب ذیل ہے:

زراعت	۳۸ لاکھ
تیل	۵۵ ہزار
مینوفیکچر اور معدنیات	۲۵ لاکھ
تعمیرات	۱۰ لاکھ
تجارت	۵ء۷ لاکھ
ٹرانسپورٹ اور مواصلات	۳ لاکھ
سرکاری ملازمین	۸ لاکھ
بینک، بیمہ وغیرہ	۵ء۱۰ لاکھ
افادی شعبے	۶۵ ہزار
کل	۱۰۲۹۵۰۰۰
بے روزگار	۴۰ لاکھ

زراعت سے قطع نظر ۲۵ فیصد محنت کار فیکٹریوں، ملوں، ورکشاپوں اور کانوں میں کام کرتے ہیں۔ گزشتہ بیس سال میں سب سے زیادہ اضافہ بھی انہیں کی آبادی میں ہوا ہے۔ (۸ لاکھ سے ۲۵ لاکھ) لیکن فقط ۵ء۴ لاکھ مزدور بڑی بڑی صنعت گاہوں یا کانوں سے وابستہ تھا۔ باقی بیس لاکھ چھوٹی چھوٹی صنعت گاہوں میں جن میں دس سے کم مزدور کام کرتے تھا، ملازم تھا۔ ہر چند کہ ملک کی پوری معیشت کا دارومدار تیل پر ہے لیکن تیل کی صنعت میں

مزدوروں کی تعداد سب سے کم ہے۔ یہ تعداد برابر کم ہوتی جارہی ہے (حالانکہ تیل کی پیداوار میں گزشتہ بیس برسوں میں بیس گنا اضافہ ہوا ہے)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عام ملوں اور فیکٹریوں کے برعکس تیل کی صنعت مشینوں اور انجینئروں کے بل پر چلتی ہے۔ اس میں جسمانی محنت کرنے والے مزدوروں کی ضرورت نسبتاً بہت کم ہوتی ہے۔ پھر بھی تیل کے مزدوروں کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ نومبر، دسمبر ۱۹۷۸ء میں شاہ کے خلاف تحریک کے دوران جب تیل کے مزدوروں نے ہڑتال کردی اور تیل کی پیداوار بند ہوگئی تو ملک کا نظام درہم برہم ہوگیا۔ مٹی کے تیل اور پٹرول کے قحط کے باعث ہوائی جہازوں، ریل گاڑیوں، بسوں اور موٹروں کے پہیئے رک گئے اور دکانیں، دفتر، سینما، ہوٹل سب سنسان ہوگئے۔

ایرانی قانون کے مطابق مزدوروں کی کم سے کم یومیہ اجرت ۹۰ یال ہونی چاہیے تھی۔ اس حساب سے ان کو مہینے میں کم از کم ڈھائی ہزار ریال اُجرت ملنی چاہیے تھی لیکن سرکاری اعداد وشمار کے مطابق ۷۳ فیصد مزدوروں کو اس سے بھی کم اجرت ملتی تھی اور مہنگائی کا یہ حال تھا کہ گزشتہ دس سال میں اشیائے صرف کی قیمتوں میں بارہ گنا اضافہ ہوگیا تھا۔ اخبار 'کیہان' کے مطابق تہران میں جہاں ۴۸ فیصدی مزدور آبادی مرکوز ہے چھوٹے سے چھوٹے فلیٹ کا ماہانہ کرایہ پچاس ہزار ریال تھا۔ ایسی صورت میں اگر ہر سرکاری ملازم رشوت لیتا تھا تو جائے حیرت نہیں مگر مزدوروں کو رشوت کون دیتا ہے لہٰذا بندۂ مزدور کے اوقات ایران میں واقعی بہت تنگ تھے۔

ٹریڈ یونین تحریک

ایران میں سب سے پہلی ٹریڈ یونین، چھاپے خانے کے مزدوروں نے ۱۹۰۷ء میں مشروطہ کے عروج کے زمانے میں بنائی تھی۔ ۱۹۱۸ء میں انہوں نے چودہ دن ہڑتال کر کے حکومت سے آٹھ گھنٹہ یومیہ محنت کا اصول منوالیا تھا اور کچھ دوسری رعایتیں بھی حاصل کرلی تھیں۔ دوسرے سال ٹیکسٹائل مزدوروں کی، دکانوں کے ملازمین کی اور بینکروں کی یونین بھی بن گئیں اور رفتہ رفتہ یونین سازی کا رواج دوسرے شہروں میں بھی شروع ہوگیا۔ چنانچہ ایرانی ٹریڈ یونینوں کے نمائندے سید محمد دہقانی نے ۱۹۲۲ء میں ماسکو میں منعقد ہونے والی بین الاقوامی لیبر کونسل کے

اجلاس میں اپنی رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس وقت تہران میں دس ٹریڈ یونین کام کر رہی ہیں اور ان کی ایک مشترکہ ٹریڈ کونسل بھی ہے۔ اس کے علاوہ رشت، انزلی، قم اور تبریز میں بھی یونینیں موجود ہیں۔[۲]

لیکن رضا شاہ اوّل نے ۱۹۲۸ء میں ٹریڈ یونین تنظیموں کو خلاف قانون قرار دے دیا۔ ٹریڈ یونین کے دفاتر بند ہوگئے اور ٹریڈ یونین کے لیڈروں نے ملک سے بھاگ کر پناہ لی یاروپوش ہوگئے۔ البتہ ۱۹۴۱ء میں ایران پر اتحادیوں کا تسلط ہوا تو ٹریڈ یونین تحریک میں دوبارہ جان آئی۔ ۱۹۴۴ء میں کمیونسٹ کارکن ٹریڈ یونینوں کی ایک مرکزی کونسل 'شورائی متحدہ مرکزی' بنانے میں کامیاب ہوگئے۔ (CUCTU) وہ 'ظفر' نامی مزدوروں کا ایک اخبار بھی شائع کرتے تھے۔ اُس زمانے میں ٹریڈ یونین تحریک کا رہنما ایک شخص رستیؔ تھا۔ وہ گیلان کے ایک ترک کسان کا بیٹا تھا، اس نے رشت میں تعلیم پائی تھی اور طالب علمی ہی کے زمانے میں موچیوں، لوہاروں اور راج مزدوروں کی یونینیں بنائی تھیں۔ ۱۹۲۳ء میں وہ تعلیم کی غرض سے سوویت یونین چلا گیا اور ۱۹۲۵ء میں واپس آ کر دوبارہ مزدوروں میں کام کرنے لگا۔ ٹریڈ یونینیں جب خلافِ قانون ہوگئیں تو بھی اُس نے خفیہ طور پر اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں مگر ۱۹۳۱ء میں پکڑ لیا گیا۔ اتحادیوں کے آنے پر دس سال بعد رہا ہوا اور اعلانیہ ٹریڈ یونین تحریک میں شامل ہوگیا۔ لیکن ۱۹۵۳ء میں فوجی کو دیتا کے بعد ایران میں رہنا ناممکن ہوگیا تو رضا رستیؔ نے جلاوطنی اختیار کی اور اس عالم میں ۱۹۶۶ء میں وفات پائی۔

جنگ کے زمانے میں صنعتی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا تو صنعتی مزدوروں کی تعداد بھی بڑھتی گئی۔ چنانچہ ۱۹۴۶ء میں خوزستان میں تیل مزدوروں کی تعداد ۹۰ ہزار ہوگئی۔ تہران کے مینوفیکچرنگ کارخانوں میں مزدوروں کی تعداد ۵۰ ہزار، تبریز میں ۵۰ ہزار، اصفہان، یزد اور شیراز کی سوتی ملوں میں ۶۵ ہزار اور مازندران اور گیلان کی سوتی ملوں اور کوئلے کی کانوں میں ۴۵ ہزار مزدور کام کرتے تھے۔ ایرانی معیشت میں پرولتاریہ آہستہ آہستہ ایک قوت بنتی جا رہی تھی۔ لہٰذا ان کی قوت کو توڑنے اور اُن میں پھوٹ ڈالنے کی غرض سے وزیراعظم قوام السلطنت نے سرکاری ٹریڈ یونین کی ایک تنظیم ETKI کے نام سے کھڑی کی۔ ۱۹۴۹ء میں 'شورائے متحدہ مرکزی'

کو خلافِ قانون جماعت قرار دے دیا گیا۔ اور سرکاری ٹریڈ یونین کا الحاق امریکیوں کی ICFTU سے ہو گیا مگر ETKI کے ممبروں کی تعداد کبھی تین ہزار سے نہیں بڑھی۔ ڈاکٹر مصدق کے دور میں مزدوروں کی تحریک کو تھوڑا سہارا ملا تھا لیکن اُن کی برطرفی کے بعد وہ سہارا بھی ختم ہو گیا۔

ملکی معیشت میں صنعتی مزدوروں کو جو اہمیت حاصل ہے شاہ کو اُس کا احساس تھا۔ وہ جانتا تھا کہ فیکٹریاں، ملیں اور کارخانے مزدوروں کو تھوڑی بہت مراعات دیئے بغیر تشدد کے ذریعے نہیں چل سکتیں۔ لہٰذا شاہ نے جو لیبر پالیسی وضع کی وہ عتاب وعنایت کی ملی جلی حکمت عملی پر مبنی تھی۔ یعنی 'سرکش' مزدوروں پر جبر و تشدد اور بکاؤ مزدوروں پر لطف و کرم۔ مقصد یہ تھا کہ مزدوروں میں طبقاتی شعور نہ ابھرنے پائے۔ وہ طبقاتی جدو جہد سے گریز کریں اور طبقاتی میل جول کو اپنا شعار بنائیں۔ شاہ مزدوروں کو یہ تاثر بھی دینا چاہتا تھا کہ تمہارا حقیقی مربی و محافظ میں ہوں اور فقط میں تم کو بھیڑیوں سے بچا سکتا ہوں۔

اس پالیسی کو کامیاب بنانے کے لیے ۱۹۵۷ء میں امریکی 'ماہروں' کی خدمات حاصل کی گئیں۔ ٹریڈ یونینوں کو جو خلافِ قانون تھیں بحال کیا گیا۔ اُن کے عہدہ داروں کا سرکاری نگرانی میں انتخاب ہوا۔ ان عہدیداروں اور دوسرے 'معتبر' مزدوروں کی 'فنی تربیت' کے لیے جگہ جگہ ٹریننگ سینٹر قائم کیے گئے۔ ان سینٹروں کو چلانے کے لیے U.S. Operation Mission نے ایک کروڑ ریال کی مالی امداد دی۔ مزدوروں کی تربیت کی ذمے داری امریکیوں ہی کے سپرد ہوئی اور سینٹو کی جانب سے پانچ ماہر معلم بھی ایران آئے۔ ٹریننگ سینٹروں میں جن کارکنوں کی کارکردگی اطمینان بخش ہوتی، ان کو مزید تربیت کے لیے امریکہ بھیج دیا جاتا۔ سال چھ مہینے وہاں رہنے کی بعد جب وہ واپس آتے تو ٹریڈ یونین کی تنظیم اُن کے حوالے کر دی جاتی۔ اس طرح سے وہ مزدوروں کا بالائی طبقہ بن جاتے اور حکومت کے ساتھ اچھے تعلقات رکھنے سے جو فائدے ہوتے ہیں اُن کی زندہ مثال۔ ٹریڈ یونینوں کی مرکزی تنظیم میں بھی امریکہ پلٹ مزدوروں ہی کی اکثریت ہوتی تھی اور بین الاقوامی کانفرنسوں میں بھی یہی حضرات ایرانی مزدوروں کی نمائندگی کرتے تھے۔

جبر و تشدد کے فرائض ساواک کے ذمے تھے۔ بڑی بڑی ملوں، فیکٹریوں میں تو ساواک

کا دفتر بھی عمارت کے اندر ہی ہوتا تھا اور ساواک کا عملہ علانیہ کام کرتا تھا۔ ساواک کے گرگے فیکٹری کے ہر شعبے میں موجود ہوتے اور ساواک کو مزدوروں کے طرزِ عمل، اُن کی بات چیت، اُن کے جذبات واحساسات سے برابر مطلع کرتے رہتے تھے۔ اگر کسی مزدور کے انقلابی رجحانات کا سراغ مل جاتا تو پھر اُس کی جان خطرے میں پڑ جاتی۔ ساواک کی وجہ سے فیکٹریوں میں خوف ودہشت کی فضا چھائی رہتی اور مزدور ایک دوسرے سے دل کی بات کہتے ڈرتے تھے کہ مبادا جس سے وہ گفتگو کر رہے ہیں وہ ساواک کا مخبر ہو۔

۱۹۵۹ء میں ایران میں جو لیبر قانون نافذ ہوا وہ ہٹلر اور فرانکو کے لیبر قوانین کا چربہ تھا۔ اس قانون کے تحت ہر ٹریڈ یونین کے لیے وزارتِ محنت کی منظوری لازمی تھی۔ اس منظوری کے بغیر کوئی ٹریڈ یونین رکن سازی کی مجاز نہ تھی اور نہ وہ مزدوروں کی نمائندگی کر سکتی تھی۔ اس کے علاوہ ٹریڈ یونین کے ارکان کسی سیاسی جماعت میں شامل نہیں ہو سکتے تھے اور نہ سیاست میں حصہ لے سکتے تھے۔ البتہ جب ۱۹۷۵ء میں شاہ نے اپنی پارٹی 'رستخیز' بنائی تو مزدوروں کو اس میں شامل ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ اس قانون کے تحت مزدوروں کو اپنے مطالبات کے لیے جلسے جلوس اور ہڑتال کی بالکل اجازت نہیں تھی۔

اسی بنا پر شاہ بڑے فخر سے کہا کرتا تھا کہ ایران میں مزدوروں کی ہڑتالیں نہیں ہوتیں۔ چنانچہ روزنامہ 'کیہان' تہران نے ۵ مارچ ۱۹۷۷ء کی اشاعت میں شاہ کا ایک انٹرویو (مصاحبہ) چھاپا جس میں شاہ نے دعویٰ کیا تھا کہ ایران میں مزدوروں کی ایک منٹ کی بھی ہڑتال نہیں ہوتی۔

> 'شاهنشاه تصریح فرموبد مشکلات اقتصادی غرب ناشی از فقدان انضباط و اراده کار کردن است در حالیکه در ایران یک دقیقه اعتصاب کارگری وجود نه دارد.'

یعنی شاہ نے واضح کر دیا کہ مغربی ملکوں کی اقتصادی مشکلات کا سبب یہ ہے کہ وہاں ڈسپلن کی کمی اور بد نظمی ہے در آں حالیکہ ایران میں مزدوروں کی ایک منٹ کی بھی ہڑتال نہیں ہوتی۔

لیکن شاہ کا یہ دعویٰ غلط تھا کیونکہ ساواک کی تمام سختیوں اور نگرانیوں کے باوجود مزدوروں

کی جدو جہد جاری رہی اور ہڑتالوں کا سلسلہ کبھی بند نہیں ہوا۔ مثلاً رست کی شاہ باف فیکٹری (سوتی مل) میں فروری ۱۹۷۶ء میں زبردست ہڑتال ہوئی اور ساواک اور پولیس کی موجودگی کے باوجود مالکوں کو مزدوروں کی اجرت میں اضافہ کرنا پڑا۔ اپریل ۱۹۷۶ء میں علاقہ مغان میں پارس آباد فرم کے تین ہزار کھیت مزدوروں نے ہڑتال کی۔ ان سے بارہ گھنٹے یومیہ کام لیا جاتا تھا اور عورتوں کو مردوں سے آدھی اجرت دی جاتی تھی۔ اُن کا مطالبہ تھا کہ لیبر قوانین کے مطابق آٹھ گھنٹے کام لیا جائے اور عورتوں کو مردوں کے برابر اجرت دی جائے۔ فوجی پولیس نے اُن کی ہڑتال کو ناکام بنادیا۔ مئی ۱۹۷۶ء میں مارند، تبریز اور اردبیل کی اینٹ کی بھٹیوں کے دس ہزار مزدوروں نے ہڑتال کردی کیونکہ ان کی اجرت ۱۲ فی صد گھٹادی گئی تھی اسی مہینے میں شاہ رود کے قریب سنگ رود کوئلے کی کانوں میں ہڑتال ہوئی تو ساواک کے تشدد سے بچنے کے لیے چار ہزار مزدوروں نے اپنے چہرے کالے کر لیے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ اجرتوں میں مصارف زندگی کی مناسبت سے اضافہ کیا جائے ہڑتال کو کچلنے کے لیے فوج طلب کر لی گئی مگر ہڑتالی اپنے مطالبات پر اڑے رہے آخر کار، کان کے مالکوں کو یہ مطالبات ماننے پڑے البتہ ہڑتال کے ختم ہونے کے بعد ساواک والے پچاس ساٹھ مزدوروں کو پکڑ لے گئے تاکہ ہڑتال کے سرغنوں کا سراغ لگایا جاسکے لیکن ساواک کا یہ مقصد پورا نہیں ہوا۔ یوم مئی کے موقع پر تہران کی ایک سوتی مل میں تین ہزار مزدوروں نے مظاہرہ کیا جس کو دبانے کے لیے فوجی پولیس بلائی گئی اور اس کی فائرنگ سے درجنوں مزدور ہلاک اور زخمی ہوئے۔ یہ ہڑتال دو ہفتے جاری رہی اور اٹلس گروپ کی سوتی مل اور رزم آرا اسٹریٹ کی کئی فیکٹریوں کے مزدوروں نے بھی ہمدردی میں ہڑتال کردی۔ اسی طرح اگست میں بوشہر کے صنعتی گروپ BIG کے مزدوروں نے ہڑتال کی اور جون میں اصفہان کی شہناز سوتی مل کے ساتھ ہزار مزدوروں نے۔

ہڑتالوں کی اس بڑھتی ہوئی رو پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے سرکاری اخبار 'تہران اکنامسٹ' نے لکھا کہ:

'ہم بڑے افسوس کے ساتھ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ہمارے ملک میں پچھلے چند برسوں میں جی لگا کر کام کرنے اور پیداوار بڑھانے کا جذبہ بہت گھٹ

گیا ہے۔۔۔۔اس کا بڑا سبب ایران کے شر پسند دشمنوں کا خفیہ پروپیگنڈہ ہے[۳]
شاہ کے دعوے اور شاہ کے طنبورے کے اعتراف میں جو تضاد ہے اس پر تبصرہ فضول ہے۔

خارجہ حکمت عملی

رضا شاہ پہلوی کی خارجہ پالیسی ابتداہی سے امریکہ کے تابع تھی (تفصیل کے لیے دیکھیے پانچواں باب 'امریکہ کا عمل دخل') شاہ کی مغرب نوازی کی انتہا یہ تھی کہ ایشیا اور افریقہ کے قریب قریب تمام ملکوں کے متفقہ فیصلے کے برخلاف شاہ نے اسرائیل اور جنوبی افریقہ سے سفارتی تعلقات قائم کر رکھے تھے اور ان کو تیل فراہم کرتا تھا۔ اسرائیل سے تعلقات اتنے گہرے تھے کہ ساواک کی تنظیم میں سی۔ آئی۔ اے کے علاوہ اسرائیلی خفیہ پولیس 'موسد' سے بھی مدد لی گئی اور موسد سے بعد میں بھی مستقل رابطہ رہا۔ اس کے علاوہ شاہی فوج کے افسروں کی تربیت بھی اسرائیل میں ہوتی تھی چنانچہ شاہ نے ایک مغربی صحافی سے دورانِ ملاقات خود اعتراف کیا کہ 'ایرانی فوج کا تقریباً ہر جرنیل اسرائیل کا دورہ کر چکا ہے اور سینکڑوں جونیئر افسروں نے وہاں ٹریننگ پائی ہے'[۴]

شاہ اسرائیل کو مالی امداد بھی دیتا تھا۔ مثلاً اسرائیل نے بحرِ قلزم کی بندرگاہ ایلات سے بحرِ روم کی بندرگاہ اشکیلون تک تیل کی ۱۶۲ میل لمبی پائپ لائن بچھائی تو اس کے سارے مصارف ایران نے برداشت کیے[۵] تہران میں کئی اسرائیلی بینک اور تجارتی ادارے باقاعدہ کاروبار کرتے تھے اور اسرائیل سے ہر سال ۶۳ کروڑ کا سامان درآمد ہوتا تھا۔ ایک 'اسرائیلی ہاؤس' بھی موجود تھا جو انقلاب کے بعد فلسطینی مجاہدین کے تصرف میں ہے۔

شاہ کی خارجہ پالیسی دو ادوار سے گزری ہے۔ پہلا دور وہ تھا جس میں شاہ ہر اعتبار سے امریکہ کا دست نگر تھا۔ اس کو ۱۹۵۳ء میں امریکہ نے تخت دلوایا تھا اور وہی شاہ کو مالی اور فوجی امداد دیتا تھا۔ یہ دور ۱۹۶۹ء میں اس وقت ختم ہوا جب ایران کی تیل کی پیدوار ایک ارب ڈالر ہوگئی اور ایران کو امریکی امداد کی حاجت نہ رہی۔ اس کے تیل کی آمدنی میں ہر سال اضافہ ہوتا گیا یہاں تک کہ ۱۹۷۴ء میں ایران کو ۲۲ ارب ڈالر وصول ہوئے۔ شاہ کے توسیعی عزائم کی

محرک یہی آمدنی تھی۔

اس دوران میں بین الاقوامی حالات بھی بہت تیزی سے بدلے۔ ویتنام میں امریکہ کی شکست ، واٹر گیٹ کا اسکینڈل ــــ جس کی وجہ سے امریکہ کے عالمی وقار کو سخت دھکا لگا۔ تیل پیدا کرنے والے ملکوں کی سودا کاری کی قوت میں اضافہ اور پھر برطانیہ کا یہ اعلان کہ وہ ۱۹۷۱ء تک خلیج فارس کا تمام علاقہ خالی کردے گا۔ کویت (۱۹۶۱ء) اور شمالی اور جنوبی یمن (۱۹۶۷ء) پہلے ہی آزاد ہوچکے تھے۔ برطانیہ نے جنوری ۱۹۷۱ء میں بحرین، قطر اور متحدہ عرب امارات کے پورے علاقے سے اپنی فوجیں واپس بلالیں اور یہ ملک آزاد ہوگئے اور تب شاہ کو ہخامنشی سلطنت کے احیا کے خواب آنے لگے۔

کہتے ہیں کہ شاہ کا یہ شوقِ دارائی جنون کی حد تک بڑھ گیا تھا وہ گھنٹوں کوروش اور داریوش کی سلطنت کا نقشہ دیکھتا رہتا تھا۔ اس کو یقین تھا کہ فوجی طاقت اور امریکی رفاقت سے ایک نہ ایک دن ساحلِ سندھ سے ساحلِ نیل تک مشرقِ وسطیٰ کا پورا علاقہ میرے زیرِ اثر آجائے گا۔ وہ ایران کو مشرق وسطیٰ کا پولیس مین کہتے نہیں تھکتا تھا بلکہ آخری دنوں میں تو شاہ یہ دعویٰ کرنے لگا تھا کہ ایران عنقریب دنیا کی پانچویں بڑی طاقت ہوجائے گا۔ اپنے توسیعی عزائم کے لیے فضا سازگار کرنے کی غرض سے رضا خاں سپہ دار کا بیٹا ہخامنشی اور ساسانی شہنشاہوں کی تقلید میں پہلے 'شہنشاہ' بنا اور پھر 'آریہ مہر' حالانکہ ہخامنشی اور ساسانی فرمانروا شہنشاہ اس وجہ سے کہلاتے تھے کہ بہت سے خود مختار بادشاہ ان کو خراج ادا کرتے تھے۔ جب کہ رضا شاہ کی ریاست ایران تک محدود تھی۔ اس کے بعد شاہ ایک قدم اور آگے بڑھے اور اپنی شاہانہ عظمت کا سکہ بٹھانے کی خاطر انہوں نے ۱۹۷۱ء کے موسمِ بہار میں ایرانی شہنشاہیت کا ڈھائی ہزار سالہ جشنِ بنیاد کوروش اعظم کے پایہ تخت پرسی پولس (اصطخر) میں بڑی دھوم سے منایا۔ اس تقریب میں بہت سے سربراہانِ مملکت بشمول جنرل یحییٰ خاں، شہزادے، شہزادیاں، وزرا اور عمائدین شریک ہوئے۔ پرسی پولس کے ویرانے میں نئے ہوائی اڈے بنائے گئے تھے، ہوٹل تعمیر ہوئے تھے، ہزاروں جدید طرز کے ائر کنڈیشنڈ خیمے نصب کیے گئے تھے اور ان کو بڑی نفاست سے سجایا گیا تھا۔ مہمانوں کے لیے ہر روز تازہ کھانا پیرس کے سب سے بڑے ریستوران میکسم سے پک کر آتا

تھا۔ ۱۹۷۶ء میں شاہ نے ایران کا روایتی کیلنڈر بھی بدل دیا اور اپنی حکومت کے ۳۵ ویں سال کی رعایت سے نیا کیلنڈر رائج کیا جو کوروش اعظم کی تاجپوشی کا ۲۵۳۵ واں سال بنتا تھا۔ اس کیلنڈر کے مطابق ۱۳۵۵ شمسی ہجری ۲۵۳۵ شمسی قرار پایا۔ یاد رہے کہ شاہ کے والد نے ہجری قمری کیلنڈر کی جگہ شمسی ہجری کیلنڈر رائج کیا تھا۔

شاہ کی یہ مسخرگیاں ایک سوچے سمجھے منصوبے کا جز تھیں۔ اس منصوبے کے خدوخال اس وقت نمایاں ہوئے جب شاہ نے مشرقِ وسطیٰ کے خود مختار ملکوں کے داخلی امور میں مداخلت شروع کی۔ اس علاقے پر جو عدن سے کویت کے ساحل تک پھیلا ہوا تھا، برطانیہ نے اپنے مشرقی مقبوضات (ہندوستان، لنکا، برما، ملایا اور آسٹریلیا) کے تحفظ کے غرض سے انیسویں صدی میں قبضہ کر لیا تھا اور جگہ جگہ پر فوجی چھاؤنیاں قائم کر دی تھیں۔ مقامی شیوخ کو وظیفہ ملتا تھا اور ان کی حیثیت ہمارے ملک کے والیانِ ریاست سے بھی کم تھی۔ مگر مقبوضات کے آزاد ہونے کے بعد برطانیہ اس علاقے سے بھی ایک ایک کر کے دست بردار ہوتا گیا۔ ۱۹۶۱ء میں کویت آزاد ہوا۔ ۱۹۶۲ء میں شمالی یمن، ۱۹۶۷ء میں جنوبی یمن اور ۱۹۷۱ء میں بحرین، قطر، متحدہ عرب امارات کے علاقے اور عمان۔ عمان سے کویت تک کا علاقہ خلیج فارس کے جنوبی ساحل پر واقع ہے اور بعض مقامات پر تو ایرانی ساحل سے اس کا فاصلہ فقط چند میل ہے مثلاً خلیج ہرمز میں۔ بحرین کی کل آبادی دو لاکھ ہے جس میں سے آدھے ایرانی نژاد ہیں۔ کویت کی آبادی آٹھ لاکھ ہے۔ متحدہ عرب امارات (ابوظہبی، دبئی، شارجہ، اجمان، راس الخیمہ، فجیرہ اور اُم القیوین) کی آبادی نو لاکھ ہے مگر مقامی عرب تین لاکھ سے بھی کم ہیں اور عمان کی آبادی آٹھ لاکھ ہے، گویا اس علاقے کی کل آبادی فقط ۲۸ لاکھ ہے۔ البتہ تیل کی دریافت کے بعد بیشتر عرب امارتوں کی آبادی میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے اور اُن کی بین الاقوامی اہمیت بھی بہت بڑھ گئی ہے۔

اس علاقے میں تیل کا سارا کاروبار امریکی اور برطانوی کمپنیوں کے قبضے میں ہے۔ شیخوں کو جو رائلٹی ملتی ہے وہ بھی اتنی زیادہ ہے کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس رقم کو کیسے خرچ کریں۔ اس کا عبرتناک منظر دیکھنا ہو تو لندن اور پیرس کے بازاروں کی سیر کیجیے۔ البتہ خلیج کی کسی ریاست میں وہاں کے باشندوں کو جمہوری حقوق بالکل حاصل نہیں ہیں بلکہ ریاستیں شیوخ

کی ذاتی ملکیت سمجھی جاتی ہیں اور رعایا کا کام شیخ کے احکام کی اطاعت کرنا ہے۔ البتہ جمال عبدالناصر کے عہد میں عرب وطنیت کے جذبے نے جب فروغ پایا اور فلسطین کی آزادی کی جدوجہد نے شدت اختیار کی تو بیداری کی لہریں خلیج فارس کے عرب ساحل سے بھی ٹکرانے لگیں۔ جمال عبدالناصر اور فلسطینی مجاہدین سے شاہ کی خفگی کا بنیادی سبب یہ تھا کہ وہ لوگ عرب وطنیت کی تحریک کو سامراج دشمن اور جمہوری مورچہ بنانا چاہتے تھے اور شاہ کو ان دونوں مقاصد سے شدید اختلاف تھا کیونکہ سامراج دشمنی سے امریکہ کے مفادات پر ضرب لگتی تھی اور جمہوریت کے فروغ سے ایران کے اندر جمہوری عناصر کو تقویت پہنچتی تھی۔ چنانچہ شمالی یمن میں جب امام محمد کے حامیوں اور ری پبلک کے حامیوں کے درمیان خانہ جنگی شروع ہوئی تو شاہ نے امام محمد کا ساتھ دیا اور سامانِ جنگ سے اُس کی پوری پوری مدد کی لیکن امام محمد کو شکست ہوئی۔ ۱۹۷۱ء میں شاہ نے برطانوی فوج کے ہٹتے ہی خلیج فارس کے تین جزیروں پر قبضہ کرلیا اور بحرین پر بھی ایران کے اقتدار کا حق جتانے لگا۔ ۱۹۷۳ء میں شاہ نے پاکستان کے داخلی امور میں بھی مداخلت شروع کردی۔ چنانچہ اب یہ حقیقت راز نہیں رہی کہ بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی کی حکومت شاہ کے اصرار پر توڑی گئی تھی اور بلوچستان میں فوجی کارروائی کے موقعے پر شاہ نے کم از کم تیس ہیلی کوپٹر جن میں توپیں لگی ہوئی تھیں، بلوچستان بھیجے تھے۔[۶] شاید اس کے عوض چمن سے زاہدان جانے والی ریلوے لائن ایران کے حوالے کردی گئی تھی۔

پاکستانی بلوچستان پر شاہ کی خاص نظرِ عنایت تھی۔ چنانچہ ۱۴ کروڑ پاک ایران ٹیکسٹائل ملز کو عطا ہوئے، چودہ کروڑ بلیلی اور اوتھل کی ٹیکسٹائل ملوں کو، ۱۴ کروڑ ڈالر دروازہ کے سیمنٹ کے کارخانے کو، ۵ کروڑ بولان میڈیکل کالج کو اور ڈھائی کروڑ خضدار انجینئرنگ کالج کو۔ بلوچستان کے مسائل سے شاہ کی دلچسپی کا سبب یہ تھا کہ بلوچستان کی سرحد کے اُس پار چھ لاکھ سے زائد بلوچ آباد ہیں اور شاہ پاکستانی بلوچستان کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا جبھی تو وہ بار بار یہ دھمکی دیتا تھا کہ اگر پاکستان میں کوئی گڑبڑ ہوئی تو ایران مداخلت سے باز نہیں آئے گا۔

شاہ کی نظریں عراق پر بھی تھیں۔ عراق عربوں کی فتوحات کے وقت تک ساسانی سلطنت

میں شامل تھا بلکہ ساسانیوں کا پایۂ تخت طیسفون، جو بغداد سے پندرہ میل دور ہے دریائے دجلہ کے کنارے واقع تھا۔ ساسانی عہد کی یادگار عمارت طاق کسریٰ اب بھی وہاں موجود ہے۔ اس کے علاوہ عراق میں شیعوں کی اکثریت ہے اور ان کی مقدس زیارت گاہیں کاظمین، نجف، کربلا اور سامرہ وہیں واقع ہیں۔ پھر کُرد ہیں جو تیس لاکھ کے قریب ایران کے سرحدی علاقوں میں اور اس سے بھی زیادہ سرحد پار عراق میں آباد ہیں۔ ایران اور عراق کے سرحدی تنازعوں میں ان کُردوں ہی کو قربانی کا بکرا بنایا جاتا رہا ہے۔ کبھی عراق کی حکومت ایرانی کُردوں کو ایرانی حکومت کے خلاف شہ دیتی ہے اور کبھی ایرانی حکومت عراقی کُردوں کو عراقی حکومت کے خلاف بھڑکاتی ہے۔

۱۹۷۳ء میں جب زوفر (عمان) میں سلطان قابوس کے خلاف عوامی جدو جہد شروع ہوئی تو شاہ نے سلطان کی حمایت میں باقاعدہ فوج روانہ کی، اور اسلحے اور ہوائی جہاز بھی بھیجے، یہ مسلح جدو جہد تین سال تک جاری رہی اور ایرانی فوج عمانیوں کے خلاف لڑتی رہی۔ البتہ انقلاب کے بعد ایرانی فوجوں کو وطن واپس بلالیا گیا۔

ان مہم جوئیوں سے شاہ کا فوری مقصد مشرقِ قریب یا خلیج کی امارتوں کو براہ راست ایرانی سلطنت میں شامل کرنا نہیں تھا کیونکہ آج کل کے زمانے میں کسی ملک پر زبردستی قبضہ کرنا بہت مشکل ہے بلکہ شاہ کی برابر یہی کوشش تھی کہ مشرقِ وسطیٰ کے کسی ملک میں جمہوری قوتیں ابھرنے نہ پائیں۔ دوسرے یہ کہ وہاں کے مطلق العنان فرماں رواؤں کو اپنا احسان مند بنا کر اس پورے خطے کو ایران کے زیر اثر لایا جائے۔ مختصر یہ کہ شاہ امپریل ازم کے زیر سایہ ایک 'ذیلی امپیریل ازم' کا کردار ادا کرنے کا خواہشمند تھا۔ اس مقصد کے تحت شاہ نے نومبر ۱۹۷۶ء میں خلیج کی امارتوں کو ایک 'سیکورٹی پیکٹ' کا لالچ بھی دیا تھا۔ مگر بات نہیں بنی کیونکہ امریکیوں کو شاہ کی بڑھتی ہوئی ہوسِ اقتدار اب گراں گزرنے لگی تھی۔ چنانچہ جنرل جارج براؤن نے جو امریکہ کے جوائنٹ چیف آف اسٹاف کا چیئرمین تھا علانیہ کہا تھا کہ 'شاہ کے فوجی منصوبوں سے یہی خیال گزرتا ہے کہ کہیں وہ پرانی ایرانی سلطنت کو دوبارہ زندہ کرنے کی تو نہیں سوچ رہے ہیں۔'

امریکی حکومت شاہ اور اس کی فوج کو سوویت یونین کے خلاف استعمال کرنے کے لیے تو بخوشی تیار تھی لیکن وہ شاہ کے توسیعی عزائم کے بالکل حق میں نہ تھی۔

پہلوی ریاست کا کردار

رضا شاہ پہلوی کی ریاست بورژوا ریاست تھی جس کا بنیادی فریضہ سرمایہ داری نظام بالخصوص 'شرکتی' سرمایہ دار طبقے کے مفاد کی حفاظت کرنا تھا۔ شرکتی سرمایہ داروں سے مراد وہ سرمایہ دار ہیں جو امریکہ، برطانیہ اور مغربی جرمنی کی بین الاقوامی کارپوریشنوں کے جونیئر پارٹنر کی حیثیت سے کاروبار کرتے تھے۔ خود رضا شاہ اور اس کے اہلِ خاندان سب سے بڑے شرکتی سرمایہ دار تھے حالانکہ پرانے زمانے کے بادشاہ اور شہزادے کاروبار کرنے کی سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ وہ دولت اپنے شاہانہ مصارف کے لیے جمع کرتے تھے اور اگر کوئی ان سے کہتا کہ چاندی سونے کے ذخیروں کو کاروبار میں لگا کر نفع کمایئے تو شاید وہ اُس کی کھال کھنچوا لیتے۔ اس کے برعکس رضا شاہ کی زراندوزی کی نوعیت خالص کاروباری تھی۔ وہ سرمائے سے مزید سرمایہ پیدا کرنے کی دھن میں لگا رہتا تھا اور جائز وناجائز کی تمیز بھی نہیں کرتا تھا۔ یہی شیوہ شرکتی سرمایہ داروں، سرکاری افسروں اور وزیروں کا تھا۔

ہر چند کہ شاہ اپنے شرکتی سرمایہ داروں کی حوصلہ افزائی کرتا تھا اور ان کو ہر قسم کی مراعات بھی حاصل تھیں مگر شاہ اُن کے کسی گروہ یا فرد کو امورِ ریاست میں اپنا شریک کار بنانے کا ہرگز روادار نہ تھا۔ ریاست وہ خود تھا اور بورژوا طبقے کا نمائندہ اور محافظ ہونے کے باوصف وہ ریاست کو بورژوا طبقے کی مداخلت سے بالا اور الگ رکھنے کے حق میں تھا (یہ رجحان ایشیا اور افریقہ کے ترقی پذیر ملکوں کے ڈکٹیٹروں میں بہت عام ہے)۔ کارل مارکس اس رجحان کو 'بونا پارٹ ازم' سے تعبیر کرتا ہے۔ بونا پارٹ سے مطلب لوئی بونا پارٹ ہے۔ وہ نپولین کا بھتیجا تھا۔ نپولین کی معزولی کے بعد برسوں جلاوطن رہا۔ ۱۸۴۸ء میں فرانسیسی ری پبلک کا صدر منتخب ہوا۔ اُس نے ۲ ستمبر ۱۸۵۱ء کو اسمبلی توڑ دی اور ۱۸۵۲ء میں 'شہنشاہ نپولین سوئم' کے لقب سے فرانس کا بادشاہ بن گیا۔ ۱۸۸۰ء میں مغربی جرمنی اور فرانس کی جنگ میں شکست کھائی اور قید ہوا۔ فرانسیسی انقلاب کے بعد جلاوطن کر دیا گیا۔ ۱۸۸۳ء میں انگلستان میں وفات پائی۔

بونا پارٹ ازم وہ ریاستی نظام ہے جس میں ریاست اپنے طبقاتی کردار کے باوجود

نقم ونسق کی حد تک اتنی خود مختار اور مطلق العنان ہوجاتی ہے کہ وہ اُس طبقے کی بھی مداخلت برداشت نہیں کرسکتی جس کے مفاد کی وہ ضامن ہے اور نمائندہ ہوتی ہے۔ چنانچہ جرمنی کے مرد آہن بسمارک (۱۸۱۵ء...... ۱۸۹۸ء) کی طرز حکومت کا ذکر کرتے ہوئے (جو سلطنت جرمنی کا پہلا چانسلر تھا) فریڈرک اینگلز ایک خط میں مارکس کو مانچسٹر سے ۱۳/اپریل ۱۸۶۶ء کو لکھتا ہے کہ:

'بونا پارٹی نیم آمریت سرمایہ داروں کے مفاد کی علمبردار ہوتی ہے لیکن سرمایہ داروں کو حکومت کے اختیارات میں شرکت کی اجازت نہیں دیتی'۔[۷]

بونا پارٹ ازم کی خصوصیات پہلوی ریاست سے اتنی ملتی جلتی ہیں کہ ان خصوصیات کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا۔ بونا پارٹ ازم کی خصوصیات سے بحث کرتے ہوئے مارکس لکھتا ہے کہ:

'انتظامیہ لامتناہی اختیارات کی حامل ہوجاتی ہے اور ریاستی مشینری پوری معاشرے سے بلند وبالا ہوکر اپنی طاقت کو مضبوط سے مضبوط تر بناتی جاتی ہے۔

بونا پارٹ کے عہد میں یہی ہوا۔ ریاست نے خود کو مکمل طور آزاد کرلیا۔ اس کے باوجود ریاست کے اختیارات ہوا میں معلق نہیں ہوتے چنانچہ بونا پارٹ بھی ایک طبقے کی نمائندگی کرتا تھا'۔[۸]

بونا پارٹ ازم کی دوسری خصوصیت 'فوج کا غلبہ' ہے جس کی اکثریت افلاس زدہ دہقانوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ 'وہ فوج میں بھرتی ہوکر سورما بن جاتے ہیں۔ اپنی نئی املاک کو بچانے کی خاطر وہ بیرونی دنیا کے خلاف سپر ہوجاتے ہیں اور اس نوزائیدہ وطنیت کو خوب خوب بانس پر چڑھاتے ہیں۔ ان کی وردی ان کا درباری لباس بن جاتی ہے۔ جنگ ان کی شاعری ہوتی ہے اور حب الوطنی اُن کی ذاتی ملکیت کے احساس کا ذہنی پرتو۔ فوجی زندگی کسانوں کا وہ پھول ہے جو جوہڑ میں اگتا ہے'۔ مارکس کو کیا خبر تھی کہ ایک دن وہ آئے گا جب مشرق کے ترقی پذیر ملکوں میں فوج خود سیاسی اقتدار پر قابض ہوجایا کرے گی، اپنے ہی ملک کے نہتے عوام پر گولیاں اور کوڑے برسائے گی اور ان کی جمہوری تحریکوں کو بیدردی سے پامال کرے گی۔

بونا پارٹ ازم کی تیسری خصوصیت افسر شاہی کا وسیع عمل دخل ہے جو بقول مارکس 'جونک کی مانند معاشرے کا خون چوس لیتی ہے' مگر یہ دونوں ادارے فوج اور انتظامیہ اپنی تمام طاقت

کے باوصف ایک شخصِ واحد کے تابع ہوتے ہیں اور وہ ان سے جو چاہتا ہے کام لیتا ہے۔ رضا شاہ کے عہد میں ایرانی ریاست کی یہی حالت تھی۔

البتہ لوئی بونا پارٹ اور رضا شاہ میں فرق یہ ہے کہ بونا پارٹ کو معاشرے میں کم از کم مالک کسانوں کے قدامت پسند طبقے کی حمایت ضرور حاصل تھی جب کہ شاہ ایرانی معاشرے کے سبھی طبقوں اور گروہوں کا اعتماد کھو چکا تھا۔ اگر اس کا کوئی حامی تھا تو وہ شرکتی سرمایہ دار تھے لیکن یہ وہ لوگ تھے جو شاہ کا ساتھ دینا تو درکنار، اس سے پہلے ملک سے فرار ہو گئے۔ شاہ کی ہوسِ اقتدار اور ہوسِ دولت چکی کے دو پاٹ تھے جس کے درمیان سارا ملک پس رہا تھا۔ جس نسبت سے شاہ کی ریاست معاشرے سے آزاد اور بلند و بالا ہوتی گئی اسی نسبت سے معاشرہ بھی شاہ کی ریاست سے دور بلکہ اس کا دشمن ہوتا گیا۔

حوالہ جات

1- Gunnar Myrdal, *Asian Drama,* Vol.II (London, 1968), p. 946.

2- See T. Jalil, *Workers Say No to the Shah: Labour Law and Strikes in Iran* (London: Committee for the Restoration of Trade Union Rights in Iran, 1977).

3- *Tehran Economist,* 29 January 1977.

4- E.A. Bayns, *Persian Kinship in Transition* (New York, 1968) p.212.

5- *Guardian* (London), 10 October 1975.

6-Fred Halliday, *Iran: Dictatorship and Development* (London, 1979), p.272.

۷۔ مارکس اینگلز کے منتخب مکتوبات، بہ زبانِ انگریزی (ماسکو) ص ۲۱۴۔

8- Karl Marx, *Selected Works,* Vol..I (Moscow, 1969), p.478.

پانچواں باب

امریکی عمل دخل

پہلوی ریاست فوجی سازش (کودیتا coup d'etat) کے ذریعے وجود میں آئی تھی اور فوجی طاقت ہی کے بل بوتے پر نصف صدی تک ایرانیوں پر مسلط رہی مگر جس وقت رضا خاں سپہ دار برسرِ اقتدار آیا تھا تو ایرانی سپاہ کی تعداد بمشکل آٹھ ہزار تھی اور اگر انگریزوں نے مدد نہ کی ہوتی تو رضا خاں کے لیے اتنی قلیل فوج کے ذریعے پورے ملک کو اپنا مطیع بنانا ممکن نہ ہوتا۔ لہٰذا رضا خاں نے سب سے پہلے فوج کی تنظیم پر توجہ دی۔ چار سال کے اندر ایرانی فوج کی تعداد چالیس ہزار ہوگئی اور قومی بجٹ کا ۴۰ فیصد فوج پر خرچ ہونے لگا۔ ۱۹۲۶ء میں فوجی تربیت لازمی قرار دے دی گئی اور جبری بھرتی کا قانون نافذ ہوگیا۔ ۱۹۴۱ء میں جس وقت رضا خاں سپہ دار تخت سے دستبردار ہوا تو ایرانی فوج کی تعداد سوا لاکھ تھی۔

رضا خاں سپہ دار کمال اتاترک کی شخصیت سے بہت متاثر تھا اور وہ ایران کو بھی ترکی کی مانند ایک 'ماڈرن' ملک بنانا چاہتا تھا لیکن کمال اتاترک قومی ہیرو تھا، ترک اس سے والہانہ محبت کرتے تھے اور اتاترک نے جو اصلاحات ملک میں نافذ کیں، لوگوں نے ان کو بخوشی قبول کرلیا تھا۔ اس کے برعکس ایرانی قوم رضا خاں کو غاصب خیال کرتی تھی لہٰذا رضا خاں نے جدید

طرز کی جو اصلاحات نافذ کیں، وہ عوام کے تعاون اور جمہوری طریقوں سے نہیں بلکہ استبدادی قوت کے ذریعے۔ اس نے ملکی قوانین کو مغربی سانچے میں ڈھالا، نظم ونسق میں مغربی طرز کی تبدیلیاں کیں، مغربی طریقۂ تعلیم نافذ کیا، ریاستی امور میں مولویوں کی مداخلت روک دی، پردے کا رواج ختم کر دیا، عورتوں کو مردوں کے مساوی حقوق دیئے اور لوگوں کو مغربی رہن سہن اور مغربی لباس اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ مگر مغربی تہذیب کوٹ پتلون پہننے، کانٹا چھری استعمال کرنے یا نائٹ کلب میں ناچنے کا نام نہیں ہے بلکہ مغربی تہذیب وتمدن کی اصل اساس صنعتی انقلاب ہے، یعنی فیوڈل ازم کے پیداواری طریقوں اور سماجی رشتوں کی تنسیخ اور مشینی صنعتوں اور سرمایہ داری رشتوں کی ترویج۔ مغربی تہذیب عبارت ہے جمہوری طرزِ حکومت اور عوام کے شہری حقوق سے، مغربی تہذیب عبارت ہے سائنسی علوم وفنون اور ٹیکنالوجی کے فروغ سے، مغربی تہذیب عبارت ہے سائنسی اندازِ فکر وعمل سے اور اگر ان لوازمات کو معاشرے سے خارج کر دیا جائے تو پھر مغربی تہذیب خالی خولی شعبدہ بازی رہ جاتی ہے۔ رضا خاں فوجی ڈکٹیٹر تھا۔ اس میں بورژوا انقلاب لانے کی نہ صلاحیت تھی اور نہ اس قسم کا انقلاب اس کے حق میں مفید تھا لہٰذا اس نے مغربی تہذیب کے ظواہر کو تو اپنا لیا لیکن اس کے باطن کو نظر انداز کر دیا۔

رضا خاں سپہ دار کا دوسرا ہیرو تھا، ہٹلر۔ جو رضا خاں کی طرح آریاؤں کی نسلی برتری کا علم بردار اور جمہوریت کا جانی دشمن تھا۔ ہٹلر نے ایرانیوں کی روایتی انگریز دشمنی اور نسلی منافرت کے جذبے سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور رضا خاں سپہ دار نے بھی ہٹلر کے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ ہٹلر نے ایرانیوں کو خالص آریائی ہونے کی سند عطا کی اور ان کو 'نیورمبرگ' کے نسلی قانون سے مستثنیٰ کر دیا (اس قانون کے تحت کوئی جرمن عورت کسی غیر جرمن سے شادی نہیں کر سکتی تھی)۔ ۱۹۳۴ء میں دو المانوی ادارے آپس میں تہذیبی تعلقات کو فروغ دینے کے لیے قائم کیے گئے اور ایران کے بازار نازی لٹریچر اور جرمن مصنوعات سے بھر گئے۔ ۱۹۳۶ء میں ہٹلر کا وزیر مالیات ڈاکٹر شاخت تہران آیا اور رضا خاں سپہ دار سے ملا۔ اس کے بعد ایران میں نازی ایجنٹوں کی سرگرمیاں اور تیز ہو گئیں اور جرمن 'مشیروں' کی تعداد بھی بہت بڑھ گئی۔ جب دوسری جنگ عظیم چھڑی تو اس وقت ہٹلر کے ہوا خواہ ایران کی سبھی کلیدی اسامیوں پر قابض تھے مگر ستمبر ۱۹۴۱ء

میں اتحادیوں نے نازی خطرے کے پیش نظر اپنی فوجیں ایران میں اتار دیں۔ رضا خاں سپہ دار نے تخت سے دستبردار ہو کر جنوبی افریقہ میں پناہ لی اور ۱۹۴۴ء میں وہیں اس کا انتقال ہوا۔ اس کا بیٹا رضا شاہ 'آریہ مہر' ستمبر ۱۹۴۱ء میں تخت پر بیٹھا اور تب ایران میں امریکیوں کا عمل دخل شروع ہوا۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے امریکی سرمایہ داروں کی مخصوص شکارگاہ جنوبی امریکہ تھا اور مشرق قریب کو برطانیہ کی اجارہ داری خیال کیا جاتا تھا۔ مصر، فلسطین، اردن، یمن، عراق اور خلیج فارس کی ریاستیں سب برطانیہ کے زیرنگیں تھیں۔ ایران کے تیل کے چشمے انگریز کمپنیوں کے تصرف میں تھے حتیٰ کہ سعودی عرب کو بھی جو، اب دُنیا کے سب سے دولت مند ملکوں میں شمار ہوتا ہے، برطانیہ کی طرف سے سالانہ وظیفہ ملتا تھا لیکن دوسری جنگ عظیم کے دوران میں ایک طرف برطانیہ کی اقتصادی اور سیاسی قوت روز بروز گھٹتی گئی۔ دوسری طرف امریکہ کی صنعتی پیداوار بالخصوص اسلحوں کی پیداوار میں حیرت انگیز اضافہ ہوا اور تیل کی مانگ بھی بہت بڑھ گئی۔ لہٰذا نئے علاقوں کو زیرِ اثر لانا 'ضروری' ہو گیا۔

امریکہ کی عالمگیر سامراجی حکمتِ عملی میں مشرق وسطیٰ کو اور مشرق وسطیٰ میں ایران کو جو اہمیت حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ایران کی جائے وقوع، سوویت دشمن سرگرمیوں کے لیے نہایت موزوں ہے کیونکہ ایران کی ڈیڑھ ہزار میل لمبی شمالی سرحد سوویت یونین سے ملتی ہے۔ اس کے علاوہ مشرق وسطیٰ میں سعودی عرب کے بعد تیل سب سے زیادہ ایران کے پاس ہے البتہ ایران کو آبادی کے اعتبار سے سعودی عرب سمیت مشرق وسطیٰ کے سب ملکوں پر فوقیت حاصل ہے (سعودی عرب کی کل آبادی اسی لاکھ سے بھی کم ہے جبکہ ایران کی آبادی ۳،۵ کروڑ ہے)۔ لہٰذا ترکی سے قطع نظر ایران مشرق وسطیٰ کا واحد ملک ہے جو امریکہ کی فوجی ضرورتیں پوری کر سکتا ہے۔ چنانچہ امریکہ نے انہیں تین سامراجی مقاصد — ایرانی فوج کی تنظیم اور توسیع، ایرانی تیل کا استحصال اور ایران کی سرزمین کو سوویت دشمن سرگرمیوں کا مرکز بنانا — کے تحت ۱۹۴۲ء میں ایران پر غلبہ حاصل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ رضا شاہ پہلوی کے دورِ حکومت کی نمایاں خصوصیت یہی ہے کہ شاہ کی تمام شیخیوں کے باوصف پہلوی ریاست ہمیشہ امریکہ کے تابع فرمان رہی اور شاہ نے اچھے برے جو قدم بھی اٹھائے اس میں امریکہ کی مرضی شامل تھی۔

امریکی حکومت ایران کی طرف ۱۹۴۲ء میں متوجہ ہوئی۔ یہ زمانہ دوسری جنگ عظیم کا تھا لہٰذا امریکہ نے خلیج فارس کی باقاعدہ ایک کمان بنائی اور تیس ہزار امریکی سپاہی ایران لائے گئے۔ انہوں نے ایرانی بندرگاہوں کی مرمت کی، ہوائی اڈے بنائے، سڑکیں تعمیر کیں اور خلیج فارس کے ساحل سے تہران تک ریلوے لائن بچھائی۔ یہ نقطہ قابلِ غور ہے کہ امریکی سپاہ کی بیشتر سرگرمیاں خلیج فارس کے ساحلی علاقوں تک جہاں تیل کے چشمے ہیں، مرکوز رہیں۔ اسی سال جنرل رڈلے کی سربراہی میں ایک فوجی مشن تہران آیا اور ایرانی فوج سے بطور مشیر وابستہ ہوگیا۔ ایک دوسرے وفد نے جس کا اصطلاحی نام گن مش (genmish) تھا، ایران کی فوجی پولیس 'ایمنہ' کی تربیت شروع کی۔ گن مش کا سربراہ امریکہ کی خفیہ پولیس کا ایک اعلیٰ افسر نارمن شوارکاف تھا۔ گن مش نے ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۷ء میں آذربائیجان اور کردستان کی صوبائی خودمختاری کی تحریکوں کو کچلنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔[۱]

اسی کے ساتھ ایران کی مالیاتی 'اصلاح' کے لیے مسٹر ملز پاغ نامی ایک ماہرِ اقتصادیات کو ایران کا 'خزانچی اعلیٰ' مقرر کیا گیا اور مزید نوے امریکی 'ماہرین' ایران کی زراعت اور ٹرانسپورٹ کی 'اصلاح' پر متعین ہوئے۔

۱۹۴۷ء میں جب امریکہ کی طرف سے سوویت یونین کے خلاف 'سرد جنگ' کا آغاز ہوا تو ایران میں مقیم فوجی مشن کا درجہ مشاورت سے بڑھا کر فعالی (operational) کردیا گیا اور اس کا اصطلاحی نام 'آرمیش' رکھا گیا۔ تب ایرانی فوج کو امریکی ہتھیاروں سے مسلح کرنے کی غرض سے سامان جنگ امریکہ سے درآمد ہونے لگا۔ ابتدا میں فقط ایک کروڑ ڈالر کا سامانِ جنگ فراہم کیا گیا مگر ۱۹۴۸ء میں یہ رقم بڑھا کر چھ کروڑ ڈالر کردی گئی۔ دو سال بعد ۱۹۵۰ء میں 'فوجی امدادِ باہمی' کا معاہدہ ہوا۔ امریکہ کی فوجی تیاریاں ہرچند کہ سوویت یونین کے مبینہ حملے کی روک تھام کے لیے تھیں لیکن ایرانی حکومت جانتی تھی کہ سوویت یونین کے حملے کا خوف بے بنیاد ہے البتہ وہ امریکہ کی فوجی مدد سے ملک کی جمہوری تحریکوں کو کچلنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتی تھی۔ چنانچہ سینیٹر ہیوبرٹ ہمفری نے ایک تقریر میں اس حقیقت کا انکشاف کرتے ہوئے کہا:

'جانتے ہو ایرانی فوج کے سربراہ نے ہمارے ایک آدمی سے کیا کہا تھا؟

اس نے کہا تھا کہ امریکی امداد کے طفیل ہماری فوج چاق وچوبند ہے اور اب وہ
ملک کی سویلین آبادی سے نمٹنے کی پوری پوری اہل ہے۔[۲۳]

اور ایران پر کیا منحصر ہے امریکہ کی فوجی امداد ایشیا اور افریقہ میں ہر جگہ عوامی تحریکوں کو کچلنے ہی کے کام آئی ہے۔ ایران کو ۱۹۴۶ء اور ۱۹۷۰ء کے درمیان ایک ارب ۳۷ کروڑ ڈالر کی جو فوجی امداد ملی اس کا نشانہ ایرانی بنے یا خلیج فارس کے باشندے۔

اسی اثنا میں تیل کے معاہدے کی تجدید کا سوال اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ معاہدہ رضا خان سپہ دار نے ۱۹۳۳ء میں ۲۵ سال کے لیے اینگلو ایرانی آئل کمپنی سے کیا تھا۔ یہ معاہدہ ۲۵ سال کے لیے اس وقت کیا گیا تھا جب ایران کو تیل سے فقط ۱۷ لاکھ پونڈ سالانہ کی آمدنی ہوتی تھی۔ چوتھائی صدی کے دوران تیل کی پیداوار میں اتنا اضافہ ہوا کہ رائلٹی کی رقم ۱۹۴۸ء میں ڈیڑھ کروڑ پونڈ ہوگئی۔ مگر یہ رقم کل آمدنی کی تہائی سے بھی کم تھی گویا دو تہائی آمدنی برطانوی کمپنی ہضم کر جاتی تھی۔ ایرانی وطن پرستوں کو یہ صورتحال قابلِ قبول نہ تھی۔ چنانچہ اس معاہدے کی تجدید کی مخالفت شروع ہوگئی۔ ڈاکٹر مصدق نے جبہ ملی (نیشنل فرنٹ) کے نام سے ایک سیاسی جماعت کی بنیاد رکھی۔ ڈاکٹر مصدق پرانے سیاستداں تھے اور ملک میں ان کی بڑی عزت تھی۔ وہ مجلس شورائی ملی کے ان چار ممبروں میں سے تھے جنہوں نے ۱۹۲۴ء میں رضا خاں کو بادشاہ بنانے کی تجویز کے خلاف ووٹ دیا تھا اور ری پبلک کی تجویز پیش کی تھی۔ جبہ ملی کا پہلے دن سے یہ مطالبہ تھا کہ تیل کی صنعت کو قومی ملکیت بنا دیا جائے اور اس کی آمدنی ایک ملک گیر ترقیاتی منصوبے پر خرچ کی جائے، مگر وزیر اعظم جنرل رزم آرا معاہدے کی تجدید کے حق میں تھا۔ چنانچہ جولائی ۱۹۴۹ء میں برطانوی کمپنی اور ایرانی حکومت کے درمیان ایک نیا معاہدہ طے پایا جس کی رو سے رائلٹی کی شرح پچاس فیصد مقرر ہوئی۔ اس معاہدے کو جنرل رزم آرا نے مجلس میں توثیق کے لیے پیش کیا مگر ڈاکٹر مصدق کے اصرار پر مجلس نے معاہدے کی توثیق سے انکار کردیا۔ برطانوی کمپنی نے دباؤ ڈالنے کے لیے رائلٹی کی واجب الادا رقموں کی ادائیگی بھی روک دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملک بھر میں جنرل رزم آرا کو برطرف کر کے ڈاکٹر مصدق کو وزیر اعظم مقرر کرنے کا مطالبہ ہونے لگا۔ اس دوران میں کسی نے ۷ مارچ ۱۹۵۱ء کو رزم آرا کو گولی مار کر

ہلاک کر دیا، تو شاہ نے مجبور ہو کر ۳۰ اپریل کو ڈاکٹر مصدق کو وزیر اعظم مقرر کیا۔ ڈاکٹر مصدق نے مجلس شورائی ملی کے فیصلے کے مطابق تیل کی صنعت کو قومی ملکیت قرار دے دیا اور شاہ کو بھی اس قانون پر دستخط کرنے پڑے۔ اینگلو ایرانی آئل کمپنی نے اس اقدام کے جواب میں اکتوبر ۱۹۵۱ء میں تیل کے چشموں اور آبادان کی آئل ریفائنری کو بند کر دیا اور انگریز ملازمین کو وطن واپس بھیج دیا۔ ایران دشمن طاقتوں نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ یورپی اور امریکی کمپنیوں کے تیل بردار جہازوں نے انتقاماً ایرانی تیل اٹھانے سے بھی انکار کر دیا۔ سوویت یونین نے صنعت کو بحال کرنے کی غرض سے روسی ماہرین کی خدمات پیش کیں اور جمع شدہ تیل خریدنے کا وعدہ بھی کیا لیکن ڈاکٹر مصدق نے یہ دونوں تجویزیں رد کر دیں۔ ڈاکٹر مصدق کی اس منفی پالیسی کی وجہ سے ایران شدید اقتصادی بحران میں مبتلا ہو گیا۔ وہ سخت جذباتی انسان تھے لیکن ان کو یہ تو ضرور علم ہوگا کہ اینگلو ایرانی آئل کمپنی کا ایرانی عملہ تیل کے کارخانوں کو چلانے کی اہلیت نہیں رکھتا ہے۔ ایسی صورت میں اُن کو تیل کو قومی ملکیت بناتے وقت یہ سوچنا چاہیے تھا کہ اگر انگریزوں نے تعاون نہ کیا تو یہ کارخانے کیسے چلیں گے۔ انہوں نے تیل کی صنعت کو قومی تحویل میں لے لیا مگر آخر وقت تک تمنا کا دوسرا قدم اٹھاتے ہچکچاتے رہے۔ اور اُن کا یہی تذبذب ایران کے حق میں مہلک ثابت ہوا۔ وہ بیماری کا بہانہ کر کے بستر پر لیٹ گئے اور حالات پر قابو پانے کی تدبیریں اختیار کرنے کے بجائے حالات کو اپنے اوپر قابو پانے کا موقع دے دیا۔ اُن کی اس بے عملی نے لوگوں کے حوصلے پست کر دیے اور تب امریکہ نے شب خوں مارا۔

سی۔آئی۔اے۔کی سرگرمیاں

اخباروں میں یہ خبر تو بار بار شائع ہو چکی ہے کہ ڈاکٹر مصدق کو گرانے میں سی۔ آئی۔ اے۔ کا ہاتھ تھا لیکن اس سازش کا علانیہ اعتراف ابھی حال ہی میں خود اس شخص نے کیا ہے جو سی۔ آئی۔ اے۔ کی طرف سے اس کام پر مامور ہوا تھا۔ اس کا نام کرمٹ روز ویلٹ ہے اور وہ ۱۹۵۳ء میں مشرق قریب کے سی۔ آئی۔ اے دفتر کا ناظم اعلیٰ تھا۔ اس نے اخبار 'لاس اینجلز ٹائمز' کو امریکی سازش کی تفصیلات بتاتے ہوئے انکشاف کیا کہ جنرل آئزن ہاور صدرِ امریکہ نے ڈاکٹر

مصدق کو برطرف کرنے کا منصوبہ ۱۹۵۳ء میں چرچل کے مشورے سے بنایا تھا۔ اس منصوبے کا خفیہ نام 'اجیکس' (ajax) رکھا گیا تھا۔ اس کے تمام مصارف امریکہ نے برداشت کیے تھے اور منصوبے پر عمل درآمد کا فریضہ سی۔ آئی۔ اے کے سپرد ہوا تھا۔

'جب جنوری ۱۹۵۳ء میں جنرل آئزن ہاور صدر ہوئے تو وزیر خارجہ جان فاسٹر ڈلس کو یہ اندیشہ ہوا کہ مبادا ڈاکٹر مصدق سوویت یونین سے مل جائے۔ ڈلس کو نفرت اور دشمنی نے اتنا اندھا کر دیا تھا کہ اس نے اپنی وزارتِ خارجہ کی خفیہ رپورٹ کی بھی پروا نہ کی جس میں یہ انکشاف کیا گیا تھا کہ ڈاکٹر مصدق کمیونسٹوں کے سخت خلاف ہیں۔ البتہ ڈلس کو ایران میں مقیم امریکی سفیر لائے ہینڈرسن کی تائید حاصل تھی اور ہینڈرسن کا خیال تھا کہ مصدق ایران کو سوویت یونین کے حوالے کر دینا چاہتا ہے۔'

اس سوال کے جواب میں کہ مصدق کا تختہ الٹنے کا فریضہ شاہ پرست ایرانیوں کو کیوں نہ سونپا گیا؟ روز ویلٹ نے کہا کہ 'شاہ پرست ایرانیوں میں تنظیم کا سلیقہ نہیں تھا۔'

حالات کا جائزہ لینے کے لیے روز ویلٹ نے مارچ ۱۹۵۳ء میں ایران کا خفیہ دورہ کیا۔ جولائی میں وہ دوبارہ ایران آیا مگر اب کے بغداد کی راہ سے ایک دوست کی موٹر میں چھپ کر۔ اس دفعہ وہ تین ہفتے تہران میں رہا۔ اس کو خفیہ فنڈ سے دس لاکھ ڈالر (ایک کروڑ روپیہ) مصارف کے لیے دیئے گئے تھے مگر سڑکوں پر توڑ پھوڑ کرنے کے لیے بلوائیوں پر فقط ۷۵ ہزار ڈالر خرچ ہوئے۔ یہ رقم تین امریکی کمپنیوں اور پانچ ایرانی گروہوں میں تقسیم ہوئی۔ روز ویلٹ کے نام اور کام سے ایران میں فقط تین شخص واقف تھے ایک شاہ اور دو اور ایرانی جن کا نام روز ویلٹ نے نہیں بتایا۔ شاید وہ اب بھی ایران میں موجود ہیں۔

روز ویلٹ نے تہران میں سب سے پہلے شاہ کے حامی فوجی افسروں سے خفیہ طور پر رابطہ قائم کیا۔ فوج کی طرف سے مطمئن ہو کر اس نے شاہ سے کہا کہ ڈاکٹر مصدق کو برطرف کر کے جنرل فضل اللہ زاہدی کو وزیر اعظم مقرر کرے مگر مصدق نے استعفیٰ دینے سے انکار کر دیا۔ روز ویلٹ اس صورتحال سے نمٹنے کے لیے تیار تھا۔ اس نے بہت سے شاہ پرست فوجی

افسروں کو سی۔ آئی۔ اے کے احاطے میں جو امریکی سفارت خانے سے ملحق تھا یکجا کیا اور شاہ کو ۱۶ر اگست کو روم چلے جانے کا مشورہ دیا۔ لڑائی فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہوگئی تھی۔ شاہ کی روانگی کے تیسرے دن ایرانی غنڈوں کو جن میں ڈالر تقسیم کیے جا چکے تھے حکم دیا گیا کہ سڑکوں پر نکل آئیں اور شاہ کے حق میں مظاہرہ شروع کر دیں۔ اُسی وقت سی۔ آئی۔ اے کے احاطے میں چھپے ہوئے فوجی افسر بھی جنرل فضل اللہ زاہدی کی قیادت میں باہر آ گئے اور بلوائیوں میں شامل ہو گئے۔ تب فوج حرکت میں آئی۔ ڈاکٹر مصدق، ڈاکٹر فاطمی اور جبہ ملی کے دوسرے رہنما گرفتار کر لیے گئے جنرل زاہدی وزیر اعظم بنا اور شاہ کو تار دے کو واپس بلا لیا گیا۔

روز ویلٹ کہتا ہے کہ اُس منصوبے کے بارے میں مجھ کو صدر آئزن ہاور وزیر خارجہ جان فاسٹر ڈلس اور اس کے بھائی ایلن فاسٹر ڈلس نے جو سی۔ آئی۔ اے کا ڈائریکٹر تھا مفصل ہدایتیں دیں۔[۳۰]

روز ویلٹ کا بیان ہے کہ ایران میں امریکی سازش کی کامیابی سے وزیر خارجہ جان فاسٹر ڈلس کا حوصلہ اتنا بڑھا کہ وہ کانگو، گواتا مالا، انڈونیشیا اور مصر میں بھی اسی قسم کی پیش قدمیاں کرنے کی سوچنے لگا (وہ وقت شاید دور نہیں، جب سی۔ آئی۔ اے کا کوئی سابق افسر ہمیں بتائے کہ میں نے انڈونیشیا کے فوجی افسروں سے مل کر کس طرح ڈاکٹر سوکارنو کی حکومت کا تختہ الٹا تھا اور دس لاکھ انڈونیشیوں کو موت کے گھاٹ اتروایا تھا)۔

جنرل فضل اللہ زاہدی کے وزیر اعظم بنتے ہی امریکہ نے ایران کو ۴،۵ کروڑ ڈالر (پچاس کروڑ روپیہ) کی مالی امداد پیش کردی۔ ڈاکٹر مصدق پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلا، ان کو غداری کے الزام میں تین سال قیدِ تنہائی کی سزا دے دی گئی (دسمبر ۱۹۵۳ء)۔ جنوری ۱۹۵۴ء میں تیل کی آٹھ کمپنیوں کا ایک کنسورشیم بنایا گیا اور ستمبر ۱۹۵۴ء میں کنسورشیم اور ایران کے درمیان ایک معاہدے پر دستخط ہو گئے جس کی رو سے ایران کی رائلٹی پچاس فیصد مقرر ہوئی اور اینگلو ایرانی آئل کمپنی کو ڈھائی کروڑ پونڈ (پچاس کروڑ روپیہ) معاوضہ دیا گیا۔ امریکیوں کے لیے ۷۵ ہزار ڈالر خرچ کر کے ۷۵ ارب ڈالر کی جائیداد پر قبضہ برا سودا تو نہ تھا۔

رضا شاہ آریہ مہر کی تعلیم و تربیت یوں تو یورپ میں ہوئی تھی لیکن اس کے اصل استاد

امریکی تھے جنہوں نے اپنے ہونہار شاگرد کو زراندوزی کا فن اور محبان وطن کو اذیتیں دے کر ہلاک کرنے کے جدید طریقے سکھائے تھے۔ چنانچہ گیر ودار کی رسم کہن جو آٹھ دس برس سے متروک تھی دوبارہ بڑے پیمانے پر تازہ کی گئی۔ ڈاکٹر مصدق کے وزیر خارجہ ڈاکٹر فاطمی اور دوسرے کئی وزرا کو پھانسی دی گئی۔ جبہ ملی کے رہنماؤں نے بھاگ کر یورپ میں پناہ لی اور ایسی بھیانک آمریت کا آغاز ہوا جس کے آگے قاچاریوں کی مطلق العنانی کی کوئی حقیقت نہ تھی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب امریکہ میں جنرل آئزن ہاور (۱۹۵۲ء۔ ۱۹۶۰ء) صدر منتخب ہوئے تھے اور انہوں نے جان فاسٹر ڈلس کو اپنا وزیر خارجہ مقرر کیا تھا (۱۹۵۳ء۔ ۱۹۵۹ء) اور ڈلس نے اپنے بھائی کو سی۔ آئی۔ اے کا سربراہ بنایا تھا۔ جان فاسٹر ڈلس کیمونزم کا جانی دشمن ہونے کے علاوہ مشرقی ملکوں کی جمہوری تحریکوں کا سخت مخالف تھا۔ اس کا مقولہ تھا کہ جو ہمارا دوست نہیں وہ ہمارا دشمن ہے لہٰذا ہم مشرق میں کسی ایسی حکومت کو برداشت نہیں کریں گے جو ہماری رفیق اور معاون نہ ہو۔ اس کی جارحانہ خارجہ پالیسی میں غیر جانب داری کی کوئی گنجائش نہ تھی مگر اتفاق سے یہی زمانہ مشرق وسطیٰ میں بالخصوص ایران اور مصر میں عوامی جوش وخروش کا تھا۔ ایران میں جبہ ملی کی تحریک بڑھتی جارہی تھی اور مصر میں جنرل ناصر کی قیادت اپنا اثر دکھارہی تھی اور یوں محسوس ہوتا تھا گویا عرب وطنیت کے غلغلے سے عرب فرمانرواؤں کے تخت وتاج چند دنوں کے مہمان ہیں۔

یہ تھا وہ پس منظر جس میں امریکہ نے ایران میں پیش قدمی کی اور فوجی 'کودیتا' کے ذریعے شاہ کو دوبارہ تخت پر لا بٹھایا۔ ۱۹۵۵ء میں امریکہ کی سرپرستی میں ایران، ترکی، عراق، پاکستان اور برطانیہ کے درمیان ایک فوجی معاہدہ ہوا جس کو 'معاہدۂ بغداد' کہتے ہیں۔ ہمیں وہ دن یاد ہیں جب اخبار 'ٹائم' نے مشرق وسطیٰ کا ایک نقشہ شائع کیا تھا جس میں ترکی سے پاکستان تک کے علاقے کو ایک موٹی سی زنجیر سے باندھا گیا تھا۔ عراق نے تو غلامی کی اس زنجیر سے ۱۹۵۸ء میں پیچھا چھڑالیا تھا لیکن یہ زنجیر آخرکار ۱۹۷۹ء میں ایرانی انقلاب کے بعد اس وقت ٹوٹی جب ایران نے سینٹو سے علیحدگی اختیار کی۔

فوجی کودیتا کے بعد ایران کی تیل کی صنعت امریکیوں کے تصرف میں آ گئی اور

حزب اختلاف کو بھی کچل دیا گیا لیکن اس کی کیا ضمانت تھی کہ عوامی قوتیں دوبارہ سر نہ اٹھائیں گی۔سی۔آئی۔اے لاکھ مستعد سہی مگر تھا تو غیر ملکی ادارہ۔ وہ مقامی فوج اور خفیہ پولیس کی جگہ تو نہیں لے سکتا تھا۔لہٰذا فوجی امداد میں مزید اضافہ کیا گیا اور سی۔آئی۔اے کی نگرانی میں ایرانی خفیہ پولیس (ساواک) کی وسیع پیمانے پر تنظیم شروع ہوئی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ نے ایرانی معیشت کو مکمل طور پر اپنے زیر اثر لانے کا تہیہ کر لیا تھا۔ یہ مقصد پرائیویٹ امریکی کمپنیوں کی سرمایہ کاری کے ذریعے ہی حاصل ہو سکتا تھا جو خود بھی پسماندہ ملکوں میں سرمایہ لگا کر اپنے نفع کی شرح بڑھانا چاہتی تھی بشرطیکہ ان کے مفادات کے تحفظ کی پوری پوری ضمانت مل جائے۔ چنانچہ بیرونی سرمائے کے اطمینانِ قلب کے لیے ایرانی حکومت نے ۱۹۵۵ء میں ایک ادارہ 'مرکز برائے حوصلہ افزائی وتحفظ سرمایۂ خارجی' (HETA) قائم کیا۔

اس قانونی تحفظ کے بعد ایران میں امریکی بینکوں، بیمہ کمپنیوں، دواساز کارپوریشنوں، تعمیراتی کمپنیوں، انجینئرنگ فرموں، صنعتی مشاورتی کارپوریشنوں اور ربڑ اور تمباکو کی کمپنیوں کی شاخیں دھڑا دھڑ کھلنے لگیں۔ امریکی کمپنیوں کے غلبے کا اندازہ اس بات سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ 'ایرانی المینک ۱۹۷۶ء' نے ایران میں موجود امریکی کمپنیوں کی جو فہرست دی ہے وہ بڑی سائز کے ۵۷ صفحات پر محیط ہے۔اس فہرست میں تقریباً آٹھ سو امریکی کمپنیوں کے نام پتے اور ان کے کاروبار کی نوعیت تفصیل سے درج ہے۔ تہران میں امریکیوں کا اپنا الگ چیمبر آف کامرس (ایوانِ تجارت) بھی قائم تھا جس میں کسی غیر امریکی کمپنی کو شریک نہیں کیا جاتا تھا۔

لیکن سامراجی طاقتوں کے سہارے کاروبار کرنے والی کمپنیاں پسماندہ ملکوں میں بس واجبی واجبی سرمایہ لگاتی ہیں، وہ بھی ٹیکنیکل اسٹاف کی شکل میں۔ بیشتر سرمایہ وہ مقامی بینکوں سے حاصل کرتی ہیں اور اس طرح میاں کی جوتی اور میاں کا سر کے مصداق مقامی سرمائے ہی کو کام میں لا کر نفع کماتی ہیں۔ ایران میں بھی یہی ہوا چنانچہ المینک کے مطابق 'امریکی کمپنیوں نے بیس سال کے اندر (۱۹۵۵ء۔۱۹۷۵ء) فقط ۱۲ کروڑ ڈالر سرمایہ لگایا اور وہ بھی دوا اور ربڑ کے کارخانوں میں... اور انہوں نے اس سرمائے سے کئی گنا زیادہ نفع کمایا۔ ان کے نفع کی شرح

چالیس تا پچاس فیصد تھی مگر ان کے سرمائے کی مجموعی رقم اُس رقم سے جو ایرانی طلبا ہر سال امریکہ میں خرچ کرتے ہیں بقدر ساٹھ لاکھ ڈالر کم ہے۔

ان امریکی کمپنیوں کا دائرہ عمل رفتہ رفتہ وسیع ہوتا گیا۔ ۱۹۷۰ء میں موٹر سازی، فولاد اور اسلحہ سازی کے کارخانے بھی کھل گئے اور امریکیوں نے سرمایہ داری خطوط پر بڑے بڑے زرعی فارم بھی قائم کر لیے۔

۱۹۶۹ء میں جب تیل کی آمدنی بڑھنا شروع ہوئی اور شاہ نے اپنے چوتھے پانچ سالہ منصوبے کا آغاز کیا تو غیر ملکی کمپنیوں کی قسمت جاگ اٹھی۔

کسی امریکی کمپنی کو چاہ بہار کی فوجی بندرگاہ کا پانچ ارب ڈالر کا ٹھیکہ ملا۔ کوئی فوجی چھاؤنیوں، سرکاری عمارتوں، ہوائی اڈوں اور سڑکوں کی تعمیر پر مامور ہوا۔ کسی فرم کو برقی تنصیبات کا کام سپرد ہوا اور کسی کو مشینوں کی درآمد اور ورکشاپوں کی دیکھ بھال کا پروانہ دیا گیا۔ جنرل موٹرز، کرائزلر اور ہلمین والے موٹریں بنانے میں مصروف ہو گئے اور موٹروں کی امپورٹ دیوانگی کی حد تک بڑھ گئی بالخصوص بی۔ ایم۔ ڈبلیو کی جو معاشرتی مرتبے کی علامت تھی یہ موٹریں جنوبی افریقہ میں قائم جرمن فیکٹری سے امپورٹ کی جاتی تھیں۔

گزشتہ سات آٹھ سالوں میں غیر ملکی بالخصوص امریکی کمپنیوں نے شاہ کی حوصلہ افزائی کی بدولت ایران میں جو لوٹ مچائی اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ اخبار 'فائننشل ٹائمز' (لندن) کے نامہ نگار متعینہ تہران، اینڈریو ہٹلے نے ۴ جون ۱۹۷۹ء کی اشاعت میں ایک طویل مضمون 'ایران کی صنعتی بربادی' پر لکھا ہے۔ نامہ نگار نے اس مضمون میں غیر ملکی کمپنیوں کے مالی 'نقصانات' کا ماتم کیا ہے جو ان کو انقلاب کے بعد برداشت کرنے ہوں گے۔ اس کا کہنا ہے کہ غیر ملکی بالخصوص امریکی اور برطانوی فرموں کو فقط بڑے بڑے غیر فوجی منصوبوں میں کم از کم ۳۸ ارب ڈالر کا گھاٹا ہوگا۔ جہاں تک دفاعی منصوبوں کا تعلق ہے اینڈریو ہٹلے کے اندازے کے مطابق سب سے گہری چوٹ امریکی اور برطانوی کمپنیوں ہی کو لگے گی۔ ان کو کم سے کم ۷۶ ارب ڈالر کا گھاٹا ہوگا۔

البتہ اینڈریو ہٹلے یہ بتانا بھول گیا کہ ان منصوبوں میں جو بیشتر اب منسوخ ہو گئے ہیں

سارا سرمایہ ایران کا تھا نہ کہ غیر ملکی کمپنیوں کا جنھوں نے ایڈوانس لے کر اپنے مصارف پہلے ہی پورے کر لیے ہیں۔ وجیلے نے اُن ۲۵ بڑے بڑے منصوبوں کا ایک گوشوارہ بھی دیا ہے جن پر فی منصوبہ سات ارب تا پچاس کروڑ ڈالر لاگت آنے والی تھی اور ٹھیکہ پانے والی کمپنیوں کے نام اور اُن کے کام کی نوعیت بھی بیان کی ہے۔ واضح رہے کہ فہرست فقط غیر فوجی منصوبوں کی ہے۔ ان غیر فوجی منصوبوں کی مجموعی لاگت ۵۲ ارب ڈالر یعنی ۵۲۰ ارب روپیہ ہوتی ہے اور یہ ٹھیکے زیادہ تر امریکی، جرمن یا برطانوی کمپنیوں کو ملے تھے۔ ان منصوبوں میں فوجی تنصیبات شامل نہیں ہیں جن پر کم از کم دگنی لاگت آنے والی تھی۔

ایرانی زراعت کو امریکی ذرائع سے ترقی دینے کا منصوبہ بھی ۱۹۵۳ء کے فوجی 'کودیتا' کے بعد بنا۔ چنانچہ ٹینیسی ویلی اتھارٹی (T.V.A.) کے سابق ڈائریکٹر ڈیوڈ لی لین تھل جو اتفاق سے یہودی ہیں ایرانی زراعت کا جائزہ لینے تشریف لائے اور ان کی نگرانی میں صوبہ خزستان میں بڑے پیمانے پر زرعی ترقیات کا ایک منصوبہ تیار کیا گیا۔ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کاشتکاروں کو ڈھائی لاکھ ایکٹر اراضی سے بے دخل کیا گیا اور ۵۸ گاؤں کو خالی کروا کر ان پر بلڈوزر چلوا دیئے گئے اس کارِ خیر کے صدقے میں کم از کم تیس ہزار کسان بے گھر اور بے زمین ہو گئے۔ اس کے بعد بیدخل شدہ اراضی کو چھ کمپنیوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ سب سے بڑا حصّہ ریاست کیلی فورنیا کے ایک باشندے کو ملا (۲۵ ہزار ایکٹر)۔ اس میں اُس کا اپنا حصّہ ۵۱ فیصد تھا، اور تیس فیصد فرسٹ نیشنل سٹی بینک آف نیویارک کا بقیہ ۱۹ فیصد حصص ایرانیوں کو بخشے گے۔

'اسی قسم کے کئی اور منصوبوں پر جن میں امریکی اور ایرانی سرمایہ مشترکہ طور پر شامل تھا خزستان کے دوسرے حصّوں میں بھی عملی درآمد ہوا۔'[۵۴]

یہ ہے ایک جھلک اُس 'سفید انقلاب' کی جس کا ڈھنڈورا پیٹتے شاہ کے ہاتھ نہیں تھکتے تھے۔

جون ۱۹۶۳ء میں جب شاہ کے خلاف قم، تہران، مشہد، تبریز اور اصفہان وغیرہ میں بڑے بڑے مظاہرے ہوئے (تفصیلات آگے بیان ہوں گی) اور ہزاروں آزادی خواہ ہلاک ہوئے تو شاہ کو ایک بار پھر خطرہ محسوس ہونے لگا اور وہ امریکہ سے مزید فوجی امداد کا خواہاں ہوا۔ اس نے جون ۱۹۶۴ء میں واشنگٹن جا کر صدر جانسن کو فوجی امداد بڑھانے پر راضی کر لیا۔

۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۴ء کے درمیان ایران کو امریکہ سے فقط ۱۳ر لاکھ ڈالر کی فوجی مدد ملی تھی جو ۱۹۶۶ء میں ۲۰ کروڑ اسی لاکھ ڈالر یعنی ۱۶۰ گنا بڑھ گئی۔

پانچ سال بعد امریکی سیاست اور مشرق وسطیٰ کے حالات میں بعض ڈرامائی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ایک طرف ایران کے تیل کی آمدنی دگنی ہوگئی (ایک ارب ڈالر)۔ دوسری طرف برطانیہ نے اعلان کیا کہ وہ اپنی فوجوں کو خلیج فارس کے علاقے سے ۱۹۷۱ء تک واپس بلا لے گا۔ اسی دوران میں صدر نکسن نے جولائی ۱۹۶۹ء میں ویت نام کی جنگ کے حوالے سے یہ اعلان کیا کہ امریکہ کی خواہش ہے کہ تیسری دنیا کی ریاستیں اپنے دفاع کی ذمے داریاں خود قبول کریں البتہ اس نے یقین دلایا کہ ان ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں امریکی حکومت ان ریاستوں کی پوری مدد کرے گی۔ صدر نکسن کی پالیسی کی تشریح کرتے ہوئے امریکی وزیر دفاع نے کہا کہ 'ہر فریق کو مشترکہ مقصد میں اپنی کوششوں کا حصّہ شامل کرنا ہوگا۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ افرادی قوت ان ملکوں کو فراہم کرنا ہوگی اور ان کی تربیت کے لیے سامان، ٹریننگ، ٹیکنالوجی اور مخصوص ہنر امریکہ سپلائی کرے گا'۔

مطلب یہ تھا کہ مشرقی ملکوں کے ڈکٹیٹر حضرات کان کھول کر سن لیں کہ کوریا اور ویت نام کی طرح امریکی فوجیں اب ان کو عوامی قوتوں سے بچانے نہیں آئیں گی بلکہ یہ کام ان کو خود کرنا ہوگا البتہ جنگی سامان وہ جتنا چاہیں گے امریکہ بخوشی فراہم کردے گا۔

صدر نکسن کے اس اعلان سے شاہ نے وہی نتائج اخذ کیے جو نکسن کے بیان میں پوشیدہ تھے اور جب جنوری ۱۹۷۱ء میں برطانوی فوجوں نے خلیج فارس کے علاقے کو خالی کر دیا تو شاہ کوروش اور دارائے اعظم بننے کے خواب دیکھنے لگا۔ اس سال شاہ نے ایرانی شہنشاہیت کا ڈھائی ہزار سالہ جشن بلاوجہ تو نہیں منایا تھا۔

مئی ۱۹۷۲ء میں صدر نکسن تہران گئے اور وہاں ایک خفیہ معاہدہ ہوا جس میں طے پایا کہ ایران جس قسم کے جنگی اسلحے مانگے گا امریکہ مہیا کرے گا۔[۶] بالخصوص ایف ۱۴ر اور ایف ۱۵ر لڑاکا طیارے جو اُس وقت تک بے مثال تھے۔ ۱۹۷۲ء میں ایران نے امریکہ سے ۵۲ کروڑ ڈالر کا جنگی سامان خریدا تھا۔ امریکہ کی مہربانی سے یہ رقم دوسرے ہی سال بڑھ کر ۲

ارب ۱۵ کروڑ اور ۱۹۷۴ء میں ۴/ارب ۷ ۳ کروڑ ڈالر ہوگئی۔ اب ایران امریکی اسلحوں کا دنیا میں سب سے بڑا خریدار تھا۔ ۱۹۷۰ء میں ایران کا فوجی بجٹ ۸۸ کروڑ تھا۔ جو ۱۹۷۴ء میں بڑھ کر ۳/ارب ۶۸ کروڑ ڈالر (۱۴۱ فیصد اضافہ) اور ۱۹۷۷ء میں دس ارب ڈالر ہوگیا۔ ۱۹۷۷ء کے بجٹ میں سے ۴/ارب ۲۱ کروڑ فقط امریکی اسلحوں کی خریداری پر صرف ہوئے تھے۔

ویت نام کی جنگ کے بعد امریکہ شدید اقتصادی بحران میں پھنس گیا تھا۔ ہزاروں فیکٹریاں اور کارخانے جو دس سال سے سامانِ جنگ تیار کر رہے تھے لڑائی ختم ہو جانے کی وجہ سے بند ہو گئے تھے مگر خدا بھلا کرے ایران اور عرب ممالک کی حکومتوں کا جو آڑے وقت میں امریکہ کے کام آئیں۔ ویتنام میں کمیونسٹوں کی جیت ان کے لیے سخت تشویش کا باعث تھی لہٰذا امریکیوں نے ان کے اس خوف سے خوب فائدہ اٹھایا اور مشرق وسطیٰ کا ہر تیل پیدا کرنے والا ملک امریکہ سے سامان جنگ خریدنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے لگا۔ موت کے سوداگروں کی چاندی ہوگئی۔

اسلحوں کی خرید و فروخت میں امریکی سرمایہ داروں نے جو کمایا، شاہ اور اُن کے اہلِ خاندان نے جو کمیشن وصول کیے، رشوت اور خُرد برد کے باعث جو اربوں، کروڑوں کی ہیرا پھیری ہوئی اس کی داستان بہت سبق آموز ہے لیکن فی الحال ہمارا مقصد ایران میں امریکی مداخلت کے مختلف پہلوؤں کا تجزیہ ہے۔

پرانے زمانے میں فوجیں روایتی ہتھیاروں سے لڑتی تھیں۔ یہ ہتھیار ہر جگہ ملتے تھے اور سپاہی، غیر سپاہی سبھی ان کے استعمال سے واقف ہوتے تھے۔ لہٰذا جنگ میں فتح و شکست کا انحصار زیادہ تر سپاہیوں کی قوتِ مقابلہ اور سالاروں کی عسکری لیاقت پر ہوتا تھا۔ کوئی ملک ہتھیار چلانے والے دساور سے درآمد نہیں کرتا تھا لیکن فی زمانہ جنگی اسلحے اتنے پیچیدہ ہو گئے ہیں کہ ان کو فقط ماہرینِ فن ہی استعمال کر سکتے ہیں۔ ایران نے ہزاروں کی تعداد میں جو نئے نئے ٹینک، نئے نئے جنگی طیارے اور توپیں امریکہ سے خریدیں تو ان کو چلانے والے امریکی 'ماہرین' کی کھیپ کی کھیپ بھی درآمد کرنی پڑی۔ ۱۹۷۶ء سے پہلے امریکہ کی مسلح افواج کے تین ہزار سابق ملازم ایران میں امریکی کمپنیوں میں کام کرتے تھے اور ۱۴۳۵ وہ تھے جو براہ راست امریکی وزارت

دفاع کے نمائندہ تھے۔ ۱۹۷۷ء میں امریکی فوجی ماہرین کی تعداد ۴۳ ہزار ہوگئی۔

لندن کے مشہور ہفت روزہ 'اکنامسٹ' کے تجزیے کے مطابق ایران میں جنگی سامانوں اور تنصیبات کو دو گروپوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اول وہ جدید اسلحے جو شاہ نے امریکہ اور مغربی یورپ سے قیمتاً خریدے اور جو ایران کی ملکیت ہیں۔ دوئم وہ اسلحے اور مخبری کے آلات جو امریکہ کی ملکیت ہیں۔ ایرانی اسلحوں میں بعض ایسے ہیں جو مشرق وسطیٰ میں کسی کے پاس نہیں ہیں۔ مثلاً ۷۷ الیف ۱۴ رٹام کیٹ (tomcat) لڑاکا طیارے، پی ۳، الیف ٹام کیٹ دنیا کا سب سے زبردست لڑاکا طیارہ ہے۔ اس میں جو آلات لگے ہیں وہ دنیا میں کسی کو نصیب نہیں اور میزائل جن کی مار، سو میل سے بھی زیادہ ہے روسی میزائلوں سے بھی بہتر ہیں۔ یہ میزائل کئی سو کی تعداد میں اصفہان کے ہوائی مرکز میں محفوظ ہیں البتہ بہت سا فوجی سامان شورش کے آخری دنوں میں امریکہ نے چپکے چپکے سعودی عرب اور دوسرے ملکوں میں منتقل کردیا ہے۔ لیکن ہفت روزہ 'ٹائم' مورخہ ۲۳ر اپریل کے مطابق ایران میں ابھی تک ۳۲۰۰ امریکی ماہرین موجود ہیں جو فوجی تنصیبات کی نگرانی کر رہے ہیں۔

ایران میں امریکہ کا ایک فوجی منصوبہ 'آئی بکس' (Ibex) تھا۔ اس منصوبے کا واحد مقصد ایران کی سرزمین کو سوویت یونین کے خلاف جارحانہ فوجی سرگرمیوں کے لیے استعمال کرنا تھا۔ اس مقصد کے تحت سوویت یونین کی سرحد کے پاس گیارہ فوجی چوکیاں اور چھ ہوائی اڈے پچاس کروڑ ڈالر کی لاگت سے تعمیر کیے گئے تھے اور یہ فوجی تنصیبات خالص امریکی افواج کی نگرانی میں تھیں۔ فروری، مارچ ۱۹۷۹ء میں جن دنوں ایران میں امریکہ کے خلاف جذبات بہت مشتعل تھے تو یہ خبر آئی تھی کہ ان تنصیبات پر ایرانیوں نے قبضہ کرلیا ہے لیکن اس کے بعد کچھ پتہ نہیں چلا کہ یہ جنگی سامان کیا ہوئے اور تنصیبات اب بھی موجود ہیں یا ان کو منہدم کردیا گیا۔ ایرانی حکومت کی سوویت دشمن پالیسی کے پیشِ نظر گمان غالب یہی ہے کہ آئی بکس کا منصوبہ بدستور موجود ہے اور ایرانی حکومت نے اس پر پردہ ڈال دیا ہے۔

ایک زمانے میں سی۔ آئی۔ اے کا صدر دفتر برائے مشرق وسطیٰ بیروت میں تھا مگر وہاں جب فرقہ ورانہ فسادات شروع ہوئے تو یہ دفتر تہران منتقل کردیا گیا۔ یوں بھی ساتویں دہائی میں

ایران کی اہمیت مشرق وسطیٰ کے دوسرے ملکوں سے کہیں زیادہ تھی۔ انہیں ایام میں امریکہ نے سی۔ آئی۔ اے کے ڈائریکٹر جنرل مسٹر ہلمز کو ایران میں سفیر بنا کر بھیج دیا تاکہ وہ سی۔ آئی۔ اے کی سرگرمیوں کی پوری طرح نگرانی کرسکیں۔

لیکن امریکی مداخلت کے یہ سارے قلعے ایرانی عوام کے جوش وخروش کے ایک ہی ریلے میں ریت کے گھروندوں کی مانند زمین پر آ رہے۔ نہ امریکی اسلحوں سے لیس فوج انقلابی قوتوں کا مقابلہ کرسکی، نہ امریکی مشیر اور سی۔ آئی۔ اے کے گماشتے کام آئے اور نہ امریکہ کے فوجی اڈوں کی موجودگی۔

بات یہ ہے کہ سامراجی طاقتیں اپنی خارجہ حکمت عملی وضع کرتے وقت دوسرے ملکوں کے عوام کو اور ان کے جذبات واحساسات کو بالکل خاطر میں نہیں لاتیں۔ وہ تو فقط یہ دیکھتی ہیں کہ فلاں ملک کے پاس فوج اور پولیس کتنی ہے؟ اس کو اسلحہ کون فراہم کرتا ہے؟ اس کے حکمراں طبقے کا جھکاؤ کدھر ہے؟ اور اس کے فوجی اور سویلین افسروں کے سیاسی نظریات کیا ہیں؟ اگر یہ سماجی عناصر جمہوریت اور سوشلزم کے مخالف ہوں تو سامراجی طاقتیں ان کو مزید تقویت پہنچانے کی کوشش کرتی ہیں۔ عوام ان سماجی عناصر کے بارے میں کیا سوچتے ہیں اس سے سامراجی طاقتوں کو چنداں سروکار نہیں ہوتا۔ مگر جو خارجہ حکمت عملی عوامی قوتوں کو نظر انداز کرکے وضع کی جاتی ہے وہ ہمیشہ ناکام رہتی ہے۔ چنانچہ امریکی سامراج نے یہی غلطی ویت نام میں کی۔ یہی غلطی کیوبا اور انگولا میں کی اور یہی غلطی ایران میں کی۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ اس حکمت عملی کے سوا کوئی دوسری حکمت عملی اختیار ہی نہیں کرسکتا کیونکہ وہ اگر عوام کے حقوق، مفادات اور جذبات واحساسات کا احترام کرے تو وہ سامراجی طاقت نہیں رہ سکے گا۔

ایران میں امریکہ کو اطمینان تھا کہ شاہ ہمارا آوردہ وپروردہ ہے۔ اس کی طاقت کا انحصار ہماری طاقت پر ہے۔ اس کی خارجی اور داخلی پالیسی ہماری مرضی سے بنتی ہے، ایران کی معیشت پر ہمارا غلبہ ہے، ایران کی فوج اور خفیہ پولیس کی تربیت ہم کرتے ہیں۔ ہمارے مشیر حکومت کے ہر شعبے کی نگرانی کرتے ہیں۔ ایران کے وزیر، سفیر، فوجی جنرل، اعلیٰ سرکاری عہدہ دار اور بیشتر ممتاز سیاستداں سب ہماری جیبوں میں ہیں، سب ہمارے وظیفہ خوار ہیں۔ اخبار، ریڈیو،

ٹی۔ وی، سینما گھر سب ہمارے گن گاتے ہیں۔ رہ گئے چند سر پھرے اشتراکی کوچہ گرد تو ان سے آسانی سے نمٹا جا سکتا ہے۔ اس اثنا میں عوام کے اندر امریکہ کے خلاف نفرت کا لاوا اندر ہی اندر پکتا رہا اور ایک دن جب یہ لاوا پھوٹا اور ایران کے کوچہ و بام 'امریکائی اگورت را از ایران گم کن'، 'نابود باد اتحاد نظامی با امریکہ'، 'جاسوسان سیا (سی۔ آئی۔ اے) را از ایران بیرون کنید'، 'امریکہ حق مداخلہ در ایراں ندارد' جیسے نعروں سے گونجنے لگے تو امریکی مبصرین کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ نپولین نے ایک بار کہا تھا کہ دنیا میں فقط دو طاقتیں ہیں، ایک تلوار اور دوسرے روحِ انسانی۔ ان کے درمیان جب تصادم ہوتا ہے تو ہار آخر کار تلوار کی ہوتی ہے۔ ایران میں امریکہ کی شکست کا اصل سبب یہی تھا کہ وہ روحِ انسانی سے برسرِ پیکار تھا۔

مگر امریکی مبصرین اب تک اسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ سی۔ آئی۔ اے نے اگر غفلت نہ برتی ہوتی تو ۱۹۵۴ء کی طرح اس بار بھی شاہ کو بچایا جا سکتا تھا۔ اُن امریکی مشیروں اور ماہروں پر بھی نکتہ چینی کی گئی جو ایرانی حکومت کے ہر شعبے پر حاوی تھے لیکن حالات سے اتنے بے خبر تھے کہ شورش شدت اختیار کرتی گئی اور وہ کوئی کارروائی نہ کر سکے بلکہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ بعضوں نے تو صدر کارٹر کو بھی 'نرم روی' کا طعنہ دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ امریکہ نے اگر ڈٹ کر شاہ کا ساتھ دیا ہوتا اور اپنی فوجیں اتار دی ہوتیں تو تحریک کو کچلنا مشکل نہ تھا۔ امریکہ کے وظیفہ خوار مشرقی حکمرانوں کو بھی یہی شکایت ہوتی ہے کہ امریکہ اپنے وعدوں کا پاس نہیں کرتا بلکہ دوستی نبھانے کا وقت آتا ہے تو ہم سے آنکھیں پھیر لیتا ہے۔ سچ ہے جن کو اپنے ملک کے عوام اور اُن کے تعاون پر اعتماد نہ ہو وہ امریکہ سے شکوہ نہ کریں تو کیا کریں۔ ان بے چاروں کی ڈوبتی ناؤ کا بس ایک ہی سہارا تو رہ گیا ہے۔

لیکن امریکہ پر بے عملی یا بدعہدی کے تمام الزامات غلط ہیں۔ کیونکہ امریکہ آخر وقت تک شاہ کو بچانے کی تدابیر اختیار کرتا رہا بلکہ وہ آج بھی مشرقِ وسطیٰ میں اور خود ایران کے اندر پرانے حالات کو بحال کرنے کی ان تھک کوششیں کر رہا ہے۔ امریکہ نے جنرل رابرٹ ہائی زر کو جنوری کے اواخر میں تہران اسی غرض سے بھیجا تھا کہ وہ فوجی جنرلوں کو شاہ کے آخری وزیر اعظم شاہ پور بختیار کے خلاف بغاوت کرنے سے روکے۔ اس نے فوجی جنرلوں کو تو راضی کر لیا لیکن

ٹی۔وی، سینما گھر سب ہمارے گن گاتے ہیں۔رہ گئے چند سر پھرے اشتراکی کوچہ گرد تو ان سے آسانی سے نمٹا جاسکتا ہے۔ اس اثنا میں عوام کے اندر امریکہ کے خلاف نفرت کا لاوا اندر ہی اندر پکتا رہا اور ایک دن جب یہ لاوا پھوٹا اور ایران کے کوچہ و بام 'امریکائی اگورت را از ایران گم کن،' نابود باد اتحاد نظامی با امریکہ' 'جاسوسان سیا (سی۔آئی۔اے) را از ایران بیرون کنید،' امریکہ حق مداخلہ در ایراں ندارد' جیسے نعروں سے گونجنے لگے تو امریکی مبصرین کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ نپولین نے ایک بار کہا تھا کہ دنیا میں فقط دو طاقتیں ہیں، ایک تلوار اور دوسرے روح انسانی۔ ان کے درمیان جب تصادم ہوتا ہے تو ہار آخر کار تلوار کی ہوتی ہے۔ ایران میں امریکہ کی شکست کا اصل سبب یہی تھا کہ وہ روح انسانی سے برسرِ پیکار تھا۔

مگر امریکی مبصرین اب تک اسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ سی۔آئی۔اے نے اگر غفلت نہ برتی ہوتی تو ۱۹۵۴ء کی طرح اس بار بھی شاہ کو بچایا جاسکتا تھا۔ اُن امریکی مشیروں اور ماہروں پر بھی نکتہ چینی کی گئی جو ایرانی حکومت کے ہر شعبے پر حاوی تھے لیکن حالات سے اتنے بے خبر تھے کہ شورش شدت اختیار کرتی گئی اور وہ کوئی کارروائی نہ کرسکے بلکہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ بعضوں نے تو صدر کارٹر کو بھی 'نرم روی' کا طعنہ دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ امریکہ نے اگر ڈٹ کر شاہ کا ساتھ دیا ہوتا اور اپنی فوجیں اتار دی ہوتیں تو تحریک کو کچلنا مشکل نہ تھا۔ امریکہ کے وظیفہ خوار مشرقی حکمرانوں کو بھی یہی شکایت ہوتی ہے کہ امریکہ اپنے وعدوں کا پاس نہیں کرتا بلکہ دوستی نبھانے کا وقت آتا ہے تو ہم سے آنکھیں پھیر لیتا ہے۔ سچ ہے جن کو اپنے ملک کے عوام اور اُن کے تعاون پر اعتماد نہ ہو وہ امریکہ سے شکوہ نہ کریں تو کیا کریں۔ ان بے چاروں کی ڈوبتی ناؤ کا بس ایک ہی سہارا تو رہ گیا ہے۔

لیکن امریکہ پر بے عملی یا بدعہدی کے تمام الزامات غلط ہیں۔ کیونکہ امریکہ آخر وقت تک شاہ کو بچانے کی تدابیر اختیار کرتا رہا بلکہ وہ آج بھی مشرقِ وسطیٰ میں اور خصوصاً ایران کے اندر پرانے حالات کو بحال کرنے کی ان تھک کوششیں کر رہا ہے۔ امریکہ نے جنرل رابرٹ ہائی زر کو جنوری کے اواخر میں تہران اسی غرض سے بھیجا تھا کہ وہ فوجی جنرلوں کو شاہ کے آخری وزیرِ اعظم شاہ پور بختیار کے خلاف بغاوت کرنے سے روکے۔ اس نے فوجی جنرلوں کو تو راضی کرلیا لیکن

شاہ پور اور شاہ کو بچانا اس کے بس میں نہ تھا۔

جنرل ہائی زر کی سرگرمیوں سے یہ حقیقت بھی واضح ہوجاتی ہے کہ ایران میں دراصل حکومت کون کرتا تھا۔ شاہ یا امریکہ؟

چنانچہ انقلابی عدالت میں اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے ہوائی فوج کے جنرل امیر حسین ربیعی نے بڑی تلخی سے اس بات کا اعتراف کیا کہ:۔

'ہائی زر تہران آیا اور اس نے شاہ کو مردہ چوہے کی مانند دم سے پکڑا اور باہر پھینک دیا۔'[8]

حوالہ جات

1- Fred Halliday, *op. cit,* p.91.

2- David Horowitz, *From Yalta to Vietnam* (London, 1966), p. 190.

3- *Dawn,* 21 April, 1979.

4- *Iran Almanac* (Tehran), 1976, p. 170.

5- Fred Hallidy, *op. cit.* p.114.

6- *Ibid,* p.94.

7- *Economist* (London) 17 February, 1979.

8- *Time* (New York) 23 April, 1979.

چھٹا باب

پہلوی ریاست کے استبدادی ادارے

پہلوی ریاست کی نوعیت اپنی پیش رو قاچاری ریاست سے بہت مختلف تھی۔ یوں کہنے کو تو قاچاری فرمانروا پہلویوں سے کم جابر اور مطلق العنان نہ تھے لیکن قاچاری ریاست تھی مشرق کی روایتی فیوڈل ریاست۔ لہٰذا بادشاہ کے اختیارات بھی فیوڈل رشتوں ہی سے متعین ہوتے تھے۔ استبدادی عناصر — فوج، پولیس، افسر شاہی، عدالتیں، جیل خانے وغیرہ — موجود ضرور تھے مگر سب پر جمود انحطاط طاری تھا۔ چنانچہ قاچاری ریاست آخری دنوں میں ایک ایسا سیاسی ڈھانچہ رہ گئی تھی جس کے ڈھیلے ڈھالے اعضا کے سب جوڑ کھلتے جا رہے ہوں۔ اس کے برعکس پہلوی ریاست دورِ حاضر کی نہایت جابر قسم کی فوجی آمریت تھی۔ رضا خاں سپہ دار اور اس کا بیٹا رضا شاہ پہلوی دونوں فوجی 'کودیتا' کے ذریعے برسرِ اقتدار آئے تھے۔ رضا خاں ۱۹۲۱ء میں برطانوی فوج کی مدد سے اور رضا شاہ پہلوی ۱۹۵۳ء میں سی۔ آئی۔ اے اور ایرانی فوج کی مدد سے۔ لہٰذا پہلوی ریاست کا انحصار ہمیشہ فوج اور پولیس پر رہا۔ اس کے علاوہ پہلویوں کا بالخصوص رضا شاہ پہلوی کا مفاد فیوڈل ازم کے بجائے سرمایہ داری نظام سے وابستہ تھا۔ اس نے سرمایہ داری نظام کے حدود میں رہ کر ریاست کے استبدادی اداروں کو مضبوط سے مضبوط تر بنایا بلکہ ۱۹۷۰ء کے

بعد جب تیل کی آمدنی میں اضافہ ہوا تو رضا شاہ نے اپنی فوجی طاقت اتنی بڑھا لی کہ مشرق وسطیٰ میں کوئی اس کا ہمسر نہ رہا اور وہ اپنے آپ کو اس پورے علاقے کا سرپرست اور پاسبان سمجھنے لگا۔ ہم کو وہ دن یاد ہیں جب بلوچستان میں عوامی شورش شباب پر تھی اور شاہ بار بار دھمکیاں دے رہا تھا کہ اگر پاکستان میں گڑبڑ ہوئی تو ایران خاموش تماشائی نہیں رہے گا۔

مگر رضا شاہ پہلوی کی فوجی آمریت اور دوسرے ملکوں کی فوجی آمریت میں بڑا فرق تھا۔ فوجی آمریت میں فوج عموماً ریاست کے پورے نظم و نسق پر قابض ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس پہلوی ریاست کے نظم و نسق میں فوج دخل اندازی نہیں کر سکتی تھی حتیٰ کہ فوجی امور کا فیصلہ بھی شاہ خود کرتا تھا۔ وہ تمام مسلح افواج کا سپہ سالار تھا۔ میجر اور اس سے اونچے فوجی افسروں کی تقرریاں، تبادلے اور ترقیاں سب اس کی مرضی سے ہوتی تھیں۔ دفاعی بجٹ کا تعین وہ خود کرتا تھا اور اسلحوں کی خریداری اس کے حکم سے ہوتی تھی۔ مسلح افواج کے تینوں شعبوں — بری فوج، بحریہ اور فضائیہ — کو آپس میں کسی قسم کا رابطہ رکھنے کی اجازت نہ تھی بلکہ ان کے مابین تمام خط و کتابت شاہ کی وساطت سے ہوتی تھی۔ کوئی فوجی جنرل شاہ کی اجازت کے بغیر کسی دوسرے جنرل سے ملاقات نہیں کر سکتا تھا اور نہ تہران آ سکتا تھا۔ فوجی افسروں کی نقل و حرکت کی نگرانی کے لیے ملٹری انٹیلی جنس کے علاوہ شاہ کی اپنی ذاتی خفیہ پولیس بھی تھی جو شاہ کو فوجیوں کے حالات اور ان کی سرگرمیوں سے مطلع کرتی رہتی تھی۔ فوجیوں کی تربیت میں بھی شاہ پرستی پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ فوجیوں کو حلف اٹھاتے وقت 'خدا، شاہ اور میہن' (وطن) سے وفاداری کی قسم کھانی پڑتی تھی۔ شاہ کو فوجی وردی پہننے کا بھی بہت شوق تھا اور وہ سپہ سالار کا فوجی لباس پہن کر اکثر فوجی پریڈوں میں شریک ہوتا تھا وہ ہفتے میں دو دن فوج کے سربراہوں سے الگ الگ ملاقات بھی کرتا تھا۔

شاہ کا تخت چونکہ فوجی کودیتا سے بحال ہوا تھا لہٰذا شاہ فوجی جنرلوں کی طرف سے ہمیشہ چوکس رہتا تھا۔ اس نے جنرلوں کو یہ بات ذہن نشین کرا دی تھی کہ تمہارے سارے ٹھاٹھ باٹھ میری بدولت ہیں اور میں جب چاہوں تم کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال باہر کر سکتا ہوں۔ وہ اپنی اس طاقت کا مظاہرہ بھی کرتا رہتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۶۱ء میں اس نے ساواک کے سربراہ جنرل

بختیاری، چیف آف اسٹاف جنرل عبداللہ ہدایت جو شاہ کے بعد فوج کا سب سے طاقتور شخص تھا اور ملٹری انٹیلی جنس کے سربراہ جنرل علوی کیا کو بہ یک جنبش قلم برطرف کر دیا۔ اگر کسی فوجی عنصر کے بارے میں سیاست میں ملوث ہونے کا شبہ بھی ہوتا تو اس پر رشوت یا خُرد برد کا الزام لگا کر سخت سزا دی جاتی تھی۔ ۱۹۷۴ء میں تین جنرلوں اور دو کرنلوں کو غبن کے جرم میں سزا دی گئی اور ۱۹۷۶ء میں سابق امیر البحر رمز عباس عطائی اور اُن کے نائب، نائب امیر البحر حسن رفاعی اور چودہ دوسرے بحری افسروں کو پانچ سال کے لیے قید کر دیا گیا۔ اس سے پہلے فوج کے تین سو کرنلوں کو برطرف کیا جا چکا تھا۔

دفاعی اخراجات

۱۹۵۳ء میں جس وقت شاہ کو دوبارہ اقتدار حاصل ہوا تو ایران کے دفاعی بجٹ کی کل رقم چھ کروڑ ستر لاکھ ڈالر (۶۷ کروڑ روپیہ) تھی۔ سات سال کے اندر اس رقم میں بارہ گنا اضافہ ہو گیا اور ۱۹۷۷ء میں یہ رقم بڑھ کر ۹ ارب چالیس کروڑ ڈالر (۹۴ ارب روپیہ) ہو گئی جو پاکستان کے وفاقی بجٹ بابت ۱۹۷۹ء۔۱۹۸۰ء کی مجموعی رقم (۵۲ ارب ۱۴ کروڑ) سے تقریباً دگنی تھی۔ ایک اندازے کے مطابق ایران کے فوجی مصارف پڑوسی ملک عراق سے آٹھ گنا زیادہ تھے حالانکہ ایران کی فوج (۳ لاکھ) عراق کی فوج سے فقط دگنی بڑی تھی۔[۱]

یہ فوجی مصارف تیل کی آمدنی سے پورے کیے جاتے تھے۔ بقول رضا پیرور 'ایران کو تیل سے جو آمدنی ہوتی تھی اس کا ساٹھ فیصد موت کے سوداگروں کو واپس مل جاتا تھا۔'

پہلوی افواج کی دفاعی صلاحیتوں کے امتحان کی نوبت تو کبھی نہیں آئی البتہ رضا شاہ پہلوی نے اپنی فوج کو ایران کے اندر اور مشرقِ وسطیٰ میں عوامی تحریکوں کو کچلنے کے لیے بار بار استعمال کیا۔ مثلاً ۱۹۴۶ء۔۱۹۴۷ء میں جب آذربائیجان اور کردستان میں صوبائی خود مختاری کی تحریک اٹھی تو ان تحریکوں کو فوج کے ذریعے بڑی بے دردی سے دبا دیا گیا۔ اُس وقت سے ایران میں ۲۱ آذر (۱۲ دسمبر) اور ۲۸ امرداد (۱۹ اگست) کی تاریخیں فوجی فتح کی یادگار کے طور پر منائی جاتی ہیں۔ پہلوی فوج کو غیر جمہوری مقاصد کے لیے دوسری بار ۱۹۵۳ء میں ڈاکٹر مصدق کی حکومت کے خلاف استعمال کیا گیا۔ دس سال بعد جب جون ۱۹۶۳ء میں شاہ کے

خلاف بڑے پیمانے پر مظاہرے ہوئے تو فوج ایک بار پھر طلب کی گئی اور تہران، قم اور دوسرے شہروں میں کم از کم ایک ہزا افراد ہلاک اور کئی ہزار زخمی ہوئے۔ اس کے بعد ایران کے تمام بڑے شہروں میں فوج نے مستقل ڈیرے ڈال لیے اور یونیورسٹیوں کی نگرانی کرنے لگی۔ اپنے سیاسی حریفوں کو ٹھکانے لگانے کے لیے شاہ نے سیاسی مقدمات کی سماعت کے لیے فوجی عدالتیں قائم کردیں۔

شاہ کسی ملک میں جمہوری قوتوں کے فروغ کو برداشت نہیں کرسکتا تھا اور مشرق وسطیٰ کے بارے میں تو اس کا خیال تھا کہ یہ علاقہ میری جاگیر ہے اور وہاں کی ہر جمہوری تحریک براہِ راست میری ذات پر حملہ ہے۔ وہ بار بار کہہ چکا تھا کہ میں ایران کے قرب وجوار میں کسی قسم کی 'تخریبی سرگرمی' کی اجازت نہیں دوں گا۔ تخریبی سرگرمی سے اس کی مراد قومی یا عوامی تحریکیں تھا۔ چنانچہ اس نے شمالی یمن، عرب امارات، عمان، پاکستان اور عراق میں فوجی مداخلت کی۔ شاہ کی یہ فوجی مہم جوئیاں دراصل مشرق وسطیٰ کو ایران کا مخصوص منطقۂ اثر بنانے سے متعلق تھیں۔

۱۹۶۲ء۔ ۱۹۶۳ء میں جب شمالی یمن میں امام یمن اور جنرل ناصر کی حمایت کرنے والوں کے درمیان خانہ جنگی شروع ہوئی تو شاہ نے امام یمن کو اسلحے فراہم کیے اور یمنی سپاہیوں کو ایران میں ٹریننگ کی سہولتیں فراہم کیں۔

نومبر ۱۹۷۱ء میں جس روز برطانیہ نے عرب امارات کو اختیار سونپا اس سے ایک دن قبل ایرانی فوجوں نے خلیج فارس کے تین جزیروں پر زبردستی قبضہ کرلیا، ایک جزیرہ ابوموسیٰ شرجا اور دو راس الخیمہ کی ملکیت تھے۔ مقابلے میں کچھ عرب سپاہی مارے گئے اور شاہ نے عرب باشندوں کو جزیروں سے نکال باہر کیا۔

انہیں دنوں عمان میں سلطان قابوس کے خلاف زدفر کے صوبے میں عوامی تحریک شروع ہوئی تو شاہ نے سلطان کی حمایت میں کئی ہزار ایرانی سپاہی اور جنگی اسلحہ عمان روانہ کیے۔ ایرانی فوجوں کی مداخلت کا یہ سلسلہ دسمبر ۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۶ء کے اواخر تک جاری رہا۔ حتیٰ کہ چھاپہ ماروں کی سرگرمیوں کے فرو ہوجانے کے بعد بھی ایرانی فوجیں عمان میں پڑاؤ ڈالے رہیں۔ ثمریت کا ہوائی اڈہ بھی ایرانی طیاروں کے تصرف میں تھا اور ایران کے جنگی جہاز خلیج ہرمز میں

عمان کے ساحل کی نگرانی کرتے رہے۔

ایران اور عراق کی رقابت بہت پرانی ہے۔ کرد چونکہ سرحد کے دونوں جانب آباد ہیں لہٰذا دونوں ریاستیں کردوں کو ایک دوسرے کے خلاف اکساتی رہتی ہیں۔ عراقی کردوں کے لیڈر مصطفیٰ برزانی کو، جس کا حال ہی امریکہ میں انتقال ہوا ہے، سی۔ آئی۔ اے کی حمایت حاصل تھی۔ اس کو مزید تقویت پہنچانے کی غرض سے شاہ نے ۱۹۷۲ء میں برزانی کو باقاعدہ فوجی مدد دینا شروع کی۔ ایک ہزار ایرانی سپاہی عراقی کردستان میں برزانی کی کمک پر بھیجے گئے اور ساواک کی ایک شاخ بھی پارستین کے نام سے وہاں کھولی گئی مگر مارچ ۱۹۷۵ء میں جب عراق اور ایران کے درمیان سمجھوتہ ہوگیا تو شاہ نے کردوں کی حمایت سے ہاتھ کھینچ لیا۔ مصطفیٰ برزانی بھاگ کر امریکہ چلا گیا۔

شاہ جمہوری قوتوں سے لڑنے والی ہر حکومت کی فوجی امداد بڑی خوشی سے کرتا تھا چنانچہ ۱۹۷۲ء میں اس نے جنوبی ویت نام کے صدر کو بے شمار جنگی طیارے (Phantom Jets) فراہم کیے۔ اسی طرح مراکش، اردن اور عمان کو بھی جنگی طیاروں سے نوازا۔ زائرے میں جنرل موبوٹو کی فوجی مدد کی اور صومالیہ کو اسلحے فراہم کیے۔

ایرانی لشکر میں شاہ کے سب سے چہیتے شاہی پہرہ دار تھے۔ ان کی تعداد ستر ہزار تھی۔ یہ بہت چنے ہوئے لوگ تھے جو جدید ترین آلاتِ جنگ سے مسلح ہوتے تھے۔ ان میں چھاتے برداروں کا بھی ایک دستہ تھا اور ایک دستہ بغاوت فرو کرنے والے ماہر سپاہیوں کا۔ ان کی چھاؤنیاں تہران کے گردونواح میں تھیں اور وہ براہ راست شاہ کی کمان میں تھے۔ شاہ کے محل کی حفاظت کرنے والوں کی تعداد دو ہزار ہوتی تھی۔ ان میں سپاہی کوئی نہیں تھا بلکہ سب کپتان، میجر اور کرنل ہوتے تھے۔

شاہ کا ایک اور استبدادی ادارہ 'ژندار مری' یعنی 'امنیہ' تھا۔ امنیہ کی حیثیت فوج اور پولیس کے درمیان تھی۔ اس کے پاس ہلکے پھلکے فوجی ہتھیار ہوتے تھے اور وہ پانچ ہزار آبادی سے کم کے قصبات اور دیہات کی نگرانی کرتی تھی۔ اس امنیہ کی تربیت امریکی 'ماہروں' نے کی تھی اور ۱۹۴۶ء سے ۱۹۷۶ء تک وہی اس کے نگرانِ اعلیٰ تھے۔ امنیہ اُس وقت حرکت میں آتی

تھی جب ملٹری انٹیلی جنس (رکن دو) حالات پر قابو پانے میں ناکام ہو جاتی تھی۔ یہ خالص بغاوت کش تنظیم تھی جو گاؤں اور قصبوں کی دیکھ بھال پر تعینات تھی۔ ۱۹۶۰ء میں امنیہ کی کل تعداد ۲۵ ہزار تھی جو دس سال میں ستر ہزار ہو گئی۔ اس کے پاس موٹریں، ہوائی جہاز، وائرلیس، ہیلی کاپٹر غرضیکہ وہ سارا سامان موجود تھا جن کی مدد سے ملک کے دور دراز علاقوں سے رابطہ قائم کیا جا سکتا تھا اور بوقت ضرورت وہاں فوراً پہنچا جا سکتا تھا۔

ساواک

لیکن شاہ کی سب سے سفاک استبدادی تنظیم جس نے ایرانیوں کی زندگی اجیرن کر دی تھی اور جس کے ہولناک مظالم کی داستان کا ہر صفحہ بے گناہوں کے خون سے رنگین ہے ساواک ('سازمان اطلاعات وامنیت کشور') تھی۔ خفیہ پولیس ہر ملک میں ہوتی ہے، ایران میں بھی تھی لیکن ۱۹۵۳ء کے 'کودیتا' کے بعد شاہ کے امریکی مشیروں نے ایرانی خفیہ پولیس کو سی۔ آئی۔ اے کے خطوط پر منظم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اُن دنوں جنرل تیمور بختیار ایران کا گورنر تھا اور مخبری کے دو ادارے اس کی نگرانی میں کام کر رہے تھے۔ ایک فوجی انٹیلی جنس جس کے سپرد فوج کو جبہ ملی کے طرفدار فوجیوں سے پاک کرنا تھا اور دوسرے خفیہ پولیس (آگاہی کار) جس کو شاہ کی مخالف سیاسی جماعتوں، ٹریڈ یونینوں اور اخباروں رسالوں پر تشدد کی خاطر استعمال کیا جاتا تھا۔ جنرل بختیار کو امریکی مشیروں کا تعاون حاصل تھا۔

لیکن یہ ادارے شاہ کی استبدادی ضرورتوں کے لیے ناکافی سمجھے گئے لہٰذا ۱۹۵۷ء میں 'سازمان اطلاعات وامنیت کشور' کے نام سے ایک نئی تنظیم قائم کی گئی اور سی۔ آئی۔ اے کی ایک خفیہ یونٹ کو اس سے منسلک کر دیا گیا۔ ساواک کے سربراہ کا عہدہ نائب وزیر اعظم کے برابر ہوتا تھا اور اس کو شاہ خود مقرر کرتا تھا اور وہ براہ راست شاہ کے روبرو جواب دہ ہوتا تھا۔

ساواک کا بجٹ یوں تو خفیہ تھا لیکن معتبر مبصرین راوی ہیں کہ ۱۹۷۲ء۔ ۱۹۷۳ء میں ساواک پر ۲۵٫۵ کروڑ ڈالر اور ۱۹۷۳ء۔ ۱۹۷۴ء میں ۳۱ کروڑ ڈالر خرچ ہوئے تھے۔ ۱۹۷۶ء۔ ۱۹۷۷ء میں یہ رقم بڑھ کر ایک ارب ڈالر ہو گئی تھی۔ ساواک کے مستقل ملازمین کی تعداد پچاس ساٹھ ہزار کے درمیان تھی لیکن ساواک کے تنخواہ یافتہ مخبروں کی تعداد ایک سے کہیں

زیادہ تھی۔ وہ ہر گلی کوچے، ہر قریے اور قصبے، ہر دفتر اور کارخانے، ہر درس گاہ اور ہوسٹل میں موجود تھے۔ چنانچہ ساواک کی سرگرمیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے امریکی ہفت روزہ 'نیوز ویک' نے اکتوبر ۱۹۷۶ء میں لکھا تھا کہ:

'کسی قابل فہم معیار کے مطابق ساواک کی سرگرمیوں کا دائرہ عمل اور ان کا سائز لرزا دینے والا ہے۔ ساواک کے کل وقتی کارکنوں کی تعداد تیس اور ساٹھ ہزار کے درمیان ہے لیکن وہ کہیں بڑے جانور کا فقط ڈھانچہ ہیں۔ ایران میں مقیم بعض غیر ملکی ڈپلومیٹوں کے بیان کے مطابق کم از کم تیس لاکھ افراد یعنی ہر آٹھویں بالغ ایرانی میں ایک شخص وقتاً فوقتاً ساواک کی مخبری کرتا رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ساواک کی آنکھیں اور کان ہر جگہ موجود ہیں۔ ہوٹلوں اور اسکولوں میں، ٹیکسیوں میں، غیر ملکی سفارتخانوں میں، کمپنیوں اور فیکٹریوں میں، ڈاکٹروں کے مطب میں حتیٰ کہ ان ہوسٹلوں اور طعام گاہوں میں بھی جن میں ایرانی طلبا ملک سے باہر رہتے اور کھاتے ہیں۔'

غرضیکہ ساواک کی شاخیں مکڑی کے جالے کی طرح ہر طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ مزدوروں، طالب علموں، استادوں، ادیبوں اور صحافیوں کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھی جاتی تھی۔ سوشلسٹوں، کیونسٹوں کی تلاش ساواک کا خاص فریضہ تھا اور وہ شکاری کتوں کی طرح ان کی بو سونگھتے پھرتے تھے۔

ساواک کا پہلا سربراہ جنرل تیمور بختیاری تھا جس نے ۱۹۵۳ء میں تہران کے فوجی گورنر کی حیثیت سے لوگوں پر بے انتہا ظلم ڈھائے تھے مگر جب شاہ نے بختیاری قبیلے کی ملکہ ثریا اسفندیاری کو طلاق دی اور بختیاریوں کی چڑھی کمان اتر گئی تو جنرل بختیاری نے ۱۹۶۱ء میں علاج کے بہانے بھاگ کر بغداد میں پناہ لی۔ وہاں اس نے ساواک کی کارستانیوں کی خوب خوب قلعی کھولی۔ شاہ نے اس کی واپسی کا مطالبہ کیا تو وہ پیرس چلا گیا۔ لیکن ساواک کے آدمی اس کے تعاقب میں تھے اور ایک دن اس کی لاش ملی جو خون میں لت پت تھی۔

جنرل بختیاری کے بعد جنرل حسن پاک رواں ساواک کا سربراہ مقرر ہوا لیکن ۱۹۶۵ء

میں کسی سپاہی نے شاہ پر قاتلانہ حملہ کیا تو شاہ نے حسن پاک رواں کو برطرف کردیا اور اس کی جگہ اپنے اسکول کے ساتھی اور معتمد خاص جنرل نعمت اللہ نصیری کو جو تہران کا فوجی گورنر تھا اور جون ۱۹۶۳ء کی شورش کو دبانے میں نمایاں 'خدمات' سر انجام دے چکا تھا، ساواک کی نگرانی سپرد کی۔ یہ شخص تیرہ برس تک ساواک کا سربراہ بنا رہا۔ ساواک کی طاقت بھی دراصل اسی کے زمانے میں بڑھی اور مظالم بھی بیشتر نصیری ہی کے عہد میں ہوئے۔ ساواک کے اثر واقتدار کا یہ حال تھا کہ 'عام چپڑاسی کا تقرر ہو یا صوبائی گورنر اور مرکزی کابینہ کے رکن کا انتخاب درپیش ہو، ہر صورت میں ساواک کی منظوری ضروری ہوتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ سرکاری ملازمت کا 'ہر امیدوار اپنے آپ کو رضا کارانہ طور پر ساواک کی خدمات کے لیے پیش کرتا تھا۔ تقرر کے لیے بھاری رشوتیں بھی طلب کی جاتی تھیں۔ ان ایجنٹوں کو عوام نفرت سے ساواکی کہتے تھے۔'[۲۲]

البتہ جب ۱۹۷۸ء میں عوامی تحریک نے زور پکڑا اور جنرل نصیری کی برطرفی کا مطالبہ ہونے لگا تو شاہ نے اس کو پاکستان میں سفیر بنا کر بھیج دیا اور جنرل ناصر مقدم کو ساواک کا سربراہ مقرر کیا مگر فروری ۱۹۷۹ء میں ساواک کے ساتھ اس کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

ساواک کے اختیارات بہت وسیع تھے۔ ساواک والے جس کو چاہتے بلا وارنٹ گرفتار کر سکتے تھے اور جب تک چاہتے اپنی حراست میں رکھ سکتے تھے۔ ملزموں کو وکیل کرنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ ان کے مقدمے کی سماعت فوجی عدالت میں ہوتی تھی، وہ بھی بالکل خفیہ، جس میں ملزموں کو گواہ پیش کرنے کا حق نہ تھا اور نہ ہی فوجی عدالت کے فیصلوں کے خلاف کسی اعلیٰ عدالت میں اپیل کی جا سکتی تھی۔ سیاسی قیدیوں کی صحیح تعداد کوئی نہیں بتا سکتا کیونکہ ان کو ۱۹۳۱ء کے قانون غداری کے تحت سزا دی جاتی تھی۔ لہٰذا حکومت ان کو بھی اخلاقی قیدی تصور کرتی تھی۔ البتہ شاہ نے ۱۹۷۷ء میں ایک بار 'لندن ٹائمز' مورخہ ۹ جون ۱۹۷۷ء میں یہ اعتراف کیا تھا کہ سیاسی قیدیوں کی تعداد ۳۲۰۰ ہے لیکن غیر ملکی مبصرین کا اندازہ تھا کہ اس سال ایران میں تقریباً ایک لاکھ سیاسی کارکن جیلوں میں بند تھے۔

سیاسی قیدیوں کی 'پوچھ گچھ' دو مرحلوں پر ہوتی تھی۔ اول مقدمے کی سماعت سے قبل جس کو 'باز جوئی' کہتے تھے اور دوسری عدالت کے روبرو جس کو 'باز پرس' کہتے تھے لیکن تشدد اور

جسمانی اذیت کے حربے جو مار دھاڑ جوئی کے دوران استعمال کیے جاتے تھے۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کے بیان کے مطابق ' کوڑے مارنا، بجلی سے داغنا' ناخن اکھاڑنا، دانت توڑنا، مقعد میں ابلتا پانی پمپ کرنا، فوطوں سے بھاری وزن لٹکانا، ملزم کو لوہے کی لال تپتی ہوئی چادر پر لٹانا، عورتوں کے نازک مقامات میں ٹوٹی بوتل گھسیڑنا، ان کی عصمت دری کرنا؛ جسمانی اذیت کے معمولات تھے۔ ان مظالم کی تصدیق ڈاکٹر یٰسین رضوی نے بھی کی ہے وہ لکھتے ہیں کہ 'جسم کے نازک حصوں کو زہریلے کیڑوں سے ڈسوانا، خلاف فطرت حرکتیں کرنا، چاقو سے کھال چھیلنا، اہل خاندان کی عصمت دری کرنا روزمرہ کی سزائیں تھیں'۔ اگر کوئی سخت جان ان تمام اذیتوں کو جھیل جاتا مگر تائب نہ ہوتا تو اس کو بوری میں بند کر کے ہیلی کاپٹر سے تہران کے جنوب مشرق میں واقع نمک کی جھیل میں پھینک دیا جاتا تھا۔ اس وقت ایران میں ایسے بہت سے نوجوان طالب علم اور دانشور موجود ہیں جن کے بیکار اور ٹوٹے جسم ساواک کی بربریت کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔' یاد رہے کہ مصنف کٹر قسم کے شاہ پرست ہیں۔

'ایران آمریت اور ترقی' کے مصنف فریڈ ہیلی ڈے نے جسمانی اذیت کی چار مثالیں دی ہیں۔ اوّل تہران کے ایک انجینئر مسعود احمد زادے کی جس نے ۱۹۷۲ء میں مقدمے کی سماعت کے دوران اپنی قمیض اٹھائی تو اس کے سینے اور پیٹ کا پیشتر حصہ جل کر سیاہ ہوگیا تھا اور اس کی پیٹھ پر زخم کی لمبی لمبی بتیاں بن گئی تھیں۔ مگر اس کو پھانسی دے دی گئی۔ دوئم ایک چھاپہ مارلڑکی اشرف درانی جو بعد میں جیل سے فرار ہوگئی تھی۔ وہ اپنی آپ بیتی میں لکھتی ہے کہ کس طرح پوچھ گچھ کرنے والوں نے اس کے ساتھ بار بار عصمت دری کی اور اس پر سانپ چھوڑے۔ اس نے خاص طور پر کپتان پیرون نکتاب کا ذکر کیا ہے۔ سوئم ایک ایرانی طالب علم جس نے ۱۹۷۶ء میں مصنف کو خود بتایا کہ اس کو بستر سے باندھ کر کس طرح لوہے کے تار سے پیٹا گیا اور جب اس نے اعتراف کرنے سے انکار کیا تو بجلی کے ایک ڈنڈے کو جس کو 'عصائے برقی' کہتے تھے اس کے اعضائے تناسل سے باندھ دیا گیا۔ چوتھے رضا براہنی ایک ادیب جس کو ۵۷ کوڑے مارے گئے۔ پھر اس کے بائیں ہاتھ کی ایک انگلی توڑ دی گئی۔

ڈاکٹر یٰسین رضوی نے بھی جو کٹر شاہ پرست ہیں اپنی کتاب میں ساواک کے مظالم کے

کئی واقعات درج کیے ہیں۔ مثلاً ایک شخص محمد طیب کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ محمد طیب تہران کے عوام میں بہت مقبول تھا۔ ساواک نے اس کو 'غنڈہ گردی' کے الزام میں گرفتار کیا۔ اس کو کوڑوں سے پیٹا۔ اس کی سگی بہنوں کی عصمت دری کی مگر اس نے شاہ کی حمایت نہ کی تو اس کو، اس کے دو بھائیوں اور تین ساتھیوں کو گولی مار دی گئی۔ اسی طرح روزنامہ 'کیہان' کے دو اخبار نویس گل سرخی برادران کو دفتر سے گرفتار کیا گیا اور ظلم وتشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ گل سرخی برادران نے ساواک کو یقین دلایا کہ اگر ہمیں کھلی عدالت میں پیش کیا جائے تو ہم اپنے 'جرم' کا اعتراف کرلیں گے۔ ساواک نے عدالت میں گل سرخی برادران کو پیش کیا تو تین روز تک انہوں نے سنسنی خیز 'اعتراف' کیے مگر تیسرے روز اپنا لباس اتار کر زخموں کے وہ نشان دکھائے جو ساواک نے لگائے تھے۔ اس پر عدالت نے ساواک کے ظلم کی داستان کو 'غیر متعلقہ' قرار دیا[۴] اور دونوں کو گولی مار دی گئی۔

ان مظالم کا مقصد مخالفین کو راہ سے ہٹانے کے علاوہ ملک میں خوف اور دہشت کی عام فضا پیدا کرنا تھا لیکن ساواک اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوا۔ ورنہ شاہ آج بھی ایران پر حکومت کرتا ہوتا۔ چنانچہ ایسے لوگ بے شمار تھے بالخصوص ٹریڈ یونین کے مزدور جنہوں نے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنے قاتلوں کو ترکی بہ ترکی جواب دیا اور شہید ہوگئے مگر نہ معافی مانگی اور نہ ساواک کا ایجنٹ بننا گوارا کیا۔ مثلاً ہوشنگ طرغول نے جس کو مارکسٹ لٹریچر تقسیم کرنے کے جرم میں اکتوبر ۱۹۷۱ء میں پھانسی کی سزا دی گئی تھی، فوجی عدالت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ:

> 'اس فیصلہ کن دور میں، میں اپنی زندگی کو بے پایاں مسرت کے ساتھ الوداع کہہ رہا ہوں۔ مجھ کو مستقبل میں اپنی فتح پر یقین ہے۔ ہاں میں زندگی سے ہاتھ دھو رہا ہوں مگر اس وجہ سے نہیں کہ میں بہت دن جی چکا ہوں بلکہ اس وجہ سے کہ وہ زندگی جو دوسروں کی عزت وناموس اور زندگی کے عوض حاصل کی جائے انتہائی کمینی زندگی ہوگی۔ میری رائے میں ایسی زندگی سے موت ہزار درجے شیریں ہے۔'[۵]

ایک اور مزدور جس کا نام کاوہ تھا، جب مزدوروں کے نمائندے کی حیثیت سے تقریر کرتے ہوئے پکڑا گیا اور ساواک نے اس کو اس شرط پر رہا کرنے کا وعدہ کیا کہ وہ اس کا جاسوس بن جائے تو کاوہ نے جواب دیا:

'میں پانچ سال کی عمر سے اپنی روزی خود کمار ہا ہوں۔ اگر مجھے فیکٹری میں کام نہیں ملا تو میں نے بوجھ اٹھایا۔ وہ بھی ممکن نہ ہوا تو میں نے چوری کی۔ اگر چوری کی ہمت نہ ہوتی تو میں بیواؤں کا دلال بن جاتا لیکن جو تم کہتے ہو میں وہ کبھی نہیں کر سکتا۔'

ساواک کے مظالم کی شہادتیں اب اتنی عام ہو چکی ہیں کہ ان کے بارے میں کسی شک شبے کی گنجائش باقی نہیں۔ تہران کے اخباروں بالخصوص 'کیہان' اور 'اطلاعات' میں ان بدنصیبوں کی تصویریں آئے دن چھپتی رہتی ہیں جو ساواکیوں کے مقدمے میں بطور گواہ پیش ہوتے ہیں۔ جسمانی اذیتوں اور قید کے شکار افراد انقلابی عدالتوں میں اپنے ٹوٹے ہوئے اعضا اور داغ داغ بدن کو لے کر بطور گواہ آتے ہیں۔ ایک بیس سالہ جوان نے ساواک کے ایک سارجنٹ کو عدالت میں مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ 'تم مجھ کو جانتے ہونا؟ ذرا میرے جسم کے جوڑوں کو دیکھو جو، اب بیکار ہو چکے ہیں۔ ذرا میرے بدن کے زخموں کو دیکھو جو آج تک نہیں بھرے ہیں۔ ملزم وہ رات یاد کر کے کانپ گیا جس رات اس نوجوان پر یہ ستم ڈھایا گیا تھا۔'[۱۶]

ڈاکٹر لیسین رضوی، رضا شاہ کو صاف بچالے جاتے ہیں مگر شاہ کی بے گناہی کا پردہ اس کے وزیر خارجہ اور معتمد خاص عباس علی خلعت باری نے چاک کر دیا۔ انقلابی عدالت میں جب اس پر یہ الزام لگایا گیا کہ تم نے سی۔ آئی۔ اے اور ساواک کے ایجنٹوں کو وزارتِ خارجہ میں چھپ کر کام کرنے کی اجازت دی تو اس نے کہا کہ مجھ کو 'اوپر' سے ہدایت ملی تھی۔ میں مجبور تھا۔ اس نے یہ انکشاف بھی کیا کہ شاہ خود غداری کا مرتکب تھا۔ اس نے کئی آدمیوں کو تو اپنے ہاتھ سے گولی ماری ہے۔[۱۷]

ساواک کا دائرہ عمل ایران تک محدود نہ تھا بلکہ ساواک کی شاخیں ہر اس ملک میں تھیں جہاں ایرانی طلبا پڑھنے جاتے تھے یا جہاں ایرانیوں کی کوئی بستی موجود تھی۔ ساواک کے آدمی طلبا

کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے کی غرض سے ایرانی سفارت خانوں ہی سے منسلک نہیں ہوتے تھے بلکہ مخبروں کو طالب علموں میں شامل کر دیا جاتا تھا۔ ان مخبر طالب علموں کو عام طالب علموں سے چوگنا وظیفہ (بارہ سو ڈالر ماہانہ) ملتا تھا۔ انہیں مخبروں کے ڈر سے ایرانی طلبا جرمنی، برطانیہ، فرانس اور امریکہ میں شاہ کے خلاف مظاہرہ کرتے وقت چہروں پر نقاب ڈالے رہتے تھے۔

حوالہ جات

1-Fred Halliday, *op. cit.*, p.72.

۲۔ ڈاکٹر یٰسین رضوی، 'ایران: آریہ مہر سے آیت اللہ تک' (کراچی، ۱۹۷۹ء)، ص ۶۷۔

3- *Amnesty International Briefing*, November, 1979.

۴۔ ڈاکٹر یٰسین رضوی، محولا بالا، ص ص ۶۷۔ ۶۸۔

5- T. Jalil, *op. cit.*

6- *Time* (New york), 23 April, 1979.

7- *Ibid.*

پہلوی دور کی سیاسی تنظیمیں

ایرانی قوم کے سیاسی شعور سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا۔ لیکن ایران میں سیاسی تنظیم کی روایت بہت کمزور رہی ہے۔ حتیٰ کہ مشروطہ کے دورِ عروج میں بھی کسی ملک گیر سیاسی جماعت کا سراغ نہیں ملتا۔ سرفروشوں کا ایک انبوہ ضرور تھا اور مقامی رہنما بھی تھے مگر ترکی، مصر، ہندوستان یا انڈونیشیا کی مانند ایران میں ایسی شخصیتیں نہیں ابھریں جو قومی تحریک کی علامت سمجھی جاتیں یا جن کی قیادت کو سب لوگ تسلیم کرتے۔ تھوڑی بہت کوشش آذربائیجان میں ہوئی لیکن وہ بہت عارضی تھی۔ ۱۹۲۰ء میں 'تودہ' پارٹی قائم ہوئی جو یقیناً ملک گیر منظم جماعت تھی مگر تودہ ۱۹۲۸ء سے اب تک خلافِ قانون جماعت ہے لہٰذا اس کا دائرہ اثر قدرتی طور پر بہت محدود رہا ہے۔ سیاسی جماعتوں کی عدم موجودگی کے باعث لوگوں کی باقاعدہ سیاسی تربیت نہیں ہوسکی اور نہ اُن کو واضح نصب العین کی بنیادوں پر کبھی منظم کیا جاسکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مجلس شورائی ملی کی رکنیت ہو یا وزارتیں سفارتیں، سب چند بااثر خاندانوں میں گردش کرتی رہیں۔

مجلس کے انتخابات میں کامیاب ہونے والے، خاندانی تعلقات یا ذاتی مفادات کے پیشِ نظر اپنے حلقے بنالیتے تھے اور سودے بازی شروع ہوجاتی تھی۔

رضا شاہ اوّل مطلق العنان بادشاہ تھا۔ اس کے عہد میں تقریر، تحریر اور تنظیم پر کڑی پابندی تھی لہٰذا سیاسی جماعتیں بنانا ممکن نہ تھا۔ البتہ اس کی معزولی کے بعد شہری آزادی بحال ہوئی تو پہلی بار ملک میں ایسے مواقع پیدا ہوئے جن میں سیاسی تنظیمیں بن سکتی تھیں۔ چنانچہ 'تودہ' پارٹی کے علاوہ 'ایران پارٹی'، ملا کاشانی کی 'فدائیان اسلام'، خلیل ملک کی 'نیروئے سوم' (Third Force) ڈاکٹر مظفر بقائی کی 'حزب زحمت' 'کشان ملت ایران' اور 'پین ایران' پارٹی وجود میں آئی۔ فاشسٹوں کی ایک تنظیم سومکا پارٹی جس کو رضا شاہ نے ہٹلر کے اشارے پر بنوایا تھا، پہلے سے موجود تھی۔ اُس کے کارکن نازیوں کی سی وردی پہنتے تھے اور آریاؤں کی نسلی بڑائی کا پرچار کرتے تھے۔ جبہ ملی (نیشنل فرنٹ) جس کو عالمی شہرت نصیب ہوئی، اکتوبر ۱۹۴۹ء میں بنا مگر وہ کئی پارٹیوں کا متحدہ محاذ تھا۔ جبہ ملی کے بانی اور قائد ڈاکٹر محمد مصدق تھے۔

ڈاکٹر مصدق ۱۸۷۹ء میں تہران میں نوابوں کے خاندان میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد اعلیٰ سرکاری افسر تھے اور ان کی والدہ قاچار شہزادی تھیں۔ کچھ عرصے وزارتِ مال میں ملازمت کے بعد وہ ۱۹۰۶ء میں اعلیٰ تعلیم کی غرض سے پیرس چلے گئے۔ ۱۹۱۳ء میں انہوں نے قانون میں ڈاکٹری کی ڈگری سوئزرلینڈ سے حاصل کی اور وطن واپس آ گئے۔ ۱۹۱۵ء میں وہ تیسری مجلس شوریٰ کے رکن منتخب ہوئے اور اکتوبر ۱۹۲۱ء میں احمد قوام السلطنت کی کابینہ میں وزیرِ مال مقرر ہوئے۔ جنوری ۱۹۲۲ء میں کابینہ کے مستعفی ہونے کے بعد اُن کو آذربائیجان کا گورنر جنرل بنا دیا گیا اور پھر جون تا اکتوبر ۱۹۲۳ء وہ وزیرِ انصاف رہے۔

جنوری ۱۹۲۴ء میں جس وقت ڈاکٹر مصدق پانچویں مجلس کے رکن منتخب ہوئے تو وزیر اعظم رضا خاں سپہ دار احمد شاہ قاچار کو ہٹا کر خود بادشاہ بننے کی فکر میں تھا۔ چنانچہ نومبر ۱۹۲۵ء میں اس غرض سے ایک بل مجلس کی منظوری کے لیے پیش کیا گیا۔ ڈاکٹر مصدق نے اس تجویز کی شدت سے مخالفت کی اور کہا کہ رضا خان بحیثیت وزیر اعظم ہم کو قبول ہے لیکن بادشاہ بن کر وہ ڈکٹیٹر ہو جائے گا۔ اس تقریر کا ملک میں بہت چرچا ہوا اور لوگوں نے ڈاکٹر مصدق کی اخلاقی جرأت، حب الوطنی اور اصول پرستی کو بہت سراہا۔

اسی دوران میں اُن کی چار پانچ کتابیں بھی شائع ہوئیں جن کا تعلق مالیات اور قانون سے تھا۔

۱۹۳۰ء میں اُن کو سیاسی سرگرمیوں کے باعث احمد آباد میں نظر بند کر دیا گیا جو تہران سے سو کلومیٹر دور اُن کا آبائی گاؤں تھا۔ ۱۹۴۰ء میں وہ دوبارہ قید ہوئے اور پہلے تہران جیل میں رکھے گئے بعدِ ازاں پولیس کی حراست میں اُن کو بیر جند منتقل کر دیا گیا جو مشرقی ایران میں چھوٹا سا قصبہ ہے۔ ان کی رہائی ستمبر ۱۹۴۱ء میں عمل میں آئی۔ ۱۹۴۱ء میں ڈاکٹر مصدق ایک بار پھر تہران سے مجلس کے رکن منتخب ہوئے۔ اس سال اکتوبر میں انہوں نے ایوان میں ایران کی خارجہ پالیسی پر تقریر کرتے ہوئے ایران میں برطانوی ریشہ دوانیوں پر کڑی نکتہ چینی کی اور اینگلو ایرانی آئل کمپنی نے ایران کی تیل کی دولت سے جو فائدے اٹھائے تھے اُن کو اعداد و شمار سے ثابت کیا۔ برطانوی طرزِ عمل کا موازنہ سوویت یونین سے کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ سوویت یونین کی فراخدلی کا ہم نے ہمیشہ اعتراف کیا ہے۔ ڈاکٹر مصدق نے ایران اور سوویت یونین کے ۱۹۲۱ء کے معاہدے کی چند دفعات بھی پڑھ کر سنائیں اور کہا کہ بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود سے ہمدردی کی اس سے بہتر مثال نہیں ملتی۔[۲]

نومبر ۱۹۴۴ء میں وزیر اعظم سعید مراغئی کے مستعفی ہونے پر مجلس کے بہت سے ارکان نے ڈاکٹر مصدق کو وزیر اعظم بننے پر آمادہ کرنا چاہا مگر ڈاکٹر مصدق کی شرط یہ تھی کہ میری مجلس کی رکنیت برقرار رہے۔ آئین میں اس کی گنجائش نہ تھی لہٰذا بات آئی گئی ہوگئی۔ دسمبر ۱۹۴۴ء میں انہوں نے مجلس میں ایک مختصر بل پیش کیا جس کے بموجب حکومت تیل کے مراعات کے سلسلے میں کسی بیرونی طاقت سے گفت و شنید یا معاہدے کے مجاز نہ تھی۔ یہ بل بھاری اکثریت سے منظور ہوگیا۔ حالانکہ مجلس میں ڈاکٹر مصدق کے ساتھیوں کی تعداد ۲۵ سے زیادہ نہ تھی۔

ڈاکٹر مصدق اعتدال پسند سیاستداں تھے۔ سوشلسٹ یا کمیونسٹ نہ تھے۔ ان کا نصب العین آئینی ملوکیت تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ شاہ ایران اقتدارِ اعلیٰ کی رسمی علامت کے طور پر فقط بادشاہت کرے جبکہ عنانِ اقتدار مجلس کے منتخب شدہ ارکان کے ہاتھ ہو۔ مجلس کے انتخابات آزادانہ ہوں اور لوگوں کو تقریر، تحریر اور اجتماع کے بنیادی حقوق حاصل ہوں۔ ان کے خیال میں ملک کی اقتصادی حالت درست کرنے کا واحد طریقہ یہ تھا کہ تیل کی صنعت کو قومی ملکیت بنا دیا جائے۔ چنانچہ اپنے نصب العین کو تنظیمی شکل دینے کی غرض سے ڈاکٹر مصدق نے اکتوبر ۱۹۴۹ء

میں چند ہم خیال سیاستدانوں کو اپنے گھر مدعو کیا۔ سولہویں مجلس کے انتخابات ہونے والے تھے لہٰذا اس نجی صحبت میں یہ مسئلہ بھی زیرِ بحث آیا اور ایک محضر شاہ کے نام تیار کیا گیا۔ اس محضر میں پچھلے انتخابات میں جو دھاندلیاں ہوئی تھیں، اُن کی نشاندہی کی گئی تھی اور آئندہ کے ملیے آزاد انتخاب کی ضمانت کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ پبلک میں اقتصادی پریشانیوں کی وجہ سے جو بے چینی پھیلی ہوئی تھی اس کا بھی تفصیل سے ذکر تھا۔ ۱۴ر اکتوبر کو یہ لوگ ڈاکٹر مصدق کی قیادت میں پیدل شاہی محل گئے۔ وہاں انہوں نے محضر پیش کیا اور دھرنا دے کر بیٹھ گئے کہ خاطر خواہ جواب لیے بغیر واپس نہیں جائیں گے۔ ڈاکٹر مصدق کے اس اقدام سے سارے شہر میں سنسنی پھیل گئی۔

کچھ دن بعد سولہویں مجلس کا انتخاب ہوا تو ڈاکٹر مصدق اور ان کے بہت سے رفیق کامیاب ہوگئے اور انہوں نے اپنا ایک حلقہ 'وطن' کے نام سے بنایا جو جبۂ ملی کا دراصل نقشِ اوّل تھا۔ انہیں دنوں اینگلو ایرانی آئل کمپنی سے ضمنی معاہدے کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ وزیرِاعظم رزم آرا معاہدے کے حق میں تھا جب کہ ڈاکٹر مصدق برابر مطالبہ کررہے تھے کہ تیل کی صنعت کو قومی ملکیت بنا دیا جائے۔ مجلس میں یہ بحث جاری تھی کہ ۷ مارچ ۱۹۵۱ء کو 'فدائین اسلام' کے ایک رکن خلیل طہماسپ نے رزم آرا کو گولی مار کر ہلاک کردیا۔ تب ۲۹ر اپریل کو ڈاکٹر مصدق وزیرِ اعظم مقرر ہوئے اور تیل کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا۔

ڈاکٹر مصدق کو ڈاکٹر حسین فاطمی اور حسین مکی دو بڑے لائق رفیق ملے تھے۔ ڈاکٹر فاطمی بہت اچھے صحافی اور خطیب تھے اور تہران کے ایک با اثر گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ڈاکٹر مصدق نے اُن کو وزیرِ خارجہ اور مجلس میں جبۂ ملی کا قائد مقرر کردیا۔ حسین مکی بڑے عالم فاضل مؤرخ اور تاریخِ ایران پر کئی مستند کتابوں کے مصنف تھے۔ وہ یزد کے ایک تاجر گھرانے سے آئے تھے۔ وہ پہلے ایران اسٹیٹ ریلوے میں ملازم ہوئے، پھر تہران کے نائب میئر بنے اور مجلس کے رکن چنے گئے۔

جبۂ ملی میں دائیں بازو کی نمائندگی ایران پارٹی کرتی تھی جو ۱۹۴۴ء میں بنی تھی۔ اس کا سلوگن (نعرہ) تھا، 'روزگار، انصاف اور آزادی'۔ ایران پارٹی کھاتے پیتے تعلیم یافتہ شہریوں کی

جماعت تھی اور اس کا حلقہ اثر سرکاری ملازمین، انجینئروں اور ڈاکٹروں تک محدود تھا۔ اس کا جھکاؤ امریکہ کی طرف تھا۔ چنانچہ جبہۂ ملی کے ٹوٹنے کے بعد اس نے جنرل آئزن ہاور کی خارجہ پالیسی کی باقاعدہ حمایت کی اور ڈاکٹر مصدق کی برطرفی کے بعد شاہ نے تیل کا جو نیا معاہدہ امریکہ اور مغربی یورپ کی کمپنیوں (کنسورشیم) سے کیا، ایران پارٹی نے اس کو منظور کرلیا اور میثاق بغداد (سینٹو) کی بھی تائید کی۔ مارچ ۱۹۷۵ء میں جب شاہ نے رستخیز پارٹی بنائی تو ایران پارٹی فوراً اس میں ضم ہوگئی۔

اگست ۱۹۵۳ء کے کودیتا کے بعد جب بے شمار محبانِ وطن مارے گئے یا قید کردیے گئے تو ڈاکٹر مصدق کے چند جاں باز رفقاء نے 'نہضت آزادیٔ ایران' کے نام سے ایک خفیہ تنظیم بنائی۔ اس تنظیم کا ایک خفیہ اخبار بھی تھا، (راہِ مصدق)، مگر ستمبر ۱۹۵۷ء میں محاذِ مقاومت کے بہت سے کارکن پکڑ لیے گئے اور اخبار بھی بند ہوگیا۔ جولائی ۱۹۶۰ء میں جبہۂ ملی کی سرگرمیاں دوبارہ شروع ہوئیں اور جبہۂ ملی کی جانب سے ایک بیان شائع ہوا کہ اس کی از سرِ نو تنظیم کی گئی ہے اور جبہۂ ملی بیسویں مجلس کے انتخابات میں شرکت کرے گا۔ اس وقت بھی جبہۂ ملی کا متحدہ محاذ ایران پارٹی، پین ایران پارٹی، نیروئے سوم اور نہضت آزادیٔ ایران پر مشتمل تھا۔ البتہ 'حزب زحمت کشان ملت ایران' اور طاوس کو جبہۂ ملی میں شامل نہیں کیا گیا تھا۔

مجلس کے انتخابات کے بعد بھی ایران کی سیاسی فضا بدستور مکدر رہی۔۔۔ مئی ۱۹۶۱ء میں درسگاہوں کے اساتذہ کی شورش شروع ہوئی۔ وہ بڑھتی ہوئی مہنگائی کے پیشِ نظر تنخواہوں میں اضافے کا مطالبہ کررہے تھے۔ ان کی ہڑتال ہوئی تو طلبا اور جبہۂ ملی کے کارکن بھی ان کے مظاہروں میں شامل ہوگئے۔۔۔ حسبِ معمول پولیس نے تشدد سے کام لیا اور بہت سے مظاہرین گرفتار کرلیے گئے۔ البتہ اس بحران میں وزارت ٹوٹ گئی اور شاہ نے ڈاکٹر علی امینی کو وزیراعظم مقرر کیا۔ ڈاکٹر امینی نے ہر قسم کے جلسے جلوسوں پر پابندی لگادی۔

لیکن جنوری ۱۹۶۲ء میں تہران یونیورسٹی کے طلبا نے ڈاکٹر مصدق کی بحالی اور مجلس کے نئے انتخابات کے حق میں زبردست مظاہرہ کیا اور یونیورسٹی سے باہر جلوس بنا کر نکلے۔ ان کے مقابلے کے لیے فوج طلب کی گئی۔ فوج نے طلبا پر گولی چلائی، درجنوں نوجوان مارے گئے یا زخمی

ہوئے اور بہت سے گرفتار کر لیے گئے۔ جبہ ملی کے اُن رہنماؤں کو بھی پکڑ لیا گیا جن کا رابطہ طلبا سے تھا۔

اُن دنوں جبہ ملی کی قیادت کے فرائض تہران یونیورسٹی کے چند پروفیسر انجام دے رہے تھے۔ مثلاً مہدی بازارگان جو انجینئرنگ کے پروفیسر اور تین کمپنیوں میں حصے دار تھے۔ ڈاکٹر شاپور بختیار جو آخر میں شاہ سے مل گئے تھے نصرت اللہ امین جو قانون کے پروفیسر تھے اور ڈاکٹر حسین فاطمی کے بھتیجے ڈاکٹر سعید فاطمی سابق پروفیسر ادبیات اُن کو ۱۹۵۳ء میں ڈاکٹر مصدق کے ہمراہ گرفتار کر لیا گیا تھا اور ۱۹۵۷ء میں رہا ہوئے تھے۔ ڈاکٹر مصدق قید سے چھٹنے کے بعد ہر چند کہ سیاست سے کنارہ کش ہو گئے تھے لیکن ان کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ جبہ ملی ہنوز اُن کو اپنا قائد تصور کرتا تھا۔ البتہ ۱۹۶۷ء میں ڈاکٹر مصدق کے انتقال کے بعد جبہ ملی میں اُن کے پیرو دو حصوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ نے پیرس کو اپنا مرکز بنایا اور دوسرے نے قاہرہ کو۔

۱۹۷۷ء میں ایران میں اقتصادی بحران کے اثرات ظاہر ہونے لگے اور سیاسی بے چینی بھی بڑھی تو جبہ ملی کے تین ممتاز رہنماؤں — ڈاکٹر کریم سنجابی، شاپور بختیار اور داریوش فروہر — نے شاہ کو ایک کھلی چٹھی لکھی جس میں شاہ کی توجہ ملک کے بگڑتے ہوئے حالات کی طرف مبذول کرائی گئی تھی اور اُن کو آئین پر خلوصِ دل سے عمل کرنے اور شہری حقوق بحال کرنے کا مشورہ دیا گیا تھا لیکن شاہ کا دماغ ان دنوں آسمان پر تھا۔ وہ ان مشوروں کو کیوں مانتا۔

سرکاری پارٹیاں

۱۹۵۷ء اس اعتبار سے خاص اہمیت رکھتا ہے کہ شاہ نے اسی سال ملک پر براہِ راست حکومت کرنے کا مصمم فیصلہ کیا اور اپنے طرزِ عمل سے بھی واضح کر دیا کہ آئندہ جو میں چاہوں گا وہی ہوگا۔ چنانچہ اب وہ ہر ماہ حکومت کے ترجمان کی حیثیت سے پریس کانفرنس کرنے لگے۔ اسی سال ساواک کا قیام عمل میں آیا اور اسرائیل سے دوستانہ تعلقات کو مزید تقویت دی گئی۔ اب مجلسِ شوریٰ کا انتخاب ہو یا وزیراعظم کی تقرری، برطرفی، نظم و نسق کے تمام مسائل شاہ کی مرضی سے طے پانے لگے۔ چنانچہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ وزیراعظم نے ایک بار کسی بحث کے دوران

بھری مجلس میں اعتراف کرلیا کہ میں اظہار رائے سے معذور ہوں کیونکہ مجھ کو اس بارے میں شاہی ہدایات موصول نہیں ہوئی ہیں۔[۵۳]

اسی سال شاہ نے امریکہ کی تقلید میں 'دو پارٹی سسٹم' کے مطابق ملیون اور مردم دو پارٹیاں بنائیں جو دراصل ایک ہی کمرے کے دو دروازے تھے۔ ملیون کے سربراہ وزیر اعظم منوچہر اقبال مقرر ہوئے اور مردم پارٹی کے اسد اللہ عالم جو شاہ کے دوست اور بہت بڑے زمیندار تھے۔ ان پارٹیوں کی تشکیل کے موقع پر شاہ نے اعلان کیا کہ عنانِ وزارت آئندہ اُسی پارٹی کے سپرد کی جائے گی جس کو مجلس میں اکثریت حاصل ہوگی اور اقلیتی پارٹی کو حزب اختلاف کا کردار ادا کرنا ہوگا۔ مجلس کے اختیارات کی وضاحت کرتے ہوئے شاہ نے کہا کہ مجلس میں ملک کی داخلی پالیسی پر بحث کی جاسکتی ہے لیکن خارجہ پالیسی پر بحث ومباحثہ مجلس کے اختیار سے باہر ہے۔ ان پارٹیوں کی تشکیل پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈونلڈ ولبر جو تہران کے امریکی سفارتخانے میں سیاسی مشیر اور ایران فاؤنڈیشن کا ڈائریکٹر تھا، لکھتا ہے کہ 'شاہ کو بخوبی علم تھا کہ لوگ جانتے ہیں کہ یہ پارٹیاں ان پر اوپر سے تھوپی گئی ہیں پھر بھی ان کو ان پارٹیوں میں شامل ہونے کی ترغیب دی گئی۔'[۵۴]

اگست ۱۹۶۰ء میں بیسویں مجلس کے انتخابات ہوئے تو ملیون اور مردم کے لیڈروں نے شاہ کے اشارے پر ایک خفیہ سمجھوتہ کرلیا۔ چنانچہ انتخاب کے نتیجے کا اعلان ہوا تو ملیون کے دو تہائی امید وار کامیاب ہوئے اور مردم کے ایک تہائی۔ جبہ ملی کا ایک امید وار بھی کامیاب نہیں ہوا۔ اس کھلم کھلا دھاندلی پر ملک میں اتنا شور مچا کہ شاہ کو مجبوراً انتخابات کالعدم قرار دینے پڑے۔ جنوری ۱۹۶۱ء میں انتخابات ہوئے مگر جبہ ملی نے اس کا بائیکاٹ کیا۔ اسی اثنا میں مئی میں اساتذہ کی زبردست ہڑتال ہوئی۔ ہر چند کہ یہ ہڑتال تنخواہیں بڑھانے کے لیے کی گئی تھی لیکن اس نے جلد ہی سیاسی شکل اختیار کرلی۔ جبہ ملی اور طلبا بھی ہڑتال میں شامل ہوگئے اور اب ان کا مطالبہ تھا کہ جنوری کے انتخابات کالعدم قرار دیئے جائیں اور نئے سرے سے آزاد انتخابات ہوں۔

۲۲ویں اور ۲۳ویں مجلس کے انتخابات کے نتائج بھی چنداں مختلف نہ تھے۔ ۲۲ویں مجلس میں ملیون کے ۱۷۸/اور مردم پارٹی کے ۲۹ نمائندے کامیاب ہوئے جبکہ ۲۳ویں مجلس میں ان کے نمائندوں کی تعداد علی الترتیب ۲۲۹ اور ۳۷ تھی مگر ان پارٹیوں کو عوام میں کبھی

مقبولیت نصیب نہیں ہوئی۔ کیونکہ ہر شخص جانتا تھا کہ یہ دونوں پارٹیاں شاہ کی چمچو ہیں اور دونوں کا مقصد شاہ کے استبدادی عزائم کی بجا آوری ہے۔ ۲۴ ویں مجلس کے انتخاب کے وقت شاہ نے دو پارٹی سسٹم کا تکلف بھی ختم کردیا اور 'رستخیز ملت ایرانیاں' کے پُرشکوہ نام سے خود اپنی پارٹی بنالی۔ یہ پارٹی یکم مارچ ۱۹۷۵ء کو وجود میں آئی۔ اس کی تشکیل کا اعلان کرتے ہوئے شاہ نے کہا:

'ہم کو ان ایرانیوں میں جو آئین، تاج اور ۶ر بہمن کے انقلاب (زرعی اصلاحات) میں یقین رکھتے ہیں اور اُن میں جو یقین نہیں رکھتے، فرق کرنا چاہیے۔ ہم آج ایک نئے ڈھانچے کی بنیاد رکھنے والے ہیں اور وہ ہے رستخیز ملت ایران۔ لہٰذا ہر اُس ایرانی کو جس نے اپنی پوزیشن واضح کردی ہے یعنی وہ آئین، تاج اور بہمن کے انقلاب کا وفادار ہے اس سیاسی تنظیم میں شامل ہوجانا چاہیے۔'

اس شاہی فرمان کی دیر تھی کہ دوسرے ہی دن ملیون، مردم، ایران پارٹی اور پین ایران چاروں رستخیز میں ضم ہوگئیں۔ وزیر اعظم امیر عباس ہویدا رستخیز کے سیکرٹری جنرل مقرر ہوئے اور ۵ ستمبر ۱۹۷۵ء کو جب ۲۴ ویں مجلس کا افتتاح ہوا تو مجلس اور سینیٹ کے سب کے سب ارکان رستخیز کے نمائندے نکلے۔ ہویدا نے مارچ ۱۹۷۶ء میں رستخیز کی سالانہ رپورٹ پیش کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ رستخیز کے عام ممبروں کی تعداد ۲۲ لاکھ ہے۔ گویا ایران کا ہر تیسرا شخص رستخیزی تھا۔ رستخیز کے ممبروں کی تعداد خواہ ۲۲ لاکھ تھی یا ۲۲ سو مگر یاروں نے رستخیز کی آڑ میں خوب خوب عیش کیے۔ پارٹی کے ۳ کروڑ ۱۲ لاکھ ڈالر (۳۱ کروڑ ۲۰ لاکھ روپیہ) سالانہ بجٹ کا اس سے بہتر مصرف اور کیا ہوسکتا تھا۔

مجلس شورائی ملی اور سینیٹ کے اراکین نے فروری انقلاب کے زمانے میں جو کردار ادا کیا اُس سے ہر شخص واقف ہے۔ مگر ایران کے کسی وطن پرست حلقے کو شاہ کے ان جی حضوری غلاموں سے اس سے بہتر کردار کی توقع بھی نہ تھی۔ ان کی غلامانہ ذہنیت کی ادنیٰ مثال وہ تقریریں ہیں جو مجلس کے اراکین، ایوان میں کرتے تھے۔ مثلاً ایک رکن نے کہا:

'میں آدمی نہیں ہوں بلکہ ایک ادنیٰ کارکن ہوں۔ اعلیٰ حضرت شہنشاہ آریہ مہر میری دیرینہ وفاداری اور خدمت گزاری سے واقف ہیں۔ انہوں نے حکم دیا کہ میں مجلس

کا، رکن منتخب ہوں اور اب مجھ کو فخر ہے کہ میں شہنشاہ کا غلام اور سپاہی ہوں۔[۵]

اور مجلس میں مزدوروں کے ایک 'نمائندہ' بخشی نے اعلان کیا کہ:

'شہنشاہ آریہ مہر کو پوری ایرانی قوم بالخصوص ایرانی کاریگروں کا سلامِ عقیدت پہنچے کہ انہوں نے ہماری غلامی کی زنجیریں توڑ دیں اور ہم کو آزادی عطا کی۔'[۶]

طلبہ کی تحریک

ایران کی قومی آزادی کی تحریک میں طلبا بالخصوص تہران یونیورسٹی کے طلبا برابر پیش پیش رہے ہیں۔ ۱۹۵۲ء۔ ۱۹۵۳ء میں شاہ اور جبہۂ ملی کے تصادم میں انہوں نے مسلسل جبہۂ ملی کا ساتھ دیا بلکہ ڈاکٹر مصدق کی برطرفی کے بعد فوجی دہشت گردی کے زمانے میں بھی اُن کے قدم پیچھے نہیں ہٹے۔ انہوں نے ۷ دسمبر ۱۹۵۳ء کو تہران میں مارشل لاء کے خلاف زبردست مظاہرہ کیا جس میں فوجی پولیس کی فائرنگ سے تین طالب علم شہید اور بہت سے زخمی ہوئے۔ اسی طرح ۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۳ء کے درمیان طلبا اور فوجی پولیس میں متعدد بار تصادم ہوا۔ تب طلبا کی سرگرمیوں کا سدِباب کرنے کے لیے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں فوجی پولیس کے دستے خاص طور پر متعین کیے گئے لیکن اس کا اثر اُلٹا ہوا۔ طلبا میں حکومت سے نفرت اور بڑھ گئی۔ ۱۹۶۹ء میں وہ ایک بار پھر حرکت میں آئے۔ اب کے انہوں نے بسوں کے کرائے میں اضافے کے خلاف احتجاجی مظاہرے شروع کیے۔ اس کے بعد تو مظاہروں کا تانتا بندھ گیا اور شاید ہی کوئی مہینہ ایسا گزرا جس میں تہران یونیورسٹی کے کسی نہ کسی شعبے میں ہڑتال نہ ہوئی ہو۔ بعض اوقات تو یونیورسٹی کئی کئی مہینے بند رہی اور ہوسٹلوں کو بھی خالی کروالیا گیا مگر یہ تدبیریں بھی کارگر نہ ہوئیں چنانچہ ۱۹۷۷ء کے اکتوبر، نومبر میں تو تہران اور دوسرے شہروں کے طلبا سیاسی مطالبات کے حق میں سڑکوں پر نکل آئے اور درسگاہیں غیر معینہ مدت کے لیے بند ہوگئیں۔

ایرانی طلبا کی جدوجہد اندرونِ ملک تک محدود نہ تھی بلکہ امریکہ، برطانیہ، جرمنی، فرانس غرضیکہ وہ جہاں کہیں تعلیم پاتے تھے، شاہ کے جبر واستبداد کے خلاف پروپیگنڈہ کرنا اپنا قومی فرض سمجھتے تھے۔ وہ اخبار اور پمفلٹ شائع کرتے، ایرانی سفارتخانوں کے سامنے مظاہرے

کرتے (منہ پر نقاب ڈال کر تا کہ ساواک کے آدمی اُن کو پہچان نہ سکیں) اور پارلیمنٹ کے ممبروں، اخباروں کے ایڈیٹروں اور شہری آزادی کے کارکنوں سے مل کر ان کو ایران کی حقیقی صورتحال سے مطلع کرتے تھے۔ انہوں نے مغربی جرمنی میں ایرانی سفارتخانے پر ایک بار قبضہ کر کے وہاں پر ساواک کی جو خفیہ دستاویزیں ہاتھ آئی تھیں ان کو شائع کر دیا تھا۔

اپریل ۱۹۶۲ء میں شاہ امریکہ گئے تو ایرانی طلبا نے اُن کی پکٹنگ کی۔ وہ واشنگٹن کی شاہی گزرگاہ پر جھنڈے اٹھائے کھڑے تھے۔ ان جھنڈوں پر لکھا تھا کہ 'شاہ سے مصافحہ مت کرو۔ اس کے ہاتھ بیگناہوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔' نومبر ۱۹۷۷ء میں واشنگٹن جاتے وقت شاہ ایرانی طلبا سے اتنے خوفزدہ تھے کہ وہ کئی سو بھاڑے کے 'طلبا' ہوائی جہازوں میں بھر کر اپنے ساتھ لے گئے تا کہ یہ لوگ واشنگٹن میں شاہ کا خیر مقدم کریں لیکن وطن پرست ایرانی طلبا کے جوش و خروش کے پہلے ہی ہلے میں شاہ کے آدمی بھاگ کھڑے ہوئے اور امریکی پولیس کو اشک آور گیس پھینک کر طلبا کو منتشر کرنا پڑا۔ اس حادثے کی جو تصویریں اخباروں میں چھپیں اُن میں شاہ کو آنسو پونچھتے دکھایا گیا تھا۔

شاہ کے آخری دنوں میں بیرونِ ملک تعلیم پانے والے طلبا کی تعداد اسی ہزار سے تجاوز کر گئی تھی۔ ڈونلڈ ولبر کے بقول ان کی غالب اکثریت شاہ کی مخالف تھی اور ڈاکٹر مصدق کو اپنا قومی ہیرو تسلیم کرتی تھی۔ ولبر نے امریکہ میں مقیم ایرانی طلبا کے ایک اخبار کا اقتباس دیا ہے جس سے طلبا کے جذبات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اخبار لکھتا ہے کہ:

> 'ڈاکٹر مصدق ایرانی عزت اور وطنیت کی زندہ علامت ہیں اور اُن کو اب بھی نوے فیصد ایرانیوں کی حمایت حاصل ہے۔ آزاد انتخابات میں اُن کو اور ان کے ساتھیوں کو نوے فیصد ووٹ ملیں گے۔ ۹۵ فیصد طلبا وطن پرست اور مصدقی ہیں۔ امریکی حکومت شاہ ایران جیسے اپنے پٹھوؤں کی پشت پناہی کرتی ہے۔'

ڈونلڈ ولبر شاہ کا زبردست حامی ہے مگر اس کو بھی ماننا پڑا کہ طلبا کی اکثریت کا میلان بائیں بازو کی جانب ہے اور وہ ہرگز نہیں چاہتے کہ ان کا ملک امریکہ کا خیمہ بردار بن جائے یا فوجی معاہدوں میں ملوث ہو۔

اسی زمانے میں ایرانی طلبا میں ایک گروہ مسلح جدو جہد کے حامیوں کا پیدا ہوا۔ یہ نوجوان فلسطین کے مجاہدینِ آزادی اور جنوبی امریکہ کے گوریلا لیڈر چے گویرا سے بہت متاثر تھے۔ ویت نام کی جنگِ آزادی میں امریکیوں کی شکست نے بھی ان کے حوصلے بہت بڑھا دیئے تھے اور وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ شاہ کی مسلح طاقت کو مسلح طاقت ہی سے شکست دی جاسکتی ہے۔ ان کو یہ احساس تو تھا کہ مٹھی بھر مسلح جانباز شاہ کی فوج کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور نہیں کر سکتے لیکن ان کا راسخ عقیدہ تھا کہ دہشت انگیزی سے شاہی حلقوں میں خوف وہراس پھیلے گا ارر عوام کے حوصلے بلند ہوں گے۔ چنانچہ ۱۹۶۶ء میں اس مقصد کے تحت ایک خفیہ تنظیم 'سازمان مجاہدینِ خلق' بنائی گئی جو 'نہضت آزادیٔ ایران' کی مسلح شاخ تھی۔ 'نہضت' دراصل جبۂ ملی ہی کے پرانے کارکنوں پر مشتمل تھی اور ڈاکٹر مصدق کی گرفتاری کے بعد وجود میں آئی تھی مگر ۱۹۵۸ء میں اُس پر تشدد پسند نوجوانوں کا غلبہ ہوگیا تھا اور انہوں نے جبۂ ملی کی بے عملی سے بیزار ہو کر ۱۹۶۱ء میں اُس سے قطع تعلق کرلیا تھا اور ڈاکٹر مصدق کے ایک تعارفی خط کے ساتھ اپنا الگ منشور بھی شائع کیا تھا۔

دوسری تنظیم جس کا جھکاؤ بائیں بازو کی طرف تھا۔ 'سازمان شرکاء فدائین خلق' کے نام سے مشہور ہوئی۔ 'فدائین خلق' کا رابطہ مجاہدین فلسطین سے تھا اور اس کے کئی سرگرم کارکنوں نے فلسطین میں چھاپہ مار لڑائی کی تربیت پائی تھی۔

مجاہدینِ خلق اور فدائینِ خلق کی سرگرمیوں کا آغاز کئی سال کی تربیت اور مشق کے بعد ۱۹۷۱ء میں ہوا۔ چنانچہ مجاہدین نے ۸ فروری کو پہلا مسلح حملہ تہران کے شمال میں سیاہ کُل کے پولیس تھانے پر کیا۔ اس تصادم میں پندرہ مجاہد مارے گئے لیکن دوسرے حملے میں انہوں نے فوجی عدالت کے وکیلِ خاص جنرل فارسیو کو گولی مار کر ہلاک کردیا۔ (اپریل) اگست ۱۹۷۲ء میں ساواک کا ایک افسرِ اعلیٰ جنرل طاہری فدائین کے ہاتھوں مارا گیا۔ جون ۱۹۷۳ء میں مجاہدین نے امریکی سفارت کے فوجی افسر کرنل لوئس ہاکنس کو گولی کا نشانہ بنایا۔ اگست ۱۹۷۴ء میں فدائین نے مصطفیٰ فاتح نامی صنعت کار کو جس کی فیکٹری میں ہڑتال کے موقع پر کئی مزدور مارے گئے تھے، قتل کردیا اور مئی ۱۹۷۵ء میں یہی حشر آریہ مہر یونیورسٹی تہران کی پولیس گارڈ کے سرغنہ اور شہریاری غدار کا ہوا جو تُودہ پارٹی میں شامل ہوکر ساواک کی مخبری کرتا تھا۔ مئی ۱۹۷۵ء میں

امریکی ایئر فورس کے دو کرنل مارے گئے اور اگست ۱۹۷۶ء میں امریکہ کے خفیہ تحصیلات کے تین افسر قتل ہوئے۔ سرکاری اطلاعات کے مطابق فروری ۱۹۷۱ء اور اگست ۱۹۷۶ء کے درمیان ۵۵ سرکاری افسر گولیوں کا نشانہ بنے۔

فدائین اور مجاہدین عموماً خوشحال گھرانوں کے پڑھے لکھے نوجوان ہوتے تھے۔ ان کی سرگرمیوں کا مرکز تہران، تبریز اور مشہد کی یونیورسٹیاں تھیں۔ اُن کی ڈسپلن بہت سخت اور تنظیم نہایت خفیہ تھی۔ اُن کی صفوں میں لڑکے بھی شامل تھے اور لڑکیاں بھی مگر ان کی آٹھ سالہ مسلح جدوجہد کے دوران اخلاقی بے راہ روی کا ایک واقعہ بھی پیش نہیں آیا۔ ایک اندازے کے مطابق کم از کم تین سو نوجوان فوج سے تصادم میں کام آئے لیکن ان جانبازوں کی تعداد جن کو قید خانوں میں ہولناک اذیتیں دے کر ہلاک کیا گیا، اس سے کہیں زیادہ ہے۔

حوالہ جات

1- Donald Wilber, *Contemporary Iran* (London, 1963), p.68.
2- *Ibid.*, p.48.
3- *Ibid.*, p.118.
4- *Ibid.*, p.127.
5- James Alban Bills, *The Politics of Iran,* cited in R. T. Jalil, *op. cit.*
۶۔ کیہان، ۹/ اکتوبر ۱۹۷۶ء۔

ایران کی سوشلسٹ تحریک

ایران کی بیداری میں روس کی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی اور روسی ادیبوں کی تحریروں نے جو اہم کردار ادا کیا اس کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں۔ ایرانی دانشوروں اور ادیبوں میں آئین، جمہوریت اور حقوقِ انسانی کا شعور روس، بالخصوص روسی قفقاز سے رابطے ہی کے باعث بڑھا۔ چنانچہ پروفیسر براؤن کا سا سوویت دشمن مورخ بھی اس اعتراف پر مجبور ہے کہ ۱۹۰۵ء کے ناکام روسی انقلاب نے ایرانیوں کو اتنی قوت بخشی کہ وہ شاہ سے دستور اساسی حاصل کر سکے۔[1]

ایران میں سوشلسٹ خیالات کی ترویج و اشاعت سب سے پہلے ۱۹۰۶ء میں تہران کے چھاپہ خانوں کے مزدوروں میں شروع ہوئی۔ ان مزدوروں نے ایران میں پہلی ٹریڈ یونین بنائی اور ایک سوشلسٹ پرچہ 'اتفاق کارگراں' کے نام سے جاری کیا۔ رفتہ رفتہ ٹریڈ یونینوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا اور ۱۹۲۲ء میں فقط تہران میں ۲۲ ٹریڈ یونین موجود تھیں جن کے ممبروں کی مجموعی تعداد بیس ہزار تھی۔[2]

لیکن سوشلسٹ تحریک کا اصل مرکز تبریز تھا۔ اس لیے کہ ہزاروں آذر بائیجانی مزدور روسی آذر بائیجان میں تفلس اور باکو کے مقام پر تیل کے ہی کارخانوں میں کام کرتے تھے۔ وہاں ان

کا ملنا جلنا روسی ٹریڈ یونین اور بالشویک پارٹی کے کارکنوں سے ہوتا تھا۔ یہ تارکینِ وطن جب وطن واپس آتے تھے تو اشتراکی خیالات اور مطبوعات بھی اپنے ہمراہ لاتے تھے...... ۲۳ جون ۱۹۰۸ء کو جب محمد علی شاہ قاچار نے ملک میں مارشل لاء نافذ کر کے مجلس کو توڑ دیا تو تبریز والوں نے شاہ کی ان استبدادی کارروائیوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ اس بغاوت کا سرغنہ ایک نوجوان حیدر خاں عمواد غلو تھا۔ بغاوت کے ناکام ہونے کے بعد وہ باکو چلا گیا اور ایرانی مزدوروں میں کام کرنے لگا۔ وہاں اس نے قفقاز کے ایرانی مزدوروں کی ایک سیاسی جماعت بنائی جس کا نام 'حزبِ عدالت' تھا۔ اس پارٹی کی خفیہ شاخیں رفتہ رفتہ تبریز اور رشت وغیرہ میں بھی قائم ہوگئیں اور ۱۹۱۶ء میں حزب عدالت کے ممبروں کی تعداد سولہ ہزار تک پہنچ گئی۔ سید جعفر پیشہ وری جو بعد میں کمیونسٹ پارٹی کا لیڈر بنا، حزب عدالت ہی میں کام کرتا تھا۔ حزب عدالت کو قفقاز کی بالشویک پارٹی کا پورا پورا تعاون حاصل تھا۔

۱۹۱۷ء میں جب روس میں انقلاب آیا تو ایران کے آزادی خواہوں کے حوصلے بڑھ گئے چنانچہ ادبیاتِ ایران کا مؤرخ لکھتا ہے کہ:۔

'روس کا سوشلسٹ انقلاب تاریخِ انسانی میں ایک نئے باب کا آغاز تھا۔ اس انقلاب نے خاص طور پر کشور ایراں کی سرنوشت پر اور یہاں کے سیاسی اور اقتصادی حالات پر گہرا اثر ڈالا۔ بلکہ یہ انقلاب ایران کی آزادی اور داخلی اور خارجی سیاست کو متاثر کرنے والے عوامل میں سے تھا۔ انقلابِ روس دراصل ایران کی آزادی کی بقا کا باعث ثابت ہوا۔ اگر یہ انقلاب برپا نہ ہوتا تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ایران کو کیا کیا صدمے برداشت کرنے پڑتے اور آج ایران اور ترکی کا وجود بھی نہ ہوتا۔'[۳۲]

بالشویک پارٹی نے جس کا مسلک ابتدا ہی سے محکوم اور نیم محکوم ملکوں کی مکمل آزادی تھا، دسمبر ۱۹۱۷ء میں روس اور برطانیہ کے خفیہ معاہدے کو مسترد کر دیا اور اس معاہدے کی رو سے روس کو جو مراعات ایران میں حاصل تھیں روس ان سے دستبردار ہوگیا۔ ایران میں تعینات روسی فوجیں واپس بلا لی گئیں۔ ایران پر روس کے جو قرضے تھے سوویت روس نے ان کو منسوخ کر دیا

اور ایران میں ریلوے، تار اور دوسری روسی تنصیبات بلا معاوضہ ایران کے حوالے کر دی گئیں۔

ایرانیوں کو توقع تھی کہ سوویت یونین کے ان فیصلوں کے بعد انگریزی فوجیں بھی ایران کو خالی کر دیں گی اور انگریزی حکومت ایرانی سیاست میں مداخلت سے باز آ جائے گی لیکن اشتراکی انقلاب برطانوی استعماریت کے حق میں بہت بڑا خطرہ تھا۔ لہٰذا انگریزوں نے اپنی انقلاب دشمن سرگرمیوں کے لیے ایران کو اپنا مستقل اڈہ بنا لیا۔ برطانوی فوجیں قفقاز ہی کے راستے ایران میں داخل ہوتیں اور زار پرست روسی عناصر کی مدد کرتیں۔ اب ایران مکمل طور پر برطانیہ کے طابع تھا۔ تہران میں وثوق الدولہ کی حکومت انگریز مشیروں کے اشارے پر چلتی تھی جو ہزاروں کی تعداد میں مختلف شعبوں میں نگران متعین تھے۔ اگست ۱۹۱۹ء میں انگریزوں نے احمد شاہ کو سیر و تفریح کے لیے باہر بھیج دیا اور وثوق الدولہ کے ساتھ ایک معاہدہ کر لیا جس کی رو سے ایران کی وہی حیثیت ہوگئی جو مصر اور عراق کی تھی مگر اس معاہدے کے خلاف تہران، تبریز، رشت اور دوسرے مقامات پر زبردست احتجاج ہوا اور ہر طرف 'مرگ انگلیس مرگ بر دولت انگلیس ماب وثوق الدولہ' کا شور مچ گیا۔ وثوق الدولہ نے ہزاروں آزادی خواہوں کو پکڑ کر قید کر دیا مگر وہ مجلس سے اس معاہدے کی توثیق نہ کروا سکا۔

اینگلو ایرانی معاہدے کا گیلان اور آذربائیجان کے صوبوں میں ردعمل بہت شدید ہوا۔ گیلان میں ایک قوم پرست گروہ مرزا کوچک خاں کی قیادت میں ۱۹۱۶ء سے مصروف عمل تھا۔ یہ گروہ جو غریب کسانوں اور کھیت مزدوروں پر مشتمل تھا، گیلان کے جنگلوں میں چھپ کر لڑتا رہا تھا اور اسی مناسبت سے اپنے آپ کو 'جنگلی' کہتا تھا۔ یہ لوگ 'جنگلی' کے نام سے ایک اخبار بھی شائع کرتے تھے۔ مرزا کوچک خاں گیلان کے دارالحکومت رشت میں پیدا ہوا تھا۔ مسلح جدو جہد کی تربیت اس نے باکو اور تفلس میں حاصل کی تھی مگر وہ سوشلسٹ نہ تھا۔ بلکہ اتحادِ اسلام کا داعی تھا۔

جنگلیوں نے جب یہ دیکھا کہ تہران کی حکومت اب بالکل ہی انگریزوں کی غلام ہوگئی ہے تو انہوں نے مرزا کوچک خان، احسان اللہ اور خالو قربان کی قیادت میں ۴ جون ۱۹۱۹ء کو رشت پر قبضہ جما لیا۔ وہاں انہوں نے 'انقلاب سرخ' نامی ایک تنظیم بنائی اور گیلان کی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اس اثنا میں حیدر خاں عمو اوغلو اپنے پچاس رفیقوں کے ہمراہ جنگلیوں سے آن

ملے۔ ۲۰ جون کو عدالت پارٹی کی کانگریس رشت میں منعقد ہوئی جس میں گیلان کے ۴۸ نمائندوں نے شرکت کی۔ اسی کانگریس میں عدالت پارٹی کا نام بدل کر 'حزب کمیونسٹ ایران' رکھا گیا۔

گیلان کی جمہوری حکومت وطن پرستوں اور کمیونسٹوں کا متحدہ محاذ تھی۔ اس حکومت کا صدر کمیسار اور کمیسار جنگ مرزا کوچک خاں تھا۔ نئی حکومت نے اپنا جو منشور شائع کیا وہ حالات کے مطابق بہت اعتدال پسندانہ تھا۔ مثلاً ایران کی سالمیت اور آزادی کا تحفظ، برطانوی امپیریل ازم سے جنگ، ملک میں جمہوری حکومت کا قیام، تمام سامراجی معاہدوں کی تنسیخ، تمام قوموں کے لیے مساوی حقوق، زمین کے مالکوں کی جائداد میں تخفیف اور عام ایرانیوں کے جان و مال کا تحفظ۔

مگر سید جعفر زادہ پیشہ وری کا گروہ جو باکو سے آیا تھا اور مقامی حالات ناواقف تھا، بائیں بازو کی انتہا پسندی کا شکار ہوگیا۔ ان لوگوں نے فتح کے نشے میں متحدہ محاذ کے تقاضوں کو نظر انداز کردیا اور من مانی کرنے لگے۔ اس وجہ سے متحدہ محاذ میں پھوٹ پڑ گئی۔ مرزا کوچک خاں ناراض ہوکر ستمبر ۱۹۱۹ء میں جنگل واپس چلے گئے اور انگریزوں سے ساز باز کرنے لگے۔ نئی حکومت میں احسان اللہ خاں، صدر کمیسار اور کمیسارِ امورِ خارجہ مقرر ہوئے اور پیشہ وری نے کمیسار اطلاعات کا عہدہ سنبھالا۔

رشت کی حکومت نے انتہا پسندی کے جوش میں سوشلسٹ انقلاب کا نعرہ بلند کیا حالانکہ یہ سلوگن بہت قبل از وقت تھا کیونکہ ابھی تک امپیریل ازم اور فیوڈل ازم سے لڑائی جاری تھی اور ایرانی عوام کا ذہن سوشل ازم کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ زمینیں غریب کاشتکاروں میں تقسیم کرنے کے بجائے قومی ملکیت قرار دے دی گئیں۔ نجی تجارت ممنوع ہوگئی۔ گھریلو صنعت کے ادارے بند کردیئے گئے۔ ملاؤں پر سختیاں شروع ہوگئیں اور امیر اور غریب ملاؤں میں بھی فرق نہیں کیا گیا۔ حکومت کی انتہا پسندانہ حرکتوں سے انقلاب کو سخت دھکا لگا اور گیلان کی حکومت عوام کا اعتماد کھو بیٹھی۔

تب کیمونسٹ پارٹی کو اپنی کج رویوں کا احساس ہوا اور ۱۹۲۰ء میں پیشہ وری کی جگہ حیدر

اوغلو پارٹی کے نئے قائد منتخب ہوئے، انہوں نے مولویوں کے خلاف مہم فوراً بند کروادی اور متحدہ محاذ کو بحال کرنے کی غرض سے مرزا کوچک خاں کو دوبارہ سربراہ حکومت اور کمسیار مالیہ مقرر کیا اور خود کمسیار امور خارجہ کا عہدہ سنبھالا۔ مرزا کوچک خاں کو جب رشت واپس آنے کا پیغام بھیجا گیا تو اس نے حیدر اوغلو کو لکھا کہ آپ میرے پاس آئیں تا کہ ہمارے درمیان جو اختلاف پیدا ہوگئے ہیں ان پر بات چیت کر لی جائے لیکن جب حیدر اوغلو اپنے کئی رفیقوں کے ہمراہ جنگل گئے تو کوچک خاں نے سبھوں کو قتل کر دیا۔ ان واقعات کی اطلاع رضا خاں سپہ دار کو ملی اس نے نومبر ۱۹۲۰ء میں رشت پر حملہ کر دیا۔ رشت اور انزلی میں انقلابیوں کا قتلِ عام ہوا۔ مرزا کوچک خاں بھی مارا گیا اور اس کا سر تہران بھیج دیا گیا۔ جعفر زادہ پیشہ وری نے باکو میں پناہ لی۔

آذربائیجان کی جمہوری ری پبلک کا بھی یہی حشر ہوا۔ اس ری پبلک کا سربراہ ایک معمولی مولوی شیخ محمد خیابانی تھا۔ وہ دوسری مجلس شوریٰ میں تبریز کی جانب سے حزب دیموکرات کا رکن رہ چکا تھا۔ ۱۹۱۱ء میں جب تہران میں پکڑ دھکڑ شروع ہوئی تو خیابانی عشق آباد چلا گیا۔ کچھ عرصے کے بعد تبریز واپس آیا اور کاروبار کرنے لگا۔ انقلاب روس کے بعد جب آذربائیجان میں خود مختاری کی تحریک نے زور پکڑا تو خیابانی نے حزب دیموکرات کو جو چار پانچ سال سے بے عمل پڑی تھی دوبارہ منظم کیا اور ایک پرچہ بھی 'تجدد' کے نام سے جاری کیا۔ اس پرچے کی بدولت خیابانی کو تبریز کے بیشتر روشن فکر ادیبوں کا تعاون حاصل ہوگیا۔ ان دنوں تہران میں وثوق الدولہ برسرِ اقتدار تھا۔ وہ آذربائیجان کی صوبائی خود مختاری کے سخت خلاف تھا۔ چنانچہ اس نے جمہوریت پسندوں کی تحریک کو کچلنے کی غرض سے فوج روانہ کی۔ یہ خبر جب تبریز پہنچی تو آذربائیجانیوں نے مکمل آزادی کا اعلان کر دیا اور اپنی نئی ریاست کا نام آزادیستان رکھا۔ خیابانی نے اس فیصلے کی تشریح کرتے ہوئے اخبار 'تجدد' میں لکھا کہ:

> 'تبریز کی خواہش ہے کہ حاکمیت قوم کے ہاتھ میں رہے۔ ایران کا گوشہ گوشہ اپنے قول اور فعل سے اسی کا تقاضا کر رہا ہے۔ ہر چند کہ تہران اس نظریے کو تسلیم کرنے سے گریز کر رہا ہے لیکن ہم ریڈیکل ازم کے اصولوں پر چل کر ایران کی تجدید کر کے دم لیں گے۔ ہم کہتے ہیں کہ جمہوریت کی حاکمیت پورے

ایران پر جاری ہو۔ ہر علاقے کے باشندے اپنی رائے کا آزادی سے اعلان کریں۔ اس حق کے بچاؤ کا آخری مرحلہ موت ہے اور ہم اس راہ میں مرنے کو بے شرمانہ زندگی پر ترجیح دیتے ہیں۔'

لیکن خیابانی میں نظم ونسق کی صلاحیت بالکل نہ تھی اور نہ اس کو انقلاب کے معاشرتی تقاضوں کا شعور تھا۔ اس نے ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا جس سے آذر بائیجانیوں کے دل میں نئی حکومت سے وفاداری کا جذبہ پیدا ہوتا۔ اس نے اپنے ہمسایہ گیلان کی انقلابی حکومت سے بھی رابطہ قائم نہیں کیا اور نہ تبریز کی حفاظت کا کوئی بندوبست کیا۔ بلکہ جب شاہی فوجیں تبریز کے قریب پہنچیں تو خیابانی نے فوج کے کماندار حاجی مخبر السلطنت ہدایت کو تبریز میں قیام کرنے کی اجازت دے دی۔ حاجی ہدایت نے اپنے ایجنٹوں کے ذریعے مقامی لشکریوں سے چپکے چپکے راہ ورسم بڑھائی اور ایک دن موقع پا کر حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ خیابانی اور اس کے رفقا مارے گئے۔ آذر بائیجان کا انقلاب ناکام ہوگیا۔

دو سال بعد ابو القاسم لاہوتی اور خالو قربان نے ایک بار پھر مسلح بغاوت کی کوشش کی اور تبریز کے بعض سرکاری دفتروں پر قبضہ بھی کر لیا لیکن یہ بغاوت دس دن میں ختم ہوگئی۔ ابو القاسم لاہوتی اور خالو قربان ترکِ وطن کر کے سوویت یونین چلے گئے۔

وثوق الدولہ نے قزاق ڈویژن کے سالار رضا خاں کو گیلان اور آذر بائیجان کی بغاوتوں کو کچلنے کا فریضہ سپرد کیا تھا۔ دراصل اس وقت تہران کے پاس قزاق دستوں کے علاوہ فوج تھی ہی نہیں۔ رضا خان نے تہران واپس آ کر انگریزوں سے سازش شروع کی اور سید ضیاء الدین طبا طبائی کی مدد سے ۲۰ فروری ۱۹۲۱ء کو وثوق الدولہ کو حکومت سے الگ کر دیا اور کابینہ کے سب ارکان اور دو سو کے قریب ممتاز سیاستدانوں کو گرفتار کر لیا۔ رضا خاں خود وزیرِ جنگ بنا اور ضیاء الدین کو وزیر اعظم مقرر کیا مگر تمام اختیارات رضا خاں کے ہاتھ میں تھے۔ وہ جس کو چاہتا وزیر بناتا اور جس کو چاہتا الگ کر دیتا۔ چنانچہ دو سال کی مدت میں چھ وزارتیں بنیں اور ٹوٹیں اور جب رضا خاں نے اپنی پوزیشن مستحکم کر لی تو ۲۸ / اکتوبر ۱۹۲۳ء کو خود وزیر اعظم بن بیٹھا اور ۳۱ / اکتوبر کو قاچار خاندان کی بادشاہت کو مجلس کی منظوری سے ختم کر دیا۔ ابتدا میں وہ کمال اتاترک

کی مانند ایران کو ری پبلک بنانے کے حق میں تھا لیکن قم کے مجتہدوں نے ۲۹ مارچ ۱۹۲۴ء کو فتویٰ دیا کہ اسلام ری پبلک کی اجازت نہیں دیتا، تو رضا خاں کو بادشاہ بننے کا بہانہ ہاتھ آ گیا۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۲۵ء کو اس نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور رضا شاہ پہلوی کا لقب اختیار کیا۔

اس جوڑ توڑ کے دوران میں رضا شاہ کو کمیونسٹ پارٹی کی طرف توجہ دینے کا موقع نہیں ملا اور کمیونسٹ بھی حکومت سے براہ راست ٹکر لینے کی حکمت عملی کو ملتوی کر کے مزدوروں کی تنظیم میں مصروف ہو گئے۔ ۱۹۲۲ء میں ان کی تعداد پندرہ سو کے قریب تھی اور وہ زیادہ تر ٹریڈ یونینوں میں کام کرتے تھے۔ انہوں نے رفتہ رفتہ اتنا اثر و رسوخ پیدا کر لیا کہ تہران کی ٹریڈ یونین کونسل میں جو گیارہ یونینوں کا فیڈریشن تھی، ان کی اکثریت ہو گئی۔ ملک کے ترقی پسند ادیب اور شاعر بھی نظریاتی طور پر ان کے ہم خیال تھے۔ پارٹی کا ایک ہفت روزہ اخبار 'حقیقت' بھی تھا۔ اس کے علاوہ کئی دوسرے اخبار اور رسالے بائیں بازو کے خیالات کی تبلیغ کرتے تھے۔

رضا شاہ نے اپنے سیاسی حریفوں کو ٹھکانے لگانے کے بعد ۱۹۲۸ء میں کمیونسٹوں سے نمٹنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے ٹریڈ یونین کونسل اور اس سے ملحق تمام ٹریڈ یونینوں کو توڑ دیا اور کمیونسٹ پارٹی کو خلاف قانون جماعت قرار دے دیا۔ بیشتر کمیونسٹ لیڈر روپوش ہو گئے یا ملک سے باہر چلے گئے۔ اسی دوران میں کمیونسٹ پارٹی کی دوسری کانگرس یورمیا کے مقام پر ہوئی اور یہ طے پایا کہ پارٹی اپنی خفیہ سرگرمیاں فی الحال تبریز اور مشہد تک ہی محدود رکھے گی۔

یورپ میں ان دنوں مشرقی انقلابیوں کی سب سے بڑی پناہ گاہ برلن تھی۔ ایشیا کی سامراج دشمن لیگ کا صدر دفتر بھی وہیں تھا۔ چنانچہ بہت سے ایرانی انقلابیوں نے رضا شاہ کے جبر و تشدد سے بچنے کی خاطر برلن میں پناہ لی تھی۔ تقی ایرانی بھی جو پارٹی کے لیڈر تھے اور برلن یونیورسٹی سے فزکس میں پی۔ ایچ۔ ڈی کیا تھا، برلن چلے گئے تھے۔ جرمنی سے کمیونسٹوں کے دو پرچے بھی شائع ہوتے تھے۔ ایک 'ستارہ سرخ' جو لائبزیک میں چھپتا تھا اور دوسرا 'پیکار' جس کا دفتر برلن میں تھا۔ یہ پرچے ایران میں خفیہ طور پر تقسیم ہوتے تھے مگر ۱۹۳۳ء میں جب ہٹلر برسر اقتدار آیا تو یہ پرچے بند ہو گئے اور کمیونسٹوں کو جرمنی سے بھاگنا پڑا۔ ڈاکٹر ایرانی تقی پوشیدہ طور پر اپنے وطن تبریز واپس آئے مگر ۱۹۳۷ء میں ان کو معہ دوسرے کمیونسٹوں کے ۱۹۳۱ء کے

قانون کی خلاف ورزی کے جرم میں گرفتار کرلیا گیا۔ ڈاکٹر تقی ایرانی کا ۱۹۴۰ء میں جیل میں ہی انتقال ہوگیا۔ ۱۹۴۱ء میں جب رضا شاہ کی فاشزم نواز سرگرمیوں کا سدِ باب کرنے کی غرض سے سوویت یونین اور برطانیہ کی فوجیں ایران میں داخل ہوئیں اور رضا شاہ کو تخت سے ہٹا کر جنوبی افریقہ بھیج دیا گیا تو تمام سیاسی قیدیوں کو معافی مل گئی اور وہ رہا ہوگئے۔

اب کمیونسٹوں نے اپنی از سرِ نو تنظیم شروع کی۔ اکتوبر ۱۹۴۱ء میں پارٹی کی تیسری کانگرس ہوئی جس میں پارٹی کا نام 'حزبِ تُودہ' رکھا گیا اور یہ اعلان ہوا کہ 'حزبِ تُودہ ایران کے مزدوروں، کسانوں، دستکاروں اور جمہوریت پسند دانشوروں کی جماعت ہے جس کا فوری مقصد استحصال سے پاک ایک آزاد اور جمہوری معاشرہ قائم کرنا ہے۔'

تُودہ پارٹی نے مزدوروں کی تنظیم کی طرف خاص توجہ دی۔ اور ۱۹۴۳ء میں چودھویں مجلسِ شوریٰ کے انتخاب میں ان کو آذر بائیجان سے آٹھ نشستیں ملیں۔ ۱۹۴۴ء میں تُودہ کی پہلی کانگرس ہوئی جس میں ۱۶۸ ڈیلی گیٹوں نے شرکت کی۔ اس وقت تُودہ پارٹی کے ممبروں کی تعداد ۲۵ ہزار تھی۔

دوسری جنگ عظیم میں فاشزم کی شکست کے بعد بین الاقوامی سیاست میں طاقت کا توازن بڑی تیزی سے بدلا۔ سوشلسٹ قوتوں کے اثر و رسوخ اور اقتدار میں اضافے اور ایشیا اور افریقہ میں متعدد نئی آزاد ریاستوں کے قیام کی وجہ سے سامراجی طاقتوں کے مفاد کو زبردست دھکا لگا۔ برطانیہ، فرانس اور ہالینڈ وغیرہ میں اتنی سکت باقی نہ تھی کہ وہ اپنی کھوئی ہوئی پوزیشن واپس لاتے بلکہ اقتصادی بحالی کے لیے وہ خود امریکہ کے دستِ نگر ہوگئے تھے۔ لہٰذا دنیا میں سامراجی مفادات کی حفاظت کرنے اور اشتراکی جمہوری تحریکوں کو دبانے کی ذمے داری امریکہ نے لے لی جو ساری دنیا کو اپنا غلام بنانے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ مارشل پلان، ٹرومین ڈاکٹرین، سی۔ آئی۔ اے، فوجی معاہدے اور اقتصادی امداد وہ حربے تھے جن کے ذریعے امریکہ نے اپنے مقاصد پورے کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔

ایران میں جب کبھی عوامی تحریکوں کا زور ہوتا ہے تو صوبائی خودمختاری کا سوال بھی ضرور اٹھتا ہے۔ وہاں آذری، کرد، بلوچ، ترکمان اور عرب پانچ بڑی اقلیتیں موجود ہیں جو ملک کے

مخصوص علاقوں میں آباد ہیں اور وہاں ان کی غالب اکثریت ہے۔ ان قومیتوں کی زبان فارسی نہیں ہے اور وہ نسلی اعتبار سے بھی ایرانیوں سے مختلف ہیں۔ چنانچہ ۱۹۴۵ء میں آذر بائیجان اور کردستان میں صوبائی خودمختاری کے مطالبات شدت اختیار کرنے لگے۔ آذر بائیجان کی صوبائی خودمختاری کی تحریک کی قیادت جعفر پیشہ وری کررہے تھے، وہ ۱۹۳۶ء میں سوویت یونین سے خفیہ طور پر تبریز واپس آئے تھے مگر گرفتار کرلیے گئے۔ ۱۹۴۱ء میں رہائی کے بعد وہ تبریز سے تُودہ کا اخبار 'رہبر' شائع کررہے تھے اور ۱۹۴۳ء میں وہ تبریز سے مجلس شورائی ملی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ ۱۳ردسمبر ۱۹۴۵ء میں آذر بائیجان نے صوبائی خودمختاری کا اعلان کردیا۔ اس موقع پر حزب دیموکرات نے یہ مطالبات پیش کیے۔

۱۔ آذر بائیجان کے تمام اسکولوں میں آذری زبان ذریعہ تعلیم ہو۔

۲۔ آذری زبان کو فارسی کے پہلو بہ پہلو سرکاری زبان تسلیم کیا جائے۔

۳۔ تمام بینک قومی ملکیت بنادیے جائیں۔

۴۔ زمین کسانوں میں بانٹ دی جائے۔

صوبائی خودمختاری کے تحفظ کے لیے دو فوجی دستے بھی بنائے گئے۔

۱۔ قزلباش

۲۔ فدائین گر جورضا کاروں کی تنظیم تھی۔

۱۵ر دسمبر ۱۹۴۵ء کو کردستان میں بغاوت ہوئی، جس کا رہنما قاضی محمد تھا۔ وزیر اعظم قوام السلطنت نے آذر بائیجان کے مطالبات جون ۱۹۴۶ء میں مان لیے۔ یہ طے پایا کہ آذر بائیجان کی مجلس شورائی ملی صوبائی اسمبلی کے طور پر بدستور اپنا کام جاری رکھے گی۔ آذر بائیجان کے وزیر داخلہ کو صوبے کا گورنر بنادیا جائے گا اور اسکولوں میں فارسی کے پہلو بہ پہلو آذری زبان بھی پڑھائی جائے گی۔ قوام السلطنت نے اگست ۱۹۴۶ء میں تودہ کے تین ارکان کو کابینہ میں شامل کرلیا مگر یہ تمام مفاہمتی اقدامات قوام السلطنت کی زبردست چال تھی۔ وہ چپکے چپکے امریکہ سے ساز باز کررہا تھا اور اس بات کا منتظر تھا کہ روسی فوجیں ایران سے واپس جائیں تب آذر بائیجانیوں اور کردوں کو خودمختاری کا مزہ چکھایا جائے۔

اور جب روسی فوجیں واپس چلی گئیں تو قوام السلطنت نے ایک طرف امریکیوں کو دعوت دی اور دوسری طرف بختیاری اور قشقائی قبیلوں کو کمیونسٹوں کے خلاف بغاوت پر اکسایا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ تُودہ پارٹی کے وزیروں کو برطرف کردیا جائے اور تُودہ پارٹی کو خلاف قانون قرار دے دیا جائے۔ قوام السلطنت نے ان کے مطالبات فوراً مان لیے، تُودہ پارٹی کے وزرا برطرف کردیے گئے۔ تہران میں تودہ پارٹی کے دفتر کو آگ لگا دی گئی۔ تُودہ کے دونوں اخبار 'رہبر' اور 'ظفر' بند کردیے گئے۔ اور تمام ٹریڈ یونین جو تُودہ کے زیر اثر تھیں توڑ دی گئیں۔

نومبر ۱۹۴۶ء میں فوج کو آذربائجان پر قبضہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ دسمبر ۱۹۴۶ء میں آذربائجان کی خودمختاری ختم کردی گئی۔ بہت سے آذری جمہوریت پسند مارے گئے البتہ جعفر پیشہ وری باکو چلے گئے۔ آذربائجان سے فارغ ہوکر ایرانی فوج نے کردستان کا رخ کیا۔ کرد بڑی بہادری سے لڑے مگر ان کو شکست ہوئی اور قاضی محمد کو پھانسی دے دی گئی۔

آذربائجان اور کردستان کی صوبائی خودمختاری کی تحریکوں کو کچلنے کے بعد ایرانی حکومت تُودہ پارٹی اور ٹریڈ یونینوں کی مرکزی تنظیم کی طرف متوجہ ہوئی۔ چنانچہ ۱۹۴۸ء میں تُودہ پارٹی اور ٹریڈ یونین کی مرکزی تنظیم CUCWPI خلاف قانون جماعتیں قرار دے دی گئیں اور ہزاروں کمیونسٹ گرفتار کرلیے گئے۔ انہیں میں ظفر قہرمانی بھی تھے جو ۳۲ سال کے بعد ۱۹۷۹ء میں رہا ہوئے ہیں۔ دنیا میں آج تک کسی سیاسی اسیر نے اتنی لمبی قید کبھی نہیں کاٹی۔ قہرمانی جس وقت پکڑے گئے تھے تو ان کی بیٹی کی عمر دوڈھائی سال تھی اور اب رہا ہوئے ہیں تو ان کی بیٹی کی بیٹی کی عمر اتنی ہی ہے۔

۱۹۴۸ء میں جب ڈاکٹر مصدق نے جبہۂ ملی کی بنیاد ڈالی تو تُودہ پارٹی کے ایک عنصر نے جس کے ترجمان نورالدین کیانوری (پارٹی کے موجودہ قائد) تھے، جبہۂ ملی کا خیر مقدم کیا۔ ان کا خیال تھا کہ ڈاکٹر مصدق کی کمیونسٹ دشمنی کے باوصف تُودہ پارٹی کو جبہۂ ملی کا ساتھ دینا چاہیے کیونکہ یہ جمہوریت پسندوں کی تنظیم ہے۔ دوسرا عنصر جس کے ترجمان راز مانش تھے جبہۂ ملی سے تعاون کے خلاف تھا لیکن ۱۹۵۲ء میں اس نے بھی اپنا رویہ بدل دیا اور جبہۂ ملی کی حمایت کرنے لگا۔ ڈاکٹر مصدق کے دوسالہ دور میں تُودہ پارٹی پر سے قانونی پابندیاں تو نہیں ہٹیں پھر بھی پارٹی

کے کارکنوں کو آزادی سے کام کرنے کا تھوڑا بہت موقع ضرور مل گیا۔ ڈاکٹر مصدق کی برطرفی کے بعد شاہ کے عتاب کی بجلی کمیونسٹوں پر پھر گری اور تین ہزار سے زائد کمیونسٹ پھر گرفتار ہوئے۔

اس کے باوجود تودہ پارٹی کی سرگرمیاں جاری رہیں۔ پارٹی کا مرکزی دفتر اگر چہ برلن منتقل ہو گیا تھا لیکن ٹریڈ یونینوں، طالب علموں، ادیبوں اور صحافیوں کی تنظیموں سے پارٹی کا رابطہ برابر قائم رہا۔ ۱۹۵۷ء میں پارٹی کی چوتھی کانگرس منعقد ہوئی۔ اس موقع پر پارٹی نے اپنی سابقہ کج رویوں کا بھی جائزہ لیا اور اس بات کا علانیہ اعتراف کیا کہ پارٹی بورژوا وطنیت کی نوعیت اور اس کے سامراج دشمن امکانات کا احاطہ کرنے سے قاصر رہی ہے۔ اسی کانگرس میں شاہ کی آمریت کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنانے کا نعرہ بھی دیا گیا۔ متحدہ محاذ کے پروگرامز کی تشریح کرتے ہوئے نورالدین کیانوری نے اپنے ایک مضمون میں لکھا کہ ایران میں انقلاب ابھی ابتدائی مراحل میں ہے یعنی سامراج دشمن اور جمہوری مراحل میں لہٰذا تودہ پارٹی کو ان تمام عناصر کے متحدہ محاذ کی کوشش کرنی چاہیے جو شاہ کی حکومت سے نفرت کرتے ہیں خواہ ان کا تعلق دائیں بازو سے ہو یا بائیں بازو سے۔ کیانوری مزدوروں، کسانوں، دفتر کے کلرکوں، قومی سرمایہ داروں کے علاوہ ان بڑے سرمایہ داروں کو بھی متحدہ محاذ میں شامل کرنے کے حق میں تھے جن کا ربط ضبط بین الاقوامی سرمائے سے تھا۔ ان کا خیال تھا کہ مسلح افواج میں بھی ایسے ترقی پسند عناصر موجود ہیں جو وقت آنے پر جمہوری تحریکوں کا ساتھ دیں گے۔[۴۲]

متحدہ محاذ کے خطرات سے شاہ بخوبی واقف تھا۔ وہ کمیونسٹوں کو متحدہ محاذ بنانے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا لہٰذا ۱۹۵۸ء میں ایک بار پھر ان کی بڑے پیمانے پر پکڑ دھکڑ شروع ہوئی۔ اس دفعہ گرفتار ہونے والوں میں تودہ کی مرکزی کمیٹی کے رکن خسرو روزبہ بھی تھے۔ جس وقت ان پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا تو انھوں نے ججوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے دوست اور دشمن معترف ہیں کہ تودہ پارٹی ایران کی سب سے منظم اور با اصول پارٹی ہے اور آزادی کی جدوجہد میں ہمیشہ پیش پیش رہی ہے۔ اس کا انقلابی کردار اس کا طرۂ امتیاز ہے اور تودہ پارٹی کو فخر ہے کہ وہ عوام کی قوت پر تکیہ کرتی ہے اور عوام کے مفاد کی پاسباں ہے۔ خسرو روزبہ کو ۱۱ رمئی ۱۹۵۸ء کو فوجی عدالت کے حکم سے پھانسی دے دی گئی۔ اس وقت سے ایران

میں ۱۱ر مئی کا دن سیاسی قیدیوں کی یادگار کے طور پر منایا جاتا ہے۔

شاہ نے اپنے دورِ حکومت میں تودہ پارٹی کے کارکنوں پر جو ظلم توڑے ان کی داستان بہت طویل ہے۔ کمیونسٹوں کو قید کی میعاد پوری ہونے کے بعد بھی رہا نہیں کیا جاتا تھا چنانچہ پارٹی کے دو رہنما پرویز حکمت جُو اور علی خاور ۱۹۶۶ء میں گرفتار ہوئے۔ ان کی سزا کی مدت جب ۱۹۷۴ء میں ختم ہوگئی تو پرویز حکمت جُو کو جیل ہی میں قتل کر دیا گیا۔

سرکاری رپورٹ سے

مسودے کی کتابت ہو چکی تھی کہ خانۂ فرہنگ ایران میں ایک سرکاری تصنیف ہماری نظر سے گذری جس کا نام 'ایران میں کمیونزم کا ارتقا' ہے۔[۵] یہ دستاویز جنرل تیمور بختیاری کی نگرانی میں ۱۹۵۹ء میں تہران سے شائع ہوئی تھی۔ جنرل بختیاری ان دنوں تہران کے فوجی گورنر اور ساواک کے پہلے سربراہ تھے۔ دیباچہ بھی انہیں نے لکھا ہے۔ مصنف نے جو گمنام ہے یہ تاثر دیا ہے کہ اگر جنرل بختیاری نے بروقت کمیونسٹوں کا قلع قمع نہ کر دیا ہوتا تو ایران میں قیامت آ جاتی۔ کتاب میں تُودہ پارٹی کے حالات تو مختصر بیان کیے گئے ہیں البتہ بڑی سائز کے ۴۲۰ صفحات میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ تُودہ پارٹی قزاقوں کا ٹولہ تھی جس کا کام قتل، چوری، ڈاکہ اور لوٹ مار کرنا تھا۔ بہر حال اس کتاب سے تُودہ کے جو حالات اخذ ہو سکے ہیں درج ذیل ہیں۔

حزبِ تُودہ کی تشکیل ان ۵۳ کمیونسٹوں کی تحریک پر ہوئی تھی جن کو رضا شاہ اوّل نے ۱۹۳۷ء میں قید کر دیا تھا۔ ایرج سکندری، جعفر پیشہ وری اور نورالدین کیانوری ان کے سرغنہ تھے۔ اگست ۱۹۴۱ء میں رضا شاہ کی تخت سے دست برداری کے بعد جب سیاسی قیدیوں کو عام معافی ملی تو یہ لوگ بھی رہا ہوئے اور ستمبر ۱۹۴۱ء میں حزبِ تُودہ قائم ہوئی۔ پارٹی کا پہلا منشور ایرج سکندری اور جعفر پیشہ وری نے جیل میں لکھا تھا۔ تُودہ کے پہلے صدر ایرج سکندری کے چچا سلیمان محسن سکندری تھے جو مشروطہ کی تحریک میں نام پیدا کر چکے تھے اور ڈیموکریٹک پارٹی کے لیڈر تھے مگر کمیونسٹ نہ تھے۔

یہ زمانہ دوسری عالمگیر جنگ کا تھا لہٰذا تُودہ کی سرگرمیوں کا مرکز اور مقصد ایرانیوں کو

فاشزم کے خلاف جدو جہد پر آمادہ کرنا تھا۔ تُودہ نے عوام میں بہت جلد مقبولیت حاصل کرلی۔ چنانچہ فروری ۱۹۴۲ء میں کمیونسٹ رہنما ڈاکٹر ارنی کی دوسری برسی کے موقع پر تہران میں جو مظاہرہ ہوا اس میں ہزاروں شہریوں نے شرکت کی۔ تُودہ کی پہلی پارٹی کانگرس ۱۹۴۴ء کے موسم گرما میں منعقد ہوئی۔

تُودہ کے دفاتر اور کلب سارے ملک میں پھیلے ہوئے تھے۔ تہران، شیراز، تبریز اور مشہد کے علاوہ اصفہان اور خزستان کے صوبوں میں تُودہ کا بڑا زور تھا کہ یہ دونوں صوبے صنعتی مزدوروں کا مرکز تھے۔ خزستان میں تُودہ کی شاخیں ابادان، اہواز، آغا جانی، بندر مشہور، بیہان اور مسجد سلیمان میں موجود تھیں۔

ابتدا میں تُودہ کے کارکن زیادہ تر ایرانی ورکرز یونین میں کام کرتے تھے۔ ان کا لیڈر رضا رستی تھا۔ بعد میں رضا رستی کی کوششوں سے ایرانی مزدوروں کی ایک وفاقی تنظیم سینٹرل یونائیٹڈ کونسل کے نام سے قائم ہوئی اور پہلے ہی سال کونسل میں شریک ہونے والی یونینوں کے ممبروں کی تعداد ایک لاکھ پچاس ہزار ہوگئی۔ اس کے بعد اصفہان کے ۱۷ ہزار مزدور بھی اس میں شامل ہوگئے۔ ۱۹۴۹ء میں جب رضا شاہ پہلوی کے حکم سے کونسل کو خلافِ قانون جماعت قرار دے دیا گیا تو اس کی رکنیت چار لاکھ تھی۔ کونسل کی طاقت کا اعتراف کرتے ہوئے جنرل بختیاری نے لکھا ہے کہ 'رضا رستی کی رہنمائی میں کونسل گیلان، ماژندران اور اصفہان کے علاقوں پر حکومت کرتی تھی۔'[6]

تُودہ کے چار اخبار شائع ہوتے تھے (۱) 'رہبر' جس کے ایڈیٹر ایرج سکندری تھے (۲) 'مردم' جس کے ایڈیٹر احسان طبری تھے (۳) 'ظفر' جس کے ایڈیٹر رضا رستی تھے (۴) 'رزم' نظریاتی ماہنامہ تھا۔ رہبر کی اشاعت بہت زیادہ تھی۔

۱۹۴۵ء۔ ۱۹۴۶ء میں آذر بائیجان اور کردستان میں صوبائی خودمختاری کی تحریک شروع ہوئی تو تُودہ نے اس تحریک کی حمایت کی۔ جس پر حکومت نے تُودہ کے اخبارات اور اس کے کلبوں کو بند کردیا۔ مگر جولائی ۱۹۴۶ء میں قوام السلطنت نے تُودہ کے تین نمائندوں کو وزارت میں شریک کرلیا اور تعلیم، آرٹ، تجارت اور حفظانِ صحت کے محکمے ان کے سپرد کردیئے۔ ایرج

سکندری وزیر تعلیم مقرر ہوئے۔

تودہ کی دوسری پارٹی کانگرس ۱۹۴۸ء میں منعقد ہوئی۔ اس موقع پر ۱۹؍ افراد کی ایک مرکزی کمیٹی چنی گئی جس میں ایرج سکندری، نور الدین کیانوری، خسرو روزبہ، رضا رستی، ڈاکٹر رعد منش اور احسان طبری قابل ذکر ہیں۔

۱۵؍ بہمن ۱۳۲۴ شمسی ہجری (فروری ۱۹۴۹ء) کو تہران میں امام زادہ عبداللہ کے مقام پر تودہ پارٹی نے ڈاکٹر ارنی کی یاد میں ایک جلسہ کیا جس میں دس ہزار آدمیوں نے شرکت کی۔ اسی دن کسی شخص نے شاہ پر حملہ کیا تو شاہ نے تودہ پارٹی، مزدوروں کی کونسل اور جمہوری عورتوں کی انجمن کو خلاف قانون جماعت قرار دے دیا۔ تودہ پارٹی کے دس سربرآوردہ لیڈر گرفتار کر لیے گئے۔ تودہ کے اخبارات اور کلب بند ہوگئے۔ ان دس لیڈروں پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلا اور ان کو لمبی لمبی سزائیں دی گئیں، لیکن دوسرے ہی سال یہ اشخاص قید خانہ قصر سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ حکومت کے بیان کے مطابق کمیونسٹ لیڈروں کی رہائی چونکہ فوجی افسروں کی سازش سے عمل میں آئی تھی لہٰذا پانچ سو فوجی افسر گرفتار ہوئے۔ ان پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلا اور ۲۷؍ افسروں کو سزائے موت سنائی گئی۔ 'ان کو جس وقت گولی ماری جارہی تھی تو اس وقت بھی وہ کمیونسٹ نعرے لگا رہے تھے۔'[۲۵] ۱۳۴؍ فوجیوں کو عمر قید، ۱۱۹؍ کو پندرہ سال، ۹۷ کو دس سال، ۷ کو آٹھ سال، ۵ کو سات سال، ۳۵ کو پانچ سال اور ۳۹ کو تین سال قید کی سزا دی گئی۔

تُودہ پارٹی کا نقطۂ نظر

۱۹۷۸ء۔۱۹۷۹ء کے انقلاب کے زمانے میں ہر چند کہ تُودہ پارٹی بدستور خلاف قانون جماعت تھی اور اس کے لیڈر جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے لیکن تُودہ پارٹی نے انقلابی جدوجہد میں بھرپور شرکت کی۔ ذیل میں ہم تُودہ کے سابق جنرل سیکریٹری ایرج سکندری، سیکریٹری حمید سفری اور موجودہ جنرل سیکریٹری نور الدین کیانوری کے انٹرویو 'احتساب' (لاہور) سے بہ شکریہ نقل کر رہے ہیں۔ یہ انٹرویو ستمبر اور نومبر ۱۹۷۸ء میں اور جنوری ۱۹۷۹ء میں امریکی اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔

ایرج سکندری

سوال:۔ کیا آپ ایران کی موجودہ تحریک کے کردار پر روشنی ڈالیں گے۔ وہ تحریک جو ستمبر کے اوائل سے ایرانی حکومت سے کھلم کھلا متصادم ہے؟

جواب:۔ پچھلے چند مہینوں سے ایران کے اندر شہنشاہ کی آمریت کے خلاف تحریک بڑی تیزی سے زور پکڑتی جارہی ہے۔ ہماری پارٹی کے لیے یہ کوئی حیران کن واقعہ نہیں ہے۔ ہماری پارٹی نے تین سال پہلے اپنے ایک اجلاس میں اس صورتِ حال پر غور کیا تھا اور ہمیں اندازہ ہورہا تھا کہ ایران میں جمہوری اور قومی تحریک عنقریب ابھرنے والی ہے کیونکہ صنعتی اداروں میں ہڑتالیں، طلبا میں بے چینی، دانشوروں کا اضطراب اور قومی سرمایہ داروں کی بڑھتی ہوئی بے اطمینانی، سب ایک نئے دور کی نشان دہی کررہے تھے۔

یہ درست ہے کہ اُس وقت کوئی شخص واضح طور پر یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ تحریک آگے چل کر کیا شکل اختیار کرے گی۔ اگر اس تحریک پر فی الحال مذہبی رجحانات کا غلبہ ہے تو اس کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش نہیں کرنا چاہیے۔ ایران کے شیعہ مذہبی رہنما جو نچلے اور درمیانہ طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں ظاہر ہے کہ ملک کی صورت حال اور عوام کی زبوں حالی سے لاتعلق نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ عوام کو آمریت کے خلاف ابھارنے پر مجبور تھے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ایران میں مختلف عناصر آمریت کے خلاف احتجاجی تحریک میں از خود شامل ہوگئے ہیں۔

ہمارا تجزیہ ہے کہ موجودہ تحریک ایک مقبولِ عام جمہوری اور انقلابی تحریک ہے۔ اس تحریک کی مقبولیت کا ثبوت یہ ہے کہ اس میں مختلف طبقے بالخصوص محنت کش طبقہ، درمیانہ طبقہ اور خود سرمایہ دار طبقے کے کچھ عناصر حصّہ لے رہے ہیں اور مظاہروں میں شریک ہوتے ہیں۔ یہ تحریک جمہوری اس لیے ہے کہ اس تحریک کا سب سے اہم مطالبہ جمہوری حکومت کا قیام ہے۔ یہ انقلابی اس لیے ہے کہ اس تحریک کا مقصد معاشرے میں انقلابی تبدیلیاں لانا ہے۔ یہ انقلابی تبدیلیاں عوام خود لانا چاہتے ہیں۔ اس تحریک کی قیادت کوئی واحد جماعت نہیں کررہی ہے جو اس مقصد کے لیے پہلے سے سرگرمِ عمل ہوتی بلکہ عوام کے صبر کا پیمانہ اس حد تک لبریز ہوگیا تھا

کہ وہ شاہ کے خلاف جدو جہد میں شرکت پر آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ ہر اس شخص نے شرکت کی جو جمہوریت کا خواہاں تھا اور حکومت کی پالیسیوں کے باعث جو ظلم ہو رہا تھا اس کے خاتمے کا خواہش مند تھا۔ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ ایران ہر چند کہ تیل سے اربوں ڈالر کما رہا تھا لیکن اسی کمائی نے امیر اور غریب کے درمیان خلیج کو پاٹنے کے بجائے اور وسیع کیا ہے اور یہ بھی واقعہ ہے کہ اس مختصر سے گروہ نے جو ایران پر حکومت کر رہا ہے اور جو سامراجی اجارہ داریوں سے وابستہ ہے ایران کی دولت کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا ہے۔ اس کے برعکس عام لوگ، محنت کش لوگ دن بدن نادار اور محتاج ہوتے جا رہے تھے، بیروزگاری بڑھ رہی تھی، دہقان تباہ ہو رہے تھے، رشوت ستانی روز کا معمول بن گئی تھی، ظلم و تشدد کا دور دورہ تھا، قانون کی کسی کو پرواہ نہ تھی اور حکمرانوں کی دھاندلیاں ناقابلِ برداشت ہو رہی تھیں۔ ان سب عوامل نے مل کر اس بے چینی کو جنم دیا جو، اب ایک ملک گیر تحریک کی شکل اختیار کر گئی ہے اور جس میں مختلف نظریات، کے حامل عناصر، مختلف طبقے اور ان کی جماعتیں شریک ہیں۔

حکومت کو ملک کے اندر فقط فوج اور پولیس کی حمایت حاصل ہے اور جیسا کہ ہر شخص کو علم ہے، اس فوج کی قیادت امریکی مشیر کرتے ہیں۔ ان کی مجموعی تعداد چالیس ہزار ہے اور ان پر ایران کو سالانہ ایک ارب ڈالر (دس ارب روپے) خرچ کرنے پڑتے ہیں۔ یہ فوج اور پولیس ہی تھی جس نے عوام کا بے پناہ خون بہایا ہے۔ اس میں ۸ ستمبر کا سانحہ بھی شامل ہے (تہران میں مظاہرین پر فائرنگ)۔ سرکاری بیان کے مطابق اس حادثے میں کوئی ایک سو ایرانی شہید ہوئے لیکن غیر سرکاری اندازے کے مطابق مرنے والوں کی تعداد دو تین ہزار سے بھی زیادہ تھی۔ ان اشتعال انگیزیوں کے باجود لوگ پُر امن مظاہرے کرتے رہے ہیں۔ اگر انھوں نے مورچے لگائے تو اپنے بچاؤ کے لیے۔ بہر حال اس امر کے امکانات موجود ہیں کہ حکومت کو فوج کی حمایت زیادہ دن تک حاصل نہیں رہے گی۔ ایسے واقعات ابھی سے دیکھنے میں آ رہے ہیں جب افسروں اور سپاہیوں نے مظاہرین پر گولی چلانے سے انکار کر دیا ہے۔

سوال:۔ مغربی ممالک کے اخبارات اور دیگر ذرائع ابلاغ موجودہ تحریک کو ایک ایسی رجعت پرست تحریک قرار دے رہے ہیں جو شاہ کے ایران کو ایک جدید اور ترقی یافتہ ملک بنانے کی

کوششوں کے خلاف شروع کی گئی ہے اور یہ کہ اس تحریک کی راہ نمائی دقیانوسی مُلا کر رہے ہیں جو ایران کو خالص اسلامی دور میں واپس لے جانا چاہتے ہیں اور شاہ کی نافذ کردہ ان تمام اصلاحات کو کالعدم کردینے کے درپے ہیں جن کے ذریعے شاہ نے ایران کو ازمنۂ وسطیٰ سے نکال کر دُورِ جدید سے متعارف کیا تھا۔ اس ضمن میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب:۔ جہاں تک موجودہ تحریک کے مذہبی پہلوؤں کا تعلق ہے یہ بات یاد رکھنی چاہیے اور میں اس پر اصرار کرتا ہوں کہ شیعہ علما کو ایسی طاقت نہیں سمجھنا چاہیے جو موجودہ دور اور اس کے تقاضوں کو پسِ پشت ڈال کر ملک کو ازمنۂ وسطیٰ کی جانب واپس لے جانا چاہتے ہوں۔ در حقیقت ان کا رویہ اور موقف بڑی حد تک لوگوں کو خواہشوں اور تمناؤں کی ترجمانی کرتا ہے۔ ہم کو اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیے اور اس کو سراہنا چاہیے کہ آج یہ مذہبی تحریک ایران کے قومی اور جمہوری عناصر کو منظم اور متحرک کرنے میں اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ لہٰذا اس تحریک کے سامراج دشمن اور آمریت دشمن پہلوؤں کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

حزبِ تُودہ عوام کی پارٹی ہے۔ اس نے مذہبی اعتقادات کا ہمیشہ احترام کیا ہے۔ ایرانی عوام کی بھاری اکثریت میں مذہبی اعتقادات کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ ہماری پارٹی جمہوری پارٹی ہے اس لیے ہم تمام جمہوری عناصر سے جن میں مذہبی اور دینی عناصر بھی شامل ہیں اتحاد کے خواہاں ہیں۔ جب خمینی جیسے رہنما یہ اعلان کرتے ہیں کہ شاہ کی حکومت عوام دشمن ہے، غیر اسلامی ہے لہٰذا اس حکومت کا تختہ الٹ دینا چاہیے تو ہمارے نزدیک یہ اعلان ایک مثبت اور واضح اعلان ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہم ان علما کے تمام نکات سے متفق ہیں۔ انسان کو حقیقت پسند ہونا چاہیے۔ اگر یہ علما خالصتاً مذہبی حکومت (تھیوکریسی) قائم کرنا چاہیں گے تو پھر معاملات دوسرا رخ اختیار کریں گے لیکن جہاں تک ہمیں علم ہے ایران کے مذہبی علما نے کبھی ایسی حکومت کا مطالبہ نہیں کیا۔ اگر شریعت مداری ۱۹۰۶ء کے آئین کی بحالی کی بات کرتے ہیں تو ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ۱۹۰۶ء کا آئین کافی حد تک جمہوری آئین تھا۔ لہٰذا ۱۹۰۶ء کے آئین کی طرف رجوع کو کسی صورت میں بھی رجعتی اقدام نہیں کہا جاسکتا۔

شاہ اور اس کی حکومت کچھ عرصے سے حکومت کی مخالف اس تحریک کی ذمے داری

'اسلامی مارکسسٹوں' پر ڈال رہی ہے۔ انھوں نے 'اسلامی مارکسسٹ' کی اصطلاح وضع ہی اس لیے کی ہے کہ شاہ دشمن تحریک میں پھوٹ ڈالی جاسکے۔ ایک طرف مذہبی عناصر کو تحریک سے بدظن کیا جائے کہ اس میں مارکسسٹ شامل ہیں۔ دوسری طرف مارکسسٹوں کی صفوں میں شکوک و شبہات پیدا کیے جائیں کہ مارکسسٹ کٹھ ملاؤں کا ساتھ دے رہے ہیں۔ اسی کے ساتھ شاہ، اس کی حکومت اور ساواک سب بار بار یہ کہہ رہے ہیں کہ مذہبی تحریک اور حزبِ تودہ کے درمیان تعاون ممکن نہیں کیونکہ مارکسزم اور اسلام کبھی یکجا نہیں ہوسکتے۔ یہ واقعہ ہے کہ ہمارے درمیان باقاعدہ طور پر کوئی اتحاد اور تعاون طے نہیں پایا ہے لیکن ہم دونوں شاہ کے خلاف تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔

اگر موجودہ تحریک جو حکومت کے خلاف چلائی جارہی ہے، صرف مذہبی تحریک ہوتی تو شاہ بڑی آسانی سے مذہبی مطالبات منظور کرکے اس عوامی ہیجان کو ٹھنڈا کرسکتا تھا لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ یہ ایک سیاسی تحریک ہے جس کے مطالبات سیاسی ہیں اور جس کی پشت پر عوام ہیں۔ سب سے بڑا مطالبہ شہنشاہیت کو ختم کرنے اور جمہوری حکومت قائم کرنے کا ہے۔

سوال:۔ اور کون کون سے عناصر شاہ اور اس کی حکومت کی مخالفت کررہے ہیں؟

جواب:۔ ان میں سرِ فہرست جبہ ملی ہے جو مختلف سیاسی جماعتوں کا متحدہ محاذ ہے۔ جبہ ملی کا مؤقف قومی اور جمہوری ہے۔ اس میں شریک عناصر ڈاکٹر مصدق کے پیروکار ہیں۔ جبہ ملی کے تمام شرکا شاہ کی آمریت کے مخالف ہیں۔ وہ جمہوری آزادیوں کا مطالبہ کررہے ہیں۔ وہ بالغ رائے دہی کے اصول کی بنیاد میں چنی جانے والی آئین ساز اسمبلی کا مطالبہ کررہے ہیں اور آزاد انتخابات کے ذریعے قائم ہونے والی جمہوری حکومت کے حق میں آواز اٹھا رہے ہیں۔ ہرچند کہ وہ سرکاری طور پر بادشاہت کے خاتمے کا مطالبہ نہیں کرتے لیکن ان کے مؤقف سے نتیجہ یہی نکلتا ہے۔ جبہ ملی تیل کی پیداوار پر پابندیاں لگانے کے حق میں ہے تاکہ ملک کے وسائل کو ضائع ہونے سے بچایا جاسکے۔ جبہ ملی میں شریک ہونے والے عناصر درمیانے طبقے (پیٹی بورژوا طبقہ) سے تعلق رکھتے ہیں۔ جبہ ملی کا دانشوروں اور طالب علموں پر بہت اثر ہے۔

مگر شاہ کے مخالفین کی صفوں میں رجعت پرست عناصر بھی شامل ہیں۔ یہ امریکہ کے

حامی سیاست دانوں کا گروہ ہے۔ وہ موجودہ بحران کا ایسا حل چاہتے ہیں جس سے امریکہ، برطانیہ اور اجارہ دار کمپنیوں کے مفادات کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔

سوال:۔ شاہ کی حکومت کو کن بیرونی طاقتوں کی پشت پناہی حاصل ہے؟

جواب:۔ اس ضمن میں امریکہ سر فہرست ہے۔ امریکی سامراج کے لیے ایران کی بڑی اہمیت ہے۔ کیونکہ ایران امریکہ کو تیل مہیا کرتا ہے اور سوویت یونین کی سرحدوں پر واقع ہے۔ یہ کوئی اتفاقی بات نہیں تھی کہ ۸ ستمبر ۱۹۷۸ء کو تہران میں قتلِ عام کے بعد امریکہ کے صدر جمی کارٹر نے شاہ سے ٹیلی فون پر اس وقت ہمدردی کا اظہار کیا جب وہ کیمپ ڈیوڈ میں مصر کے صدر سادات اور اسرائیل کے وزیر اعظم بیگن کے درمیان کانفرنس کی صدارت کر رہا تھا۔ اسی سے امریکی وزارتِ خارجہ نے طنزیہ انداز میں اطمینان کا اظہار کیا تھا کہ ایران میں شورش پر بڑی نرمی اور انسانیت کے ساتھ قابو پایا جا رہا ہے۔ امریکہ کے اس طرزِ عمل نے کارٹر انتظامیہ کے 'انسانی حقوق' کی پُر زور مہم کو پوری طرح بے نقاب کر دیا ہے۔ ہماری پارٹی اور جبہۂ ملی پر تو اس مہم کی اصل غرض و غایت پہلے بھی واضح تھی لیکن اب ایران کے رجعت پرست حلقے بھی جو کارٹر انتظامیہ پر تکیہ کیے ہوئے تھے، مایوس ہو گئے ہیں۔ اب ہر ذی ہوش پر یہ حقیقت آشکار ہو گئی ہے کہ کارٹر انتظامیہ ایران کے بارے میں اپنے موقف سے سر مو انحراف نہیں کرنا چاہتی، اس لیے امریکہ کو سمجھ لینا چاہیے کہ ایران کی حکومت کے خلاف نفرت تمام طبقوں میں سرایت کر چکی ہے۔ امریکہ پوری کوشش کر رہا ہے کہ اس کو ایران میں کوئی ایسا سہارا مل جائے جو اس شورش کو دبا سکے مگر اس کو ایسا کوئی سہارا نہیں مل رہا ہے۔ لہٰذا اس کو ان سطحی تبدیلیوں پر انحصار کرنا پڑ رہا ہے جو شریف امامی کی حکومت کر رہی ہے۔

اسرائیل بھی شاہ کو پوری امداد دے رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ شاہ کی آمریت کا ایک اور پشت پناہ پیدا ہو گیا ہے اور وہ ہے چین۔ ۸ ستمبر کے قتل عام کے بعد پیکنگ کی قیادت نے ایرانی تحریک پر یہ الزام لگایا کہ یہ تحریک بیرونی قوتوں کی شہ پر اور بیرونی سرمائے کی مدد سے چلائی جا رہی ہے اور یہ الزامات تہران کے اخباروں میں شائع ہوئے لیکن اس سے بھی پہلے چین کے قائد ہوکوافنگ نے تہران میں چین کے مؤقف کی وضاحت کر دی تھی اور ہر شخص محسوس

کرنے لگا تھا کہ عوامی جمہوریہ چین اور امریکی سامراج کے درمیان ایک شرمناک معاہدہ طے پا گیا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ایرانی عوام نے چین کی موجودہ قیادت کے اصل روپ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے اور ماؤ پرستوں کا تمام پروپیگنڈا بے اثر ہوتا جارہا ہے۔ یہ ماؤ پرست اٹھتے بیٹھتے ہماری پارٹی کو ترمیم پسندی کے طعنے دیا کرتے تھے۔ اب ہر ایرانی نے اپنے تجربے سے جان لیا ہے کہ کون ترمیم پسند ہے اور کون سامراج کا دوست ہے اور کون پارٹی عوام کی آزادی کے لیے سربکف جہاد میں مصروف ہے۔

حمید سفری

ایران میں عوامی تحریک نے جن حالات کو جنم دیا ہے ان کا تجزیہ ستمبر ۱۹۷۸ء میں ایرج سکندری پیش کر چکے ہیں۔ اس کے بعد حالات نے نیا رخ اختیار کیا ہے۔ رجعتی اور آمرانہ حکومت کی مسلسل متشددانہ پالیسیوں کے باعث ایسے سماجی اور اقتصادی حالات رونما ہوئے ہیں کہ جمہوری تحریک میں وہ عناصر بھی شامل ہوگئے ہیں جن کے بارے میں یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہ جدوجہد میں شریک ہوں گے۔ پچھلے ۲۵ برس کی تاریخ میں ایسی ہمہ گیر تحریک کی مثال نہیں ملتی۔

شاہ کی حکومت گزشتہ دس پندرہ سالوں سے اپنی اقتصادی اصلاحات کا زبردست پروپیگنڈا کرتی رہی ہے اور دنیا بھر کا سرمایہ دار پریس ان اصلاحات کو 'سفید انقلاب' سے موسوم کرتا رہا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان اصلاحات اور اقتصادی سرگرمیوں سے فقط ایک حقیر سی اقلیت کو فائدہ پہنچا ہے۔ جبکہ عوام کی بھاری اکثریت کے حالات بد سے بدتر ہوئے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت زرعی اصلاحات سے پیدا ہونے والی صورتِ حال ہے حالانکہ یہی زرعی اصلاحات 'سفید انقلاب' کی اساس خیال کی جاتی ہیں۔ ان زرعی اصلاحات کا اصل مقصد دیہات میں جہاں نیم فیوڈل پیداواری رشتے رائج تھے، سرمایہ داری کو فروغ دینا تھا اور اس طرح شاہ کی حکومت کی پشت پناہی کرنے والے طبقوں میں تھوڑی سی ترمیم مقصود تھی۔ ان اصلاحات کے ذریعے نہ تو بڑے بڑے قطعات آراضی کو ختم کرنا تھا اور نہ ان کو غریب یا بے زمین دہقانوں میں تقسیم کرنا تھا۔ آج کے دن تک کسانوں کی اکثریت زمین سے بالکل محروم ہے یا ان کو بہت

چھوٹے چھوٹے غیر اقتصادی قطعات ملے ہیں۔ اس کے مقابلے میں شاہ کے قبضے میں اور اس کے خاندان اور فوج اور پولیس کے اعلیٰ عہدے داروں، سول افسروں اور گماشتہ سرمایہ داروں کے پاس اب تک بڑے بڑے قطعات آراضی موجود ہیں۔ ان سرمایہ دارانہ نوعیت کی زرعی اصلاحات کے مہلک نتائج کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ غربت کے ہاتھوں تنگ آ کر پانچ لاکھ کسان ہر سال دیہات سے شہروں کا رخ کرنے پر مجبور تھے۔ اس کی وجہ سے ایران کی زراعت مسلسل بحران کا شکار ہے۔ ۶۵ ہزار دیہات بالکل تباہی کے دہانے پر پہنچ گئے ہیں۔ فی ایکڑ پیداوار میں اضافے کے بجائے کمی ہوتی جارہی ہے اور وہ ملک جو کبھی اپنی زرعی اجناس برآمد کرتا تھا، اب گندم، چاول اور گوشت وغیرہ درآمد کرنے پر مجبور ہوگیا ہے۔

ایران کی سب سے بڑی دولت تیل ہے مگر اس دولت کو نہ تو ملک کی پسماندگی دور کرنے کے لیے استعمال کیا گیا اور نہ سامراجی ممالک پر انحصار کو ختم کر کے عوام کے معیار زندگی کو اونچا کرنے کے کام لایا گیا۔ ایران کا شمار سرمایہ دار ملکوں کو تیل فراہم کرنے والے ملکوں میں دوسرے نمبر پر ہے۔ پہلا نمبر سعودی عرب کا ہے۔ ایران اپنے تیل کی برآمد سے ہر سال بیس ارب ڈالر بلکہ اس سے بھی زیادہ کماتا رہا ہے لیکن تیل سے حاصل ہونے والی آمدنی کا سب سے زیادہ حصہ اسلحے خریدنے پر صرف ہوتا تھا۔ اسلحوں کی خریداری کا مقصد ایران کو مشرق وسطیٰ کا سب سے مسلح ملک بنانا تھا تاکہ شاہ سامراج بالخصوص امریکی سامراج کا 'مراعات یافتہ' دوست اور اس علاقے کے 'پولیس مین' کا کردار ادا کرسکے اور امریکی کمپنیوں کے تیل کے مفادات کی احسن طریقے پر حفاظت کرسکے۔ دوسری مد جس پر اس آمدنی کا بڑا حصہ خرچ ہوتا تھا ایران کو ماڈرن بنانے کی غرض سے ٹیکنیکل سازوسامان کی درآمد تھی۔ مگر ایران کو 'ماڈرن' بنانے سے زیادہ شاہ کو اپنا ذاتی وقار بڑھانا تھا۔ اس کا ملک کی سماجی اور اقتصادی ترقی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۹۰ء تک ایران میں بیس ایٹمی پلانٹ (۱۵۰ ارب ڈالر کی لاگت سے) لگائے جانے والے ہیں۔ تیل کی آمدنی جس تیسری مد میں صرف ہوتی ہے وہ ہے رشوت، جو شاہ کی حکومت کے تمام شعبوں میں جاری وساری ہے۔ اس کے علاوہ ایران تشدد کے ذریعے، حکومت کی واضح مثال ہے۔ ساواک کی قتل وغارت گری، سیاسی کارکنوں پر اذیت ناک مظالم،

انسانی حقوق کی پامالی، ہر دفتر، ہر کارخانے، ہر کالج، یونیورسٹی اور اسکول میں ساواک کے خفیہ ایجنٹوں کے تعیناتی نے ایران کو قید خانہ بنادیا ہے۔ ڈاکٹر مصدق کی برطرفی کے بعد آج تک کوئی ترقی پسند تنظیم کھلم کھلا نہ تو قائم ہوسکی اور نہ کام کرسکی۔ حزبِ تودہ کے ہزاروں کارکنوں کو گولی کا نشانہ بنایا گیا، ان پر تشدد کیا گیا اور وہ سالہا سال سے آج بھی جیلوں میں بند ہیں۔

شاہ کی یہی عوام دشمن اور سامراج دوست پالیسیاں تھیں جنھوں نے موجودہ عوامی احتجاج کو جنم دیا۔ اس کا لاوا مدت سے اندر ہی اندر پک رہا تھا۔ اس وقت جب یہ مضمون لکھا جارہا ہے اس تحریک اور مقاومت کا مکمل تجزیہ کرنا تو مشکل ہے لیکن اس کے بعض پہلو بہت نمایاں ہیں۔

اس احتجاجی تحریک نے ایک طرف روبہ زوال بادشاہت کی اخلاقی اور سیاسی گراوٹ کو آشکار کردیا ہے دوسری طرف یہ بھی واضح ہوگیا ہے کہ شاہ کو عوام کی تائید بالکل حاصل نہیں بلکہ کوئی طبقہ بھی شاہ کی حمایت کے لیے تیار نہیں۔ شاہ نے گزشتہ ۲۵ برس میں اپنی آمریت کے گرد جو حصار کھڑا کر رکھا تھا وہ ٹوٹ پھوٹ گیا ہے حتیٰ کہ شاہ نے اپنی تخلیق کردہ جماعت رستخیز کو ناکارہ سمجھ کر توڑنے کے احکام صادر کردیے ہیں اور اب شاہ کا واحد سہارا فوج اور ساواک ہیں۔

ہم کو موجودہ تحریک کی مذہبی زبان اور مذہبی نعروں سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تحریک بنیادی طور پر سیاسی اور سماجی ہے اور اس میں مزدور طبقہ پیش پیش ہے اور سرکاری ملازمین اور شہری نوجوان بہ کثرت شامل ہیں۔ ان میں طلبا اور دانشور بھی ہیں اور وہی تحریک کا رخ متعین کررہے ہیں۔ تحریک میں شامل مختلف طبقوں اور گروہوں کا سیاسی شعور اتنا پختہ ہے کہ انھوں نے اقتصادی مطالبات پر اکتفا نہیں کی ہے کیونکہ اقتصادی مطالبات تو شاہ کی حکومت بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہوگئی ہے بلکہ انھوں نے سیاسی مطالبات کو سرفہرست رکھا ہے۔ مثلاً مارشل لا کا خاتمہ، سیاسی قیدیوں کی رہائی، تحریر و تقریر کی آزادی، سیاسی جماعتوں پر سے پابندی کی تنسیخ، ساواک کا خاتمہ، سامراجی ملکوں سے تمام معاہدوں کی منسوخی اور ان کے فوجی اور غیر فوجی مشیروں کا انخلا۔

صنعتی مزدوروں بالخصوص تیل کے مزدوروں نے جو سب سے زیادہ منظم اور باشعور ہیں اور دفتری ملازمین اور طلبا اور اساتذہ نے اپنی قابلِ ستائش تنظیمی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔

اکتوبر اور نومبر ۱۹۷۸ء میں ہڑتالوں کی جو زبردست لہر اٹھی اس سے ثابت ہوگیا کہ صنعتی مزدوروں نے شاہ کی مسلط کردہ ٹریڈ یونین قیادت کو رد کردیا ہے۔ البتہ حالات نے تحریک کی کمزوریاں بھی عیاں کردی ہیں اور ظاہر ہوگیا ہے کہ کسان اس تحریک میں اس جذبے اور مستعدی سے شریک نہیں ہوئے ہیں جس جذبے اور مستعدی سے شہر کے لوگ جدو جہد کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ یہ بھی واضح ہوگیا ہے کہ عوام کو کوئی چاق وچوبند اور مستعد قیادت میسر نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ تحریک کی ان کمزوریوں کا سبب آمرانہ حکومت کا استبداد تھا پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ ان کمزوریوں کے باعث جمہوری تحریک کا کام مشکل ہوگیا ہے۔

نورالدین کیانوری

جب سے ایران میں بحران نے زور پکڑا ہے، شیعہ رہنما آیت اللہ روح اللہ خمینی اور نیشنل فرنٹ پر توجہ مرکوز کی جارہی ہے مگر ایران کے اندر فیصلہ کن قوتوں میں سے ایک ممنوعہ ایرانی کمیونسٹ پارٹی بھی ہے جو تودہ پارٹی کے نام سے مشہور ہے اور ۱۹۴۹ء سے انڈر گراؤنڈ ہے۔ تودہ پارٹی نے جو ۱۹۴۱ء میں قائم ہوئی تھی شاہ محمد رضا پہلوی کی جانب سے گزشتہ تیس (۳۰) سال میں متعدد بار کچلے جانے کے باوجود اہم کردار ادا کیا ہے اور اب بھی ایران کے اندر اس کا ایک پوری طرح منظم خفیہ ڈھانچہ موجود ہے۔ ماضی میں اس کے لیڈروں تک رسائی کسی مغربی صحافی کے لیے عملاً ناممکن تھی مگر گزشتہ ہفتے مشرقی یورپ میں 'نیوز ویک' کے یورپی ایڈیٹر بہر نے تودہ پارٹی کے نومنتخب اوّل سیکریٹری ۶۳ سالہ نورالدین کیانوری سے ایک گھنٹے سے زیادہ گفتگو کی۔

سوال:۔ آپ کی پارٹی ۱۹۴۹ء سے انڈر گراؤنڈ ہے۔ آپ نے کس طرح رابطہ رکھا ہوا ہے اور اس پر آپ کا کنٹرول کس حد تک ہے؟

جواب: ۔ ہماری بہت سی مشکلات ہیں اور بالخصوص ۱۹۷۰ء میں ہماری تحریک میں (ایران کی خفیہ پولیس) ساواک کے ایجنٹ کے گھس آنے کے باوجود ہمارا رابطہ کبھی منقطع نہیں ہوا۔

سوال:۔ آپ کو زیادہ تر کس کی حمایت حاصل ہے؟

جواب:۔ تیس ۳۰ لاکھ کا ایرانی مزدور طبقہ بلند سیاسی شعور رکھتا ہے، جس کا اظہار اس نے

انقلاب کے گزشتہ مرحلے میں کیا ہے۔ انقلاب کے ساتھ ساتھ تودہ روایات کا بھی احیا ہو رہا ہے۔ پرانے کارکن جن میں سے اکثر کو جیل کا تجربہ ہے نئی نسل کی رہنمائی کر رہے ہیں۔ یہ اب تو شاہ کے حکام بھی تسلیم کرتے ہیں کہ تیل کے مزدور صرف تودہ پارٹی کی طرف سے ملنے والی ہدایات پر عمل کرتے ہیں۔ دانشوروں، نچلے درمیانہ طبقے 'قومی بورژوازی' ،بازار کے سوداگروں، مختصراً یہ کہ ان تمام طبقوں میں بھی ہمیں کافی حمایت حاصل ہے جو براہ راست اجارہ دارانہ، سامراجی سرمایہ داری میں شریک نہیں ہیں۔

سوال:۔ تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ سڑکوں میں خمینی کی حمایت میں نعرے لگانے والوں میں بہت سے درحقیقت تودہ پارٹی کے ممبر یا حمایتی ہیں؟

جواب:۔ میں یہ نہیں کہتا۔ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ گزشتہ بیس ۲۰ سال سے آیت اللہ خمینی، شاہ اور سامراج کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ انھوں نے اسلامی اصولوں کی بنیاد پر اپنے سیاسی افکار کو ترقی دی ہے۔ بادشاہت کے خاتمے، اسلامی جمہوریہ کے قیام، سامراج کی بالادستی کے خاتمے کی خاطر قومی حکومت کا قیام، نئے آئین کی تیاری کے لیے دستور ساز اسمبلی کا انتخاب، سیاسی جبر کے خلاف جدوجہد اور قومی دولت کا مشترکہ بہبود کے لیے استعمال، ان مقاصد کی خاطر ہم آیت اللہ خمینی کی پہل کاریوں کی مکمل حمایت کرتے ہیں۔ یہ ہمارا عارضی طریقۂ کار نہیں بلکہ ایک سنجیدہ اور واضح مؤقف ہے۔

سوال:۔ ایک مارکسی کی حیثیت سے کیا آپ کو آیت اللہ خمینی کی پالیسیوں کے گہرے اسلامی کردار سے کوئی تشویش نہیں ہے؟

جواب:۔ ایک طویل عرصے سے شیعہ مذہبی رہنما مسجدوں میں عوام سے رابطہ پیدا کرتے رہے ہیں۔ شیعہ مذہبی تصورات کی جڑیں جمہوری ہیں اور وہ ہمیشہ عوامی، قومی، سامراج دشمن قوتوں سے وابستہ رہے ہیں۔ اسی وجہ سے جب آیت اللہ خمینی نے شاہ کے خلاف انقلابی نعرے دیئے تو انھوں نے ہماری ہمدردیاں جیت لیں۔ تودہ پارٹی معروضی طور پر ان کی تحریک کی ترقی پسند کردار کو تسلیم کرتی ہے اور ان کے ساتھ مشترکہ پروگرام تیار کرنے کے لیے ہم جو کچھ کر سکتے ہیں کر رہے ہیں۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ فی الحال وہ ایران کی نشو ونما میں ترقی پسند کردار ادا

کر رہے ہیں۔

سوال:۔ تودہ پارٹی اور آیت اللہ خمینی کب تک ساتھ چل سکتے ہیں؟

جواب:۔ کافی طویل عرصے تک۔ میں سمجھتا ہوں کہ سائنسی سوشل ازم اور اسلام کے سماجی مافیہ میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ اس کے برعکس ان میں زیادہ تر باتیں مشترک ہیں۔ بہت سے سوشلسٹ ملکوں میں مسلمان آبادی ہے اور وہاں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

سوال:۔ کیا آپ کا آیت اللہ خمینی سے براہِ راست رابطہ ہے؟ اور آپ نے حال میں ان کے پاس کوئی ایلچی بھیجے ہیں؟

جواب:۔ میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔

سوال:۔ آپ اقتدار میں کتنا حصّہ چاہتے ہیں؟

جواب:۔ ہم جس مجوزہ متحدہ محاذ کی بات کرتے ہیں، اس کی ساخت ثانوی اہمیت رکھتی ہے۔ اصل چیز اس کے مشترکہ پروگرام کے نکات ہیں۔

سوال:۔ کیا آپ کے نزدیک نیشنل فرنٹ کے ساتھ متحدہ محاذ میں مل کر کام کرنے کا امکان ہے؟

جواب:۔ ہم ایک متحدہ محاذ کی حمایت میں جو کچھ کر سکتے ہیں، کریں گے اور ہم ہر اس سیاسی تحریک کا ساتھ دیں گے جو ہمارے مقاصد یعنی سامراج کی امریکی اور دیگر شکلوں کے خاتمے، اسلحے کی تباہ کن خریداری کے خاتمے اور ایک دستور ساز اسمبلی کے قیام سے اتفاق کرتی ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ نیشنل فرنٹ کے اندر ایک دھارا ایسا ہے جو ہمارے ساتھ تعاون کے حق میں ہے اور ہمیں کسی بورژوا پارٹی کے ساتھ کام کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں پھر زور دیتا ہوں کہ متحدہ محاذ کی کسی حکومت میں ہمیں ملنے والی نشستیں اہم نہیں ہیں بلکہ خیالات اور پالیسیاں ہیں جن کی اہمیت ہے۔

سوال:۔ مگر اس وقت جب نیا آئین بنے گا اور ایرانی عوام مسلمہ پارٹیوں کو ووٹ دیں گے۔ آپ کے پاس کیا ضمانت ہے کہ آیت اللہ خمینی غیر مذہبی پارٹیوں کو معمول کے مطابق کام کرنے کی اجازت دیں گے؟

جواب:۔ ہم بہت معروضیت پسند اور حقیقت پسند ہیں۔ جب یہ مسائل ابھریں گے تو ہم ان پر

غور کریں گے۔

سوال:۔ آپ کی نئی قیادت میں تودہ پارٹی نے مسلح عوامی جدو جہد کی تیاری کرنے کا اعلان نامہ جاری کیا ہے۔ کیا آپ خانہ جنگی کو ناگزیر سمجھتے ہیں؟

جواب:۔ کسی بھی سیاسی پارٹی کو اپنے ہاتھ کھلے رکھنے چاہئیں۔ قومی جدو جہد جو شاہ کی روانگی پر منتج ہوئی ہے، ہوسکتا ہے پُرامن طور پر اپنے منطقی انجام کو پہنچے اور فوج ایران کے تابع ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایران کی رجعت پرست قوتیں امریکہ، اسرائیل اور دیگر سامراجیوں کے ساتھ مل کر چلی یا انڈونیشیا کی طرح بڑے پیمانے پر کمیونسٹوں کا قتل عام کر کے جوابی انقلاب کی کوشش کریں۔ ہم اس بات کا یا ۱۹۵۳ء میں تودہ پارٹی پر ہونے والے مظالم کا اعادہ نہیں چاہتے، اس لیے ہمیں چوکنا رہنا چاہیے۔

سوال:۔ تو کیا آپ آگے چل کر مسلح عوامی جدو جہد کو ناگزیر سمجھتے ہیں؟

جواب:۔ میں قنوطیت پسند نہیں ہوں مگر میں ضرورت سے زیادہ رجائیت پسند بھی نہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ خونریزی کے بغیر بھی قومی تحریک اپنے منطقی انجام کو پہنچ سکتی ہے، مگر پھر بھی ہمیں چوکنا رہنا چاہیے۔

سوال:۔ آپ ہتھیار کہاں سے حاصل کریں گے؟

جواب:۔ پوری تاریخ میں انقلابی تحریکوں نے اس مسئلے کو خاص انداز میں حل کیا ہے۔ ہتھیار ہمیشہ حاصل کیے جاسکتے ہیں یا خریدے جاسکتے ہیں۔ ایران میں کافی ہتھیار موجود ہیں۔

سوال:۔ تو کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ آپ سمجھتے ہیں کہ ایرانی فوج آپ کا ساتھ دے سکتی ہے؟

جواب:۔ ہماری فوج کا ماخذ عوامی ہے، جس کا نوے فی صد کسانوں اور دس فیصد مزدور طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ ہم اس بات کے قائل ہیں کہ بڑھتی ہوئی انقلابی تحریک بیرکوں کی دیواروں کے باہر نہیں رہے گی۔ جلد یا بہ دیر یہ تحریک فوج تک پہنچے گی۔ شہری آبادی کے بعد ہی مگر پہنچے گی ضرور۔ اس کی علامات موجود ہیں۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے عوام اور فوج کے درمیان رابطے کے بعد انقلابی افکار فوج میں اس حد تک سرایت کر گئے ہیں کہ مظاہروں کو ختم کرانے کے لیے اب افسر رضا کاروں کو بلا رہے ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ فوج کی وفاداریاں قائم نہیں رہیں۔

سوال:۔ آپ سوویت یونین اور ایران کے درمیان ۱۹۲۱ء کے معاہدے کو کیا اہمیت دیتے ہیں۔

جس کے تحت ایران پر حملے کی صورت میں سوویت یونین کو ایران کا ساتھ دینا ہے؟

جواب:۔ یہ معاہدہ ہی وہ واحد سبب تھا جس کی بنا پر برطانیہ ایران پر نو آبادی کی حیثیت سے قبضہ نہیں کر سکا۔ اس معاہدے نے ہمیشہ اہم کردار ادا کیا ہے، اب بھی ادا کر رہا ہے اور آئندہ بھی ایران کی قومی خودمختاری میں اہم کردار ادا کرے گا۔

سوال:۔ بعض مبصرین یاد دلاتے ہیں کہ پیٹر اعظم کے زمانے میں ایران روسی سرزمین کا جزو لاینفک رہا ہے۔ سوویت اثر کے دوبارہ پھیلاؤ کو آپ کس طرح دیکھتے ہیں؟

جواب:۔ اگر ایران جمہوری ملک بن کر سوشلسٹ ملکوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھے گا تو مجھے یقین ہے کہ سوشلسٹ ملک ہمارے داخلی معاملات میں مداخلت نہیں کریں گے۔ اپنی جنوبی سرحدوں پر ایک دوست حکومت سے جہاں اس کے خلاف کوئی اڈے نہیں ہوں گے، سوویت یونین خوش ہوگا۔ سوویت یونین کی سلامتی کے لیے ترقی پسند ایران ضمانت ہوگا[۸]

حوالہ جات

1- Edward Browne, *Literary History of Persia.* Vol. Iv (Cambridge, 1959), p. 272.

2- Fred Halliday, *op.cit.*, p. 199.

۳۔ آقا یحیٰی آرین پور، 'صبا تا نیما'، جلد دوم (تہران، ۱۹۵۱ء)، ص ۲۰۵۔

4- Fred Halliday, *op. cit.*

5- *Evolution of communism in Iran* (Tehran, 1959).

6- *Ibid.* p. 21.

7- *Ibid.* p. 298.

8- *News week* (New york) Januray 1979.

نواں باب

انقلابی ہلچل

شاہ کے اندھا دھند غیر ترقیاتی مصارف بالآخر رنگ لائے اور ۱۹۷۶ء میں اقتصادی بحران کے اثرات ظاہر ہونے لگے۔ چنانچہ ۱۹۷۶ء۔۱۹۷۷ء کا بجٹ پہلی بار خسارے کا بجٹ ثابت ہوا اور خسارہ بھی دو چار کروڑ کا نہیں بلکہ ڈھائی ارب ڈالر کا۔ البتہ اسی بجٹ میں دفاع کے دس ارب ڈالر کے علاوہ امریکہ سے مزید دو ارب ڈالر کے جنگی جہازوں کی خریداری کا مژدہ بھی سنایا گیا تھا۔ انہیں دنوں پیرس کے اخبار 'لی مانڈ' کے نمائندے نے انٹرویو کے دوران شاہ سے پوچھا کہ کیا آپ اس خسارے کو فوجی اخراجات میں کمی کر کے یا بھاری آمدنی والوں پر ٹیکس لگا کر پورا کریں گے تو شاہ نے جواب دیا کہ 'فوجی طاقت کے بغیر اقتصادی طاقت کا تصور مہمل بات ہے۔ رہا انکم ٹیکس سو اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔' اس پر اخبار نویس نے کہا کہ تب تو یہ گھاٹا ترقیاتی منصوبوں میں تخفیف ہی سے پورا ہو سکے گا۔ شاہ نے کہا کہ نہیں، ان منصوبوں میں بھی تخفیف نہیں ہوگی بلکہ بعض محکموں کے مصارف میں کمی کر کے بجٹ کو متوازن کر لیا جائے گا۔ اقتصادی بحران کی دوسری علامت یہ تھی کہ ایران کا محفوظ سرمایہ جو ۱۹۷۵ء میں دس ارب ستر کروڑ ڈالر تھا گھٹ کر دو ارب ستر کروڑ ڈالر رہ گیا تھا۔

ایران اقتصادی تباہی کے دہانے پر کھڑا تھا چنانچہ رسالہ میڈ (Meed) اُس وقت کی ایرانی معیشت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ 'اگر خمینی نہ ہوتے اور انقلاب نہ آتا بلکہ شاہ بدستور اپنے محل میں مقیم ہوتے تب بھی ایرانی معیشت کی عمارت اس سال کے موسم گرما تک دھماکے کے ساتھ زمین پر گرگئی ہوتی...... شاہ کی معیشت ایک غبارہ تھی جس میں ضرورت سے زیادہ ہوا بھردی گئی تھی اور بس اس کا انتظار تھا کہ کوئی اس کو چھو دے۔ شاہ کو انقلاب کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ اس نے شاہ کو شرمندگی اور خجالت سے بچالیا۔'

بجٹ کا خسارہ ترقیاتی منصوبوں کے اخراجات میں تخفیف اور کم آمدنی والے سرکاری ملازمین کی چھانٹی ہی سے پورا کیا گیا اور یہ وہ ملازمین تھے جو حکومت کی اجازت سے دو دو جگہ کام کرتے تھے تب کہیں گھر کے اخراجات پورے ہوتے تھے۔ اکیلے وزیر اعظم ہویدا کے محکمے سے نچلے گریڈوں کے آٹھ ہزار ملازمین الگ کیے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فقط تہران میں تقریباً پچاس ہزار تعلیم یافتہ افراد اچانک بے روزگار ہوگئے۔ ترقیاتی منصوبوں میں بھی تخفیف کی تلوار انہیں منصوبوں پر چلی جن سے عام لوگوں کو کچھ فائدہ پہنچنے کی امید تھی مثلاً اسکول اور ہسپتال۔

دفتروں میں بدنظمی، رشوت اور خرد برد میں بھی روز افزوں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ ایک معتبر اندازے کے مطابق ۱۹۷۳ء اور ۱۹۷۷ء کے درمیان کرپشن کے کارن ملک کو کم از کم چالیس ارب ڈالر کا نقصان ہوا تھا اور ہر سال قومی بجٹ کا ایک تہائی خرد برد کی نذر ہوجاتا تھا۔ تہران کے مضافات میں عباس آباد کی نئی بستی زیر تعمیر تھی۔ اس میں کروڑوں کا غبن ہوا مگر منصوبے میں چونکہ شاہ کے بھائی شامل تھے لہٰذا منیجر کو ہٹا کر فائل داخلِ دفتر کردی گئی۔ اخبار 'فنانشل ٹائمز' (لندن) مورخہ ۲۰ جنوری ۱۹۷۶ء کے مطابق بندر عباس کی توسیع کے مصارف میں ۲/ارب ۴۰ کروڑ کی خورد برد ہوئی۔ تہران کے قریب وقف کی ۲۵ لاکھ مربع میٹر زمین سرکاری افسروں نے آپس میں بانٹ لی اور ان کا ایک بال بیکا نہیں ہوا۔ دو نائب وزیر حسین علی زادہ جو اناج اور چائے کے محکموں کا نگراں تھا اور محمد علی صرافی جو بیرونِ ملک تجارت کا نگراں تھا رشوت میں ملوث ہوئے۔ انہوں نے برطانوی کمپنی ٹیٹ اینڈ لائل سے مل کر شکر کی خرید میں ۴۵ء ۴ کروڑ ڈالر کا گھپلا کیا تھا۔

ناجائز ذرائع سے دولت سمیٹنے کی وبا اتنی بڑھ گئی تھی کہ خود شاہ پسندوں کو تشویش ہونے لگی تھی۔ چنانچہ سابق وزیرِاعظم علی امین نے 'لی مانڈ' کو بیان دیتے ہوئے کہا تھا:

'پندرہ سال سے شاہ تین چار ہزار ان اشخاص کے نرغے میں ہے جو دربار کے روابط سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اگر حالات کو جلد درست نہ کیا گیا تو اس ملک میں کمیونزم کامیاب ہوجائے گا۔ شاہ سخت خطرے میں ہیں لیکن وہ اپنے بھائیوں، بہنوں اور خوشامدی حاشیہ نشینوں سے قطع تعلق کرلیں تو ان کو اب بھی بچایا جاسکتا ہے۔ یہ مطلق العنان جابر اور استبدادی حکومت جلد یا بدیر ختم ہو کر رہے گی کیونکہ اس کی بنیادیں اب گل سڑ چکی ہیں۔'

بہتی گنگا تھی اور تیل کی دولت پانی کی طرح بہہ رہی تھی لہٰذا جس کو موقع ملتا تھا جی بھر کر فیض یاب ہوتا تھا۔ جس عمارت پر پانچ لاکھ خرچ ہوتے تھے اس کی لاگت ۲۵ لاکھ دکھائی جاتی تھی، جس پل پر ایک کروڑ خرچ ہوتا تھا اس کی مد میں پانچ کروڑ وصول کیے جاتے تھے۔ شاہی محل سے لیکر چھوٹے چھوٹے محکمے کا یہی رنگ تھا۔

چنانچہ شاہ کے آخری وزیرِ صحت شجاع الدین شیخ الاسلام زادہ پر انقلابی عدالت میں مقدمے کے دوران ایک دلچسپ انکشاف یہ ہوا کہ ہنری کسنجر جن دنوں امریکہ کا وزیرِ خارجہ تھا تو تہران میں اس کی ہر آمد پر آٹھ لاکھ ڈالر (۸۰ لاکھ روپیہ) خرچ ہوتے تھے حالانکہ وہ دو تین دن سے زیادہ کیا ٹھہرتا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے نئی عمارت نہیں بنتی تھی اور نہ نیا فرنیچر خریدا جاتا تھا لیکن کوئی باز پرس کرنے والا نہ ہو تو ایک کے دس کیوں نہ بنائے جائیں۔ محمد شاہ رنگیلا تو خواہ مخواہ بدنام تھا۔ وہ بے چارہ تو رضا شاہ پہلوی کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔

کرپشن کے چرچے اخباروں میں ہونے لگے اور اقتصادی زبوں حالی ناقابلِ برداشت حد تک بڑھ گئی تو ۱۹۷۷ء کے اوائل میں جبہ ملی کے تین رہنماؤں ڈاکٹر کریم سنجابی، ڈاکٹر شاپور بختیار اور داریوش فروہر، نے ایک محضر اپنے دستخط سے شاہ کی خدمت میں روانہ کیا۔ اس محضر میں شاہ کو ملک کی تشویشناک صورت حال سے آگاہ کیا گیا تھا اور آئینی حقوق کی بحالی کی درخواست کی گئی تھی۔ اس محضر کا کوئی جواب نہیں ملا تو شاہ کے نام کھلی چٹھیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ پہلے ملک کے ممتاز اہلِ قلم حاجی سید جواری سابق ایڈیٹر 'کیہان' نے کھلی چٹھی شائع کی، پھر مشہور

مؤرخ خواجہ نوری نے۔ اس کے بعد کانون نویسندگان (ادیبوں کی انجمن کے ۵۶ ارکان نے ایک رزد لیوشن منظور کیا جس میں شہری حقوق کو بحال کرنے اور سیاسی قیدیوں کو رہا کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ تہران کے ۱۴۴ر وکیلوں نے بھی اسی قسم کی ایک تجویز منظور کی۔

اکتوبر ۱۹۷۷ء میں طلبا بالخصوص تہران یونیورسٹی اور آریہ مہر یونیورسٹی کے طلبا حرکت میں آئے مگر ساواک نے ان کے جلسوں کو منتشر کر دیا لیکن احتجاج کی لہراب تشدد سے نہیں دبائی جاسکتی تھی۔ ۲۲ نومبر کو تہران کے شمال میں کرج کے مقام پر مظاہرین اور ساواک میں پھر تصادم ہوا۔ اس بار ساواک بارہ بسیں بھر کر اپنے غنڈے مظاہرین سے نمٹنے کے لیے تہران سے لے گیا تھا۔ دسمبر ۱۹۷۷ء میں جبہۂ ملی کی از سرِ نو تنظیم کا اعلان ہوا اور تہران کے تیس ممتاز شہریوں نے 'انجمن دفاعِ آزادی وحقوقِ انسانی' قائم کی۔ آزادی خواہوں میں خود اعتمادی پیدا ہو رہی تھی اور وہ آہستہ آہستہ میدان عمل کی جانب بڑھنے لگے تھے۔

اسی اثناء میں آیت اللہ خمینی کا ایک بیٹا موٹر کار کے حادثے میں فوت ہوا مگر قرائن بتا رہے تھے کہ اس کی ہلاکت میں ساواک کا ہاتھ تھا اور تب ۱۹ر دسمبر ۱۹۷۷ء کو 'اطلاعات' میں خمینی کے خلاف ایک نہایت اشتعال انگیز مضمون شائع ہوا۔

بعض اوقات بڑی بڑی تحریکوں کی ابتدا بھی کسی چھوٹے سے واقعے سے ہوتی ہے۔ چنگاریاں اندر ہی اندر سلگتی رہتی ہیں۔ پھر ایک روز کہیں سے ہوا کا ایک جھونکا آتا ہے اور یہی دبی ہوئی چنگاریاں شعلہ بن کر بھڑک اٹھتی ہیں۔ صدر نکسن کے ساتھ یہی ہوا تھا۔ جس وقت واٹر گیٹ میں ڈیموکریٹک پارٹی کے دفتر میں چوری ہوئی تھی تو کسی کو گمان بھی نہیں گزرا تھا کہ انجامِ کار امریکہ کے صدر اور نائب صدر دونوں کو ایوانِ صدر سے بے آبرو ہو کر نکلنا پڑے گا یا سی۔آئی۔اے کی رسوائی کی بدولت امریکہ کا وقار خاک میں مل جائے گا۔ جنرل ایوب خان نے 'عشرۂ ترقی' کس شان سے منایا تھا۔ لیکن ابھی جشن کا خمار بھی نہ اترا تھا کہ اسلام آباد سے دور ایک غیر معروف درسگاہ کے سامنے طلبا کی کسی بس والے سے تو تو میں میں ہوگئی۔ پولیس نے مزاحمت کی، بس پھر کیا تھا، لوگ پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پشاور سے چٹاگام تک ہلچل مچ گئی اور ایوب خان کو صدارت سے استعفیٰ دینا پڑا۔

اسی قسم کا ایک حادثہ ۱۹ر دسمبر ۱۹۷۷ء کو تہران میں پیش آیا۔ اُس دن اخبار 'اطلاعات' نے سرکار کا بھیجا ہوا ایک مقالہ جلا وطن رہنما آیت اللہ خمینی کو بد نام کرنے کی غرض سے شائع کیا۔ مقالے میں ان پر ایک غیر ملکی طاقت کا ایجنٹ ہونے اور عرب ملکوں سے رقمیں وصول کرنے کا الزام لگایا گیا تھا۔ آیت اللہ خمینی ایران کے سب سے با اثر مجتہد ہیں۔ وہ ۱۹۰۰ء میں شہر خمین میں پیدا ہوئے، قم میں تعلیم پائی (یہ شہر تہران کے جنوب میں ایران کا نہایت مقدس مقام ہے۔ حضرت امام علی رضا کی ہمشیرہ معصومۂ قم کا مزار وہیں ہے) اور وہیں اجتہاد کے مرتبے تک پہنچے۔ ۱۹۶۳ء میں جب شاہ کی حکومت نے امریکیوں کو ایرانی قوانین سے مستثنیٰ قرار دیا تو آیت اللہ خمینی نے اس فیصلے کی شدت سے مخالفت کی کیونکہ کسی آزاد ملک میں سفارتی عملے کے علاوہ کوئی شخص ملکی قوانین سے مستثنیٰ نہیں ہوتا۔ شاہ کے فیصلے کے خلاف جب ہنگامے شروع ہوئے تو آیت اللہ خمینی کو ملک بدر کردیا گیا۔ اُن کے ساتھی چن چن کر پکڑے گئے اور 'بہتوں کو دردناک اور رونگٹے کھڑے کرنے والی اذیتیں دے کر ہلاک کردیا گیا'۔ آیت اللہ خمینی پہلے ترکی گئے اور پھر عراق جاکر نجف اشرف میں مقیم ہوگئے۔ البتہ ۱۹۷۸ء کے وسط میں جب قومی تحریک نے زور پکڑا تو شاہ نے عراق پر دباؤ ڈالا لہٰذا آیت اللہ خمینی کو عراق سے نکلنا پڑا۔ انہوں نے جلا وطنی کے آخری مہینے پیرس کے مضافات میں گزارے۔

دسمبر ۱۹۷۷ء میں جس وقت ان کے خلاف 'اطلاعات' میں مضمون شائع ہوا تو وہ نجف ہی میں تھے۔ قم میں اس مضمون کا شدید ردعمل ہوا۔ 'اطلاعات' کی ہزاروں کاپیاں سرِ عام جلائی گئیں اور ۲۰ر دسمبر کو ایک احتجاجی جلوس نکلا۔ جلوس بالکل پر امن تھا لیکن 'امنیہ' نے بلا کسی اشتعال کے اور مظاہرین کو متنبہ کیے بغیر ان پر اندھا دھند گولی چلائی جس میں دو سو سے زیادہ افراد ہلاک ہوئے۔ اس حادثے کے بعد ایران کے دوسرے شہروں میں بھی احتجاجی جلوس نکلے اور 'امنیہ' نے بار بار گولی چلائی۔

بظاہر یہی محسوس ہوتا ہے کہ اخبار 'اطلاعات' نے اگر آیت اللہ خمینی کے خلاف مضمون نہ چھاپا ہوتا تو کشت وخون کی نوبت نہ آتی اور نہ شاہ کو تخت چھوڑنا پڑتا لیکن یہ حادثہ درحقیقت شاہ کی سیاسی موت کا فقط ایک بہانہ تھا۔ نفرت کا مادہ تو ایک عرصے سے پک رہا تھا۔

۸ جنوری ۱۹۷۸ء شہدائے قم کا چہلم ایران کے گوشے گوشے میں منایا گیا۔ فیکٹریاں، کارخانے، بازار، دفاتر سب بند ہو گئے۔ لوگ ہر جگہ پُرامن تھے لیکن امنیہ کو اپنی طاقت کا بہر صورت مظاہرہ کرنا تھا لہٰذا قم میں سوگ منانے والے جلوس پر فائرنگ کی گئی جس میں کئی آدمی ہلاک ہوئے۔ ۱۸ر فروری کو ان شہدا کا چہلم کہیں زیادہ بڑے پیمانے پر منایا گیا۔ اس دن سب سے بڑا مظاہرہ تبریز میں ہوا جہاں 'سارا شہر سڑکوں پر نکل آیا تھا۔ البتہ مظاہرین بالکل پُرامن تھے پھر بھی ان پر ٹینکوں اور ہیلی کوپٹروں سے گولہ باری کی گئی۔ اس دن تبریز والوں نے ایک نیا منظر دیکھا۔ سپاہیوں کے ایک گروہ پر فوج کی اس سفاکانہ حرکت کا اتنا اثر ہوا کہ انہوں نے اپنی وردیاں پھاڑ ڈالیں اور جلوس میں شامل ہو گئے۔ ایک اندازے کے مطابق اس قتل عام میں ایک ہزار تا پندرہ سو افراد شہید اور دو ہزار سے زائد زخمی ہو گئے۔'

مگر ایران کے لوگ گولیوں اور بموں کو خاطر میں لانے والے نہیں تھے۔ جیسے انہوں نے عہد کر لیا ہو کہ خواہ کتنی قربانی کیوں نہ دینی پڑے اس ظالم بادشاہ سے نجات حاصل کیے بغیر دم نہ لیں گے۔ آیت اللہ خمینی کی تقریروں کے ٹیپ عراق سے زائرین کے ذریعے آتے اور مسجدوں میں اور نجی صحبتوں میں سنائے جاتے۔ ان تقریروں میں شاہ کے خلاف جدوجہد کو تیز سے تیز تر کرنے کی تلقین کی جاتی تھی۔ اسی اثنا میں علمائے دین اور نیشنل فرنٹ نے بائیں بازو کی جماعتوں، بازار کے دکانداروں، طالبعلموں، ادیبوں اور صحافیوں کے نمائندوں کے مشورے سے ایک دس نکاتی منشور تیار کیا اور یہ مطالبہ کیا کہ ساواک کے سربراہ جنرل محمد نصیری کو (جو ملٹری اکیڈمی میں شاہ کا ہم جماعت رہ چکا تھا اور اس کا معتمدِ خاص سمجھا جاتا تھا) برطرف کیا جائے، امریکی مشیروں اور ماہروں کو واپس بھیج دیا جائے، شہری آزادی بحال کی جائے، سیاسی قیدیوں کو رہا کیا جائے۔ خائن اور رشوت خور وزیروں پر مقدمہ چلایا جائے، بلا سود کے بینکاری ہو، شراب اور جوئے پر پابندی لگائی جائے۔

اب ہر شہر میں مظاہروں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور تہران سمیت تیس شہروں میں لوگ سرکاری احکام کی پرواہ کیے بغیر کھلے بندوں مظاہرے کرنے لگے۔ بعض مقامات پر بینکوں، سینما گھروں اور سرکاری عمارتوں پر حملے بھی ہوئے اور جب امنیہ حالات پر قابو نہ پاسکا تو فوج طلب کر لی گئی۔

رفتہ رفتہ شاہ بھی یہ سوچنے پر مجبور ہوا کہ یہ تحریک فقط تشدد سے دبنے والی نہیں بلکہ لوگوں کے مشتعل جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لیے کوئی مثبت قدم اٹھانا پڑے گا۔ چنانچہ جون میں حکومت میں بڑی تبدیلیاں ہوئیں۔ امیر عباس ہویدا کو برطرف کر کے جمشید آموزگار کو وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ جنرل نصیری کو ساواک کی سربراہی سے ہٹا کر پاکستان میں سفیر بنا کر بھیج دیا گیا اور اس کا نائب جنرل معتزد شام میں سفیر مقرر ہوا اور جنرل ناصر مقدم کو ساواک کا ڈائریکٹر بنا دیا گیا۔ ان تبدیلیوں کے علاوہ شاہ نے یہ اعلان بھی کیا کہ مجلس کے انتخابات معمول کے مطابق جون ۱۹۷۹ء میں ہوں گے اور اس الیکشن میں حزب تودہ کے علاوہ تمام سیاسی جماعتوں کو شرکت کی عام اجازت ہوگی حالانکہ مئی میں شاہ صاحب کہہ چکے تھے کہ کثیر التعداد سیاسی پارٹیاں ملک کے لیے مناسب نہیں ہیں۔ شاہ نے 'آزاد الیکشن' کا بھی یقین دلایا۔

لیکن ان اعلانات اور یقین دہانیوں کا لوگوں پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ ادھر خمینی اپنی ریکارڈ شدہ تقریروں میں لوگوں کو متنبہ کر رہے تھے کہ شاہ تم کو دھوکہ دے رہا ہے، اس کی باتوں میں نہ آنا اور اس کو تخت سے ہٹائے بغیر دم نہ لینا۔

۱۹/ اگست کو ابادان کے ایک سینما گھر میں آگ لگی جس میں چار سو تماشائی جل کر ہلاک ہوگئے۔ ہال کے دروازوں کا باہر سے بند ہونا، سینما کے عملے کی غیر حاضری اور فائر بریگیڈ کے انجنوں کا تاخیر سے پہنچنا ایسے واقعات تھے جن سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ یہ مجرمانہ حرکت ساواک کی تھی جس نے لوگوں کو عوامی تحریک سے بدظن کرنے کی غرض سے یہ کارروائی کی تھی لیکن اس کا اثر الٹا ہوا۔ عوامی نفرت اور غصے کا پارہ دوچار ڈگری اور بڑھ گیا۔ ابادان تیل کی صنعت کا مرکز ہے۔ شاہ نے وہاں کے شہریوں کو مشتعل کر کے اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی مار لی۔ چنانچہ سینما کے حادثے کے بعد ابادان کے مزدوروں نے احتجاجاً ہڑتال کر دی اور تیل پیدا کرنے والی مشینوں کے پہیے رک گئے۔ تب جمشید آموزگار نے استعفیٰ دے دیا اور ان کی جگہ جعفر شریف امامی وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ جعفر شریف مذہبی آدمی تھے۔ علما کے ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور مذہبی حلقوں میں بھی ان کا تھوڑا بہت اثر تھا۔ انہوں نے لوگوں کے مذہبی جذبات کی تسکین کی خاطر کوروش اعظم والے کیلنڈر کو جو تین سال پہلے رائج ہوا تھا منسوخ

کر کے پرانے ہجری قمری کیلنڈر کو بحال کیا، شبینہ کلب بند کروا دیے اور پریس کو بھی تھوڑی آزادی دے دی۔ لیکن شورش برابر بڑھتی ہی گئی۔

۲۶ راگست کو عید الفطر سے دس دن قبل اصفہان میں جو بہت بڑا صنعتی شہر ہے زبردست ہنگامہ ہوا۔ سینکڑوں مظاہرین شہید ہوئے اور لوٹ مار اور آتش زنی کے واقعات پیش آئے چنانچہ شہر میں مارشل لاء لگا دیا گیا۔ اب اصفہان والے بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ تحریک کے دوران میں پہلا مارشل لاء ہمارے شہر میں لگا تھا۔ چند دنوں بعد تہران سمیت گیارہ دوسرے شہروں میں بھی مارشل لاء نافذ ہوگیا مگر فوج جتنا تشدد کرتی لوگوں کی برہمی بڑھتی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دس نکاتی مطالبات بالائے طاق رکھ دیے گئے اور اب پوری قوم کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ شاہ تخت سے دست بردار ہو جائے، اور 'مرگ بر شاہ' مظاہرین کا واحد نعرہ بن گیا۔

اور عید کا چاند شاہ کی آمریت کے لیے واقعی موت کا پیغام لے کر آیا۔ ۵ ستمبر کو عید الفطر کا تیوہار تھا۔ تہران میں شہریوں نے اب کے عید اس شان سے منائی کہ کئی لاکھ مظاہرین کا ایک جلوس مارشل لاء کی خلاف ورزی میں نکلا۔ فوج نے جلوس پر ہیلی کاپٹروں سے فائرنگ کی۔ اس فائرنگ سے کئی سو افراد ہلاک اور زخمی ہوئے۔ اس حادثے کے بعد آیت اللہ نوری نے شہریوں سے اپیل کی کہ وہ اپنے گھروں میں خاموشی سے بیٹھیں اور مظاہروں سے باز آئیں لیکن لوگوں نے ان کے مشورے کی پرواہ نہ کی اور ۸ ستمبر کو جمعہ کے روز عید والے جلوس سے بھی کئی گنا بڑا جلوس نکلا۔ فوج نے اس جلوس پر مشین گنوں سے گولیاں برسائیں۔ غیر جانبدار اخباروں کے بیان کے مطابق اس قتل عام میں تین ہزار سے چھ ہزار تک مظاہرین شہید ہوئے۔ شہر میں کرفیو لگا دیا گیا اور ایک ہزار سے زائد افراد گرفتار کر لیے گئے۔ جنرل غلام علی اویسی جو اپنی سخت گیری کے لیے بہت بدنام تھا شہر کا فوجی گورنر مقرر ہوا۔

تہران میں مظاہروں کا سلسلہ رک گیا۔ فضا بظاہر پرسکون ہوگئی لیکن یہ سکون طوفان کی آمد کا پیش خیمہ تھا۔ چنانچہ اکتوبر میں صحافیوں نے سنسر کے خلاف احتجاجاً ۲۷ گھنٹے کی ہڑتال کر دی۔ اس ہڑتال میں 'کیہان' اور 'اطلاعات' جیسے سرکاری اخباروں کے صحافی بھی شریک ہوئے اور تین دن تک ملک بھر میں کوئی اخبار شائع نہیں ہوا۔ آخر جعفر امامی کو پریس پر سے تمام

پابندیاں ہٹانی پڑیں۔ ڈاکٹر مصدق کی برطرفی کے بعد ایرانی پریس پہلی بار آزاد ہوا تھا۔

یونیورسٹیاں تقریباً سال بھر سے بند تھیں کیونکہ غیر جمہوری حکومتیں طلبا سے بہت خوف کھاتی ہیں۔ چنانچہ کوئی عوامی تحریک اٹھے سب سے پہلے یونیورسٹیاں، کالج اور اسکول بند کیے جاتے ہیں تاکہ طلبا یکجا ہوکر کوئی عملی قدم نہ اٹھا سکیں۔ طلبا کا اصرار تھا کہ درسگاہیں کھلیں اور پڑھائی کا جو حرج ہوا ہے اس کی کچھ تلافی ہوجائے مگر حکومت نے ان کی تجویز مسترد کردی۔ تس پر ۵ نومبر کو تہران یونیورسٹی کے دس ہزار طلبا اور طالبات یونیورسٹی کے کھیل کے میدان میں جمع ہوئے اور انہوں نے جلوس کی شکل میں یونیورسٹی کے پھاٹک کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ ہفت روزہ 'نیوز ویک' کے نامہ نگاروں کے بیان کے مطابق 'ان دس ہزار طلبا کا نعرہ تھا کہ امریکی شاہ کو پھانسی دو۔ وہ کیمپس کے پھاٹک کی جانب بڑھ رہے تھے۔ پھاٹک کے دوسری طرف پانچ سو سپاہی رائفلوں پر کرچیں لگائے کھڑے تھے...... اچانک انہوں نے پہلے آنسو گیس پھینکی اور پھر گولیاں برسانے لگے۔'[۳۷] ...... اس حادثے میں ۶۹ طلبا شہید اور زخمی ہوئے۔

طلبا کے اس قتل عام سے حالات اور خراب ہوگئے۔ ۶ نومبر کو یوم انتقام منایا گیا تو لوگوں کے جذبات قابو سے باہر تھے۔ توڑ پھوڑ بڑے پیمانے پر شروع ہوگئی اور بینکوں، ساواک کے دفتروں اور سرکاری عمارتوں کو آگ لگا دی گئی۔ شاہ نے جعفر امامی کی جگہ جنرل رضا ازہری کو وزیر اعظم مقرر کیا اور پورے ملک میں فوجی حکومت نافذ کردی۔ شاہ اور اس کے مشیروں کا خیال تھا کہ شریف امامی کی 'نرم' پالیسی ناکام ہوگئی ہے لہٰذا اب فوجی جنرلوں کی 'سخت' پالیسی سے کام لیا جائے۔ لہٰذا بڑے پیمانے پر گرفتاریاں شروع ہوئی۔ اخباروں پر دوبارہ سنسر بٹھا دیا گیا اور چند صحافیوں کو بھی ان کے دفتروں سے گرفتار کرلیا گیا۔ اس پر اخباروں نے احتجاجاً ہڑتال کردی جو ۶۲ روز تک جاری رہی۔

لیکن طلبا اور صحافیوں کی مخالفت سے کہیں زیادہ تشویشناک بات یہ تھی کہ تیل کے پچاس ہزار مزدوروں نے نامعلوم مدت کے لیے ہڑتال کردی تھی۔ ملک بھر میں توڑ پھوڑ اور آتش زنی کے واقعات بڑھتے جارہے تھے۔ ایران ایئر لائنز کے پائلٹوں اور ٹیکنیکل اسٹاف نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا جس کی وجہ سے ایران کے ہوائی اڈے معطل ہوگئے تھے۔ سرکاری دفتروں حتیٰ کہ

وزارتوں کے بیشتر ملازمین بھی گھروں پر بیٹھ گئے تھے اور اگر آتے تھے تو کام نہیں کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ فوج ہم کو دفتر آنے پر مجبور کرسکتی ہے لیکن کام کرنے پر مجبور نہیں کرسکتی۔ اس کے علاوہ فوج میں بھی جس کی وفاداری پر شاہ کو بڑا ناز تھا، صورتحال سے بیزاری اور حکم عدولی کے حادثات بڑھتے جا رہے تھے۔

بہشت زہرا کے قبرستان کے پاس ایک جلوس جب فوجیوں کی طرف بڑھنے لگا تو ایک نوجوان میجر نے لاؤڈ اسپیکر سے چلا کر کہا کہ "آپ لوگ ہمارے بھائی ہیں۔ ہم آپ پر گولی چلانا نہیں چاہتے۔" اور اس نے اپنی کمر سے پستول کھولا اور ہجوم کی طرف پھینک دیا اور بولا۔ "یہ لو میرا پستول اور جی چاہے تو مجھے گولی مار دو۔" ہجوم نے خوشی کا نعرہ لگایا اور فوجیوں پر پھولوں کی بوچھاڑ کردی۔[۳۲]

دسمبر کے پہلے ہفتے میں محرم آیا۔ یہ وقت شاہ پر بہت کٹھن تھا کیونکہ عشرے کے دوران میں لوگوں کے مذہبی جذبات بھڑک اٹھتے ہیں اور حسینیت اور یزیدیت کی نئی تعبیروں کے لیے ایک موزوں نفسیاتی ماحول پیدا ہوجاتا ہے۔ مغربی مبصرین کا خیال تھا کہ محرم کے دس بارہ دن اگر خیریت سے کٹ گئے تو شاہ کا تاج شاید سلامت رہ جائے لیکن اس کا کیا علاج کہ شاہ خودکشی پر تلا ہوا تھا۔ اس نے محرم کے جلوسوں کی ممانعت کردی۔ جس کی وجہ سے لوگ اور مشتعل ہوگئے۔ محرم کی مجلسیں سیاسی جلسوں میں بدل گئیں۔ جو واعظ اٹھتا وہ حادثۂ کربلا کے حوالے سے شاہ کو یزید اور فوج کو یزیدی لشکر کہہ کر لعنت ملامت کرتا۔ عاشورہ کے دن تہران میں سوگوارانِ حسین نے سرکاری احکام کی خلاف ورزی میں جلوس نکالا جس میں دس لاکھ مظاہرین شریک ہوئے۔ جلوس بے حد منظم اور پُرامن تھا البتہ تمام راستے شاہ کے خلاف نعرے لگتے رہے۔

شاہ نے ایک طرف جنرل ازہری کی فوجی حکومت کو مظاہرین کے ساتھ سختی برتنے کا حکم دیا۔ دوسری طرف تحریک کے اعتدال پسند عناصر کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ مجھ کو غلطیوں کا احساس ہوگیا ہے اور اب میں اپنی رعایا کے جذبات و احساسات کا احترام کروں گا چنانچہ شاہ نے اپنے نامناسب طرزِ عمل کا اعلانیہ اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ:

'میں پچھلی غلطیوں کی تلافی کا وعدہ کرتا ہوں۔ میں کرپشن اور ناانصافیوں کے

خلاف مہم چلاؤں گا اور آزاد انتخابات منعقد کرانے کی غرض سے ایک قومی حکومت تشکیل دوں گا۔ آپ لوگوں کا انقلابی پیغام میں نے سن لیا ہے۔ آپ نے جن باتوں کے لیے قربانی دی ہے میں اُن سے باخبر ہوں۔'

اس نئی پالیسی کے تحت سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں ۲۵ فیصد کا اضافہ کر دیا گیا تاکہ وہ پیسے کے لالچ میں کام پر واپس آ جائیں۔ ساواک کے ۳۴ سینئر افسر برطرف کر دیے گئے اور اعلان ہوا کہ ۱۰ دسمبر کو 'حقوقِ انسانی' کا دن ہوتا ہے، ایک ہزار سیاسی قیدی رہا کر دیے جائیں گے۔ کرپشن کے خلاف مہم شروع ہوئی اور ۱۰۰ کے قریب افراد گرفتار کر لیے گئے۔ ان میں سابق وزیرِ اعظم امیر عباس ہویدا، ایٹمی توانائی کے ڈائریکٹر اکبر اعتمادی، سابق وزیرِ زراعت منصور روحانی، سابق وزیرِ تجارت فریدوں مہدوی اور سابق وزیرِ صحت شجاع الدین شیخ الاسلام زادہ بھی شامل تھے لیکن فوج کے کسی جنرل یا شاہی خاندان کے کسی فرد پر آنچ نہ آئی۔ حالانکہ بقول نیوز ویک 'ایران میں کوئی کاروبار شاہی خاندان کے افراد کو ڈائریکٹر بنائے بغیر شروع ہی نہیں کیا جاسکتا تھا۔'[۷]

لیکن شاہ اپنا اعتبار کھو چکا تھا چنانچہ نہ تو کسی نے اس کے وعدوں پر یقین کیا اور نہ اس کے نئے اقدامات کو سراہا بلکہ ہر شخص کا خیال تھا کہ شیر، اب جال میں پھنسا ہے تو ہم کو بہلانے پھسلانے کی کوشش کر رہا ہے۔ رہی کرپشن کے خلاف مہم، سو لوگوں کا خیال تھا کہ یہ تماشہ ہم پندرہ سال سے دیکھ رہے ہیں۔ ہر سال دو سال کے بعد خوش خبری سنائی جاتی ہے کہ حکومت نے کرپشن کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا تہیہ کر لیا ہے لیکن کرپشن نہ جانے کیسا سخت جان درخت ہے کہ اس کی شاخیں پھیلتی ہی چلی جاتی ہیں۔

تہران میں تو محرم خیریت سے گزر گیا البتہ تبریز، اصفہان اور مشہد میں زبردست ہنگامے ہوئے بالخصوص مشہد میں جہاں فوج اور مظاہرین کے تصادم میں کئی سو افراد مارے گئے اور بہت سے دفتر جل کر خاک سیاہ ہو گئے۔

دسمبر کے آخر میں مظاہروں کا سلسلہ نئے جوش و خروش سے شروع ہوا اور پانچ روز تک جاری رہا۔ بینک، سینما، دکانیں، بازار، دفتر، فیکٹریاں، ریل گاڑیاں، بسیں، ہوائی سروس، تار

اور ڈاک کے محکمے سب بند ہو گئے۔ ساواک کے کئی دفتر جلا دیئے گئے اور کئی غیر ملکی بینک لوٹ لیے گئے۔

اب شاہ نے ایک اور چال چلی۔ غنڈوں اور بدمعاشوں کو خوب پیسے دیئے اور ان سے کہا کہ ہمارے حق میں جلوس نکالو تا کہ مظاہروں کا زور ٹوٹے اور دنیا کو معلوم ہو کہ لوگ زندگی کے تعطل اور ہڑتالوں کی تکلیف سے تنگ آ کر اب شاہ کی حمایت کرنے لگے ہیں لیکن بھاڑے کے آدمیوں نے مار پیٹ شروع کر دی اور دکانیں اور گھر لوٹنے لگے۔ فقط اصفہان میں پچاس آدمی ان کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ آخر حکومت کو یہ مصنوعی جلوس بازی روکنی پڑی۔ شکاری کا آخری نشانہ بھی خطا کر گیا۔

نئے سال کی صبح طلوع ہوئی تو آریہ مہر کا گہن لگا ہوا آفتاب اقبال ڈوبنے کے قریب تھا۔ اپنوں پرایوں سب کو یقین ہو گیا تھا کہ شاہ کا بس اب چل چلاؤ ہے۔ البتہ ہر شخص منتظر تھا کہ دیکھیں شاہ تخت سے دستبردار کس طرح ہوتا ہے۔ نیوز ویک کے نامہ نگار نے جنوری ۱۹۷۹ء کے پہلے ہفتے کی روداد قلم بند کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

> 'ڈرامے کا آخری ایکٹ شروع ہو گیا ہے۔ ایران کے کونے کونے میں بلوے ہو رہے ہیں، شاہ محمد رضا پہلوی کی فوج ہجوموں پر، جو شاہ کو تخت سے دست بردار ہونے کا شور مچا رہے ہیں، قابو پانے میں ناکام رہی ہے۔ ہڑتالوں کی وجہ سے ملک کی پوری معیشت مفلوج ہو کر رہ گئی ہے اور تیل جو ایران کی شہ رگ ہے، بالکل دستیاب نہیں ہوتا۔ واشنگٹن میں کارٹر کی حکومت شاہ کی پوری حمایت کر رہی ہے۔ البتہ اس کی خواہش ہے کہ شاہ آئینی بادشاہت پر راضی ہو جائے۔'

شاہ کا سفینہ ڈوبنے لگا تو چوہے گھبرا گھبرا کر بھاگنے لگے۔ شاہ کی ماں تاج الملوک، پوتے، پوتیاں اور دوسرے اہل خاندان کو لے کر بیٹی کے پاس کیلی فورنیا چل دیں۔ شاہ کے منہ لگے شرکتی سرمایہ دار بہت سے پہلے ہی ملک چھوڑ گئے تھے۔ جو بچ رہے تھے انہوں نے بھی بینکوں سے ڈالر نکلوائے یہاں تک کہ تہران میں بینکوں کے پاس ڈالر نہ رہے۔ امریکی حکومت

نے بھی باقی ماندہ امریکیوں کے انخلا کا بندوبست شروع کر دیا۔ سی۔آئی۔اے نے اس خوف سے کہ مبادا سوویت سرحد پر لگے ہوئے مخبری کے آلات انقلابیوں کے ہاتھ لگ جائیں، اپنی خفیہ تنصیبات اتار لیں۔ اصفہان، اہواز اور تہران کے ہوائی اڈوں پر سخت افراتفری کا عالم تھا۔ شہر سے ہوائی اڈے تک جانے والی سڑکیں موٹروں، بسوں اور ٹرکوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں۔ ہوائی اڈوں پر ہجوم سے تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ جن کو ہوائی جہاز کا ٹکٹ نہ ملتا وہ موٹر سے سرحد پار کر رہے تھے۔

مگر شاہ آخر وقت تک اپنا تخت و تاج بچانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس نے امریکہ کے مشورے پر قومی حکومت کا لالچ بھی دیا۔ جبۂ ملی کے راہنما ڈاکٹر کریم سنجابی کو جیل سے محل بلوایا اور آیت اللہ خمینی سے مفاہمت کی بات چیت کرنے لیے ان کو پیرس بھیجا۔ خمینی کی شرطیں یہ تھیں کہ شاہ تخت سے دست بردار ہو جائے، اس کے بعد عام استصواب کے ذریعے یہ معلوم کیا جائے کہ لوگ آیا ملوکیت کے حق میں ہیں یا جمہوریت چاہتے ہیں اور تب نئی آئین ساز اسمبلی ملک کا نیا آئین مرتب کرے لیکن کریم سنجابی، خمینی کا پیغام لے کر تہران واپس لوٹے تو اُن کو گھر پہنچتے ہی گرفتار کر لیا گیا۔ غالباً شاہ کو خمینی کی شرطوں کا علم ہو گیا تھا۔

تب شاہ نے ۷۳ سالہ غلام حسین صادق کو جو ۱۹۵۲ء میں ڈاکٹر مصدق کے وزیر داخلہ رہ چکے تھے، قومی حکومت بنانے کو کہا لیکن وہ ناکام ہو گئے۔ اب ڈاکٹر شاپور بختیار کو طلب کیا گیا جو ڈاکٹر مصدق کی حکومت میں نائب وزیر محنت رہ چکے تھے اور جبۂ ملی سے وابستہ تھے۔ وہ شاہ کی دوسری ملکہ ثریا بختیاری اور جنرل بختیاری کے چچا زاد بھائی بھی ہیں۔ شاپور راضی ہو گئے، البتہ ان کی کابینہ میں کوئی سیاستداں شامل نہیں ہوا بلکہ سب ٹیکنوکریٹ تھے۔ قصر نیاوراں میں حلفِ وفاداری کی رسم ادا ہونے لگی تو شاہ نے اپنی تقریر میں پہلی بار یہ عندیہ ظاہر کیا کہ آئندہ وہ فقط آئینی بادشاہ ہوں گے اور امورِ مملکت میں کوئی مداخلت نہیں کریں گے۔ انہوں نے کہا کہ:

"آپ کی حکومت جونہی معمول کے مطابق کام کرنے لگے گی میں ملک سے باہر چلا جاؤں گا کیونکہ میں بہت تھک گیا ہوں اور مجھ کو طبی مشورے کی سخت ضرورت ہے۔ آئین کے مطابق میری غیر حاضری میں ایک ریجنسی کونسل تشکیل

دی جائے گی۔ میں آئندہ حکومت نہیں کروں گا بلکہ بادشاہ بن کر رہوں گا۔'

لیکن حالات معمول پر آتا تھے نہ آئے۔ خمینی نے پیرس میں فتویٰ صادر کیا کہ شاپور کی حکومت شیطان کی حکومت ہے۔ یہ حکومت عوام سے غداری کرنے والوں نے بنائی ہے لہٰذا اس سے تعاون گناہ ہے۔ اس وقت شاہ کے مشیر دو دھڑوں میں بٹ گئے تھے۔ اوّل وہ 'شاہین بچے' جن کا اصرار تھا کہ ملک کو فوج کے حوالے کر دیا جائے تاکہ وہ عوامی تحریک کا قلع قمع کر دے چاہے ملک میں خون کی ندی کیوں نہ بہہ جائے۔ اس گروہ کا سرغنہ جنرل عباس قرابازقی وزیر داخلہ تھا۔ اس کو اردشیر زاہدی اور کسنجر کی حمایت حاصل تھی۔ دوسرا گروہ نرم اور گرم دونوں طرح کی حکمتِ عملی کا قائل تھا۔ اس گروہ کے سرغنہ ڈاکٹر شاپور بختیار تھے جن کو امریکی حکومت کی تائید حاصل تھی۔ شاہ نے جب حکومت شاپور بختیار کے سپرد کی اور فوجی جنرلوں کو حکم دیا کہ وہ بختیار کو صورتحال سے نمٹنے کا موقع دیں تو تہران کے مارشل لاء کے گورنر جنرل غلام علی اویسی اور جنرل قرابازقی نے استعفیٰ دے دیا اور امریکہ پرواز کر گئے۔

شاپور بختیار نے اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے کی غرض سے مجلس شورائی ملی کا اجلاس طلب کیا اور اعلان کیا کہ اسرائیل اور جنوبی افریقہ کو تیل کی سپلائی بند کی جا رہی ہے۔ ساواک کے لامحدود اختیارات پر پابندی لگا دی گئی ہے اور اس سے جو ناانصافیاں سرزد ہوئی ہیں ان کی تحقیقات ہو رہی ہیں۔ شاپور نے عمر قید کی سزا بھگتنے والے ۲۶۸ قیدیوں کو رہا کر دیا اور وعدہ کیا کہ ہڑتالی مزدوروں کو بھی رہا کر دیا جائے گا۔ تیل کی تقسیم کی نگرانی مزدور کریں گے، مارشل لاء بتدریج ہٹا لیا جائے گا اور مجلس کے نئے انتخابات وقتِ مقررہ پر ہوں گے لیکن اب تو رستخیز کے نمائندوں نے بھی جو شاہ کے آوردہ پروردہ تھے، آنکھیں پھیر لی تھیں۔ چنانچہ اعتماد کا ووٹ وعدۂ فردا کی نذر ہو گیا۔

اس اثناء میں شاہ امریکی حکومت اور امریکی صحافیوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتا رہا کہ فتنہ وفساد کے پیچھے دراصل کمیونسٹ ہیں اور اگر میں نہ رہا تو وہ ایران پر قبضہ کر لیں گے۔ شاہ نے آخر میں تو یہاں تک کہہ دیا کہ 'اگر امریکہ کو فکر نہیں کہ ایران میں اسلامی ری پبلک بنتی ہے یا مارکسٹ ریاست قائم ہوتی ہے تو پھر میں اپنے ملک کو خانہ جنگی میں کیوں جھونکوں۔' (۲۹ جنوری)

شاہ کا خیال تھا کہ اگر میں نے امریکہ کو کمیونسٹوں کا خوف دلایا تو شاید امریکہ ایران میں اپنی فوجیں اتار دے اور میرا تخت بچ جائے لیکن امریکی حکومت کو بخوبی معلوم تھا کہ ایران میں فوجی مداخلت ہوئی تو پورے مشرق وسطیٰ میں آگ لگ جائے گی۔ شاہ نے روانگی کا حتمی فیصلہ اس وقت کیا جب اس کو امریکہ کا یہ 'مشورہ' موصول ہوا کہ آپ کے حق میں اب بہتر یہی ہے کہ ملک چھوڑ دیں۔

اور آخر وہ دن آ ہی گیا۔ ۲۹ جنوری کی شام کو شاہ نے محل کے عملے کو اپنی روانگی سے مطلع کیا۔ ۳۰ جنوری کو وہ پریس کانفرنس کرنے والا تھا لیکن مصاحبوں نے مشورہ دیا کہ چلتے وقت بھڑ کے چھتے کو نہ چھیڑیں لہٰذا شاہ اپنی 'محبوب رعایا' کو بتائے بغیر چپکے سے قاہرہ روانہ ہوگیا۔ ۵۳ سالہ پہلوی آمریت کاغذی محل کی طرح زمین بوس ہوگئی۔

اُس دن تہران میں بڑی سردی تھی اور ہلکی ہلکی بوندا باندی بھی ہورہی تھی مگر سہ پہر میں جونہی ریڈیو سے اعلان ہوا کہ شاہ اور شاہ بانو قاہرہ چلے گئے۔ سارا شہر سڑکوں پر نکل آیا۔ لوگ خوشی سے ناچ رہے تھے، گلے مل رہے تھے۔ ایک دوسرے کو فتح کی مبارک باد، دے رہے تھے۔ پھول برسائے جارہے تھے۔ مٹھائیاں تقسیم ہورہی تھیں۔ فوجیوں نے اپنی توپوں، ٹینکوں اور رائفلوں پر، جو کل تک آگ اگل رہے تھے کارنیشن کے پھول سجا لیے تھے۔ شہر میں جہاں کہیں شاہ یا اس کے باپ کا مجسمہ نظر آتا لوگ اس کو جوتوں کا ہار پہناتے اور کھینچ کر نیچے گرادیتے۔ شام ہوتے ہوتے ایک مجسمہ بھی سلامت نہیں بچا۔

خمینی کی ہدایت پر تیسرے دن یوم نجات منایا گیا۔ اس روز تہران میں جو جلوس نکلا، اس میں دس لاکھ شہریوں نے شرکت کی۔ اس جلوس کی شان ہی نرالی تھی۔ عورتیں، مرد، بچے، بوڑھے سب کے چہرے ہنس رہے تھے۔

ادھر شاپور بختیار ریڈیو پر تقریر میں لوگوں سے کہہ رہا تھا کہ میری حکومت کا ساتھ دو۔ کیا تم ایک جابر کو ہٹا کر دوسرے جابر کو لانا چاہتے ہو؟ اس نے کہا کہ آیت اللہ خمینی بہت قابل احترام مذہبی رہنما ہیں۔ وہ جب چاہیں شوق سے وطن واپس آئیں، 'مگر میں کسی آیت اللہ کے لیے حکومت سے دست بردار نہیں ہوں گا۔ ایک پادری وزیراعظم کی جگہ نہیں لے سکتا۔'

لیکن موصوف بس نام کے وزیراعظم تھے ملک میں ان کا اختیار دفتر کے کمرے تک محدود تھا۔ شاپور پھر بھی کرسی چھوڑنے پر تیار نہ تھا بلکہ بار بار یہ دھمکی دے رہا تھا کہ اگر میں گیا تو فوج آجائے گی۔ لیکن جو لوگ جنرل زہری کی فوجی حکومت کو خاطر میں نہ لائے وہ ان کی گیڈر بھبھکیوں سے کیوں ڈرتے۔

اب خمینی کے استقبال کی تیاریاں ہونے لگیں۔ شاپور میں یہ جرأت تو نہ تھی کہ وہ خمینی کو ایران آنے سے روکتا البتہ اس کی برابر یہ کوشش تھی کہ آیت اللہ کی واپسی میں جتنی تاخیر ممکن ہو، کی جائے۔ اس نے تین دن کے لیے تہران کا ایئر پورٹ بند کردیا لیکن آخر اجازت دینی پڑی۔ خمینی یکم فروری ۱۹۷۹ء کو پیرس سے تہران پہنچے تو دس لاکھ کے ہجوم نے ان کا خیر مقدم کیا۔ دو دن بعد جنرلوں نے اعلان کیا کہ حکومت اور عوام کے تصادم میں فوج غیر جانب دار رہے گی اور فوج کو بارکوں میں واپس بلالیا گیا۔ شاپور کا آخری سہارا بھی ختم ہوگیا اور وہ بھاگ کر چھپ گیا۔ خمینی نے ڈاکٹر مہدی بازارگان کو وزیراعظم مقرر کیا البتہ تمام اختیارات کا مرکز خمینی صاحب خود تھے۔ انقلابی جدو جہد کا پہلا دور جس میں کم از کم پندرہ ہزار محبانِ وطن نے اپنی جانیں قربان کیں اور ملک کو کروڑوں کا نقصان ہوا، آخرکار انجام کو پہنچا۔

امریکی طرزِ عمل

انقلابِ ایران کے دوران میں امریکہ نے جو کردار ادا کیا اس کی اصل حقیقت تو شاید دو چار سال بعد منظر عام پر آئے۔ البتہ امریکی حکومت کے طرزِ عمل کے بارے میں قیاس آرائیاں برابر ہوتی رہی ہیں۔ بعض امریکی مبصرین کا خیال ہے کہ تہران کے امریکی سفارتخانے اور سی۔آئی۔اے دونوں نے شاہ کی مخالف قوتوں کا اندازہ لگانے میں غلطی کی اور صدر کارٹر کو دھوکے میں رکھا۔ دوسرے حلقے کا خیال ہے کہ صدر کارٹر اور ان کے مشیر مصر کے صدر سادات کو شیشے میں اتارنے میں اتنے مصروف تھے کہ ان کو ایرانی مسائل کی طرف توجہ دینے کی فرصت ہی نہ ملی۔ تیسرا حلقہ کہتا ہے کہ امریکہ کو شاہ کے توسیعی عزائم کی جانب سے تشویش پیدا ہوگئی تھی اور تیل کے بارے میں شاہ نے جو مؤقف اختیار کیا تھا امریکہ اس کی وجہ سے بھی شاہ سے

ناخوش تھا لہٰذا شاہ کو سبق سکھانے کی غرض سے بے تعلقی کا رویہ اختیار کیا گیا۔ البتہ امریکہ در پردہ خمینی کا حامی تھا۔ چوتھے حلقے کی رائے یہ ہے کہ ویت نام کے تلخ تجربوں اور واٹر گیٹ کی بدنامیوں کے بعد امریکی حکومت کسی ملک میں اپنی فوجیں اتار کر بڑے پیمانے پر مداخلت کرنے کی جرأت نہیں کر سکتی تھی۔ ایران میں تو فوجی مداخلت اس وجہ سے بھی بہت مشکل تھی کہ وہاں ویت نام کی مانند مسلح جنگ نہیں ہو رہی تھی بلکہ وہاں کے ۳ء۵ کروڑ باشندے اپنے انسانی حقوق کی خاطر پُرامن جدو جہد کر رہے تھے، اور یہ وہی انسانی حقوق تھے جن کو صدر کارٹر نے اپنی خارجہ پالیسی کا اہم عنصر قرار دیا تھا۔ اس کے علاوہ ایران کی سرحد سوویت یونین سے ملتی ہے اور امریکہ کی فوجی مداخلت کی صورت میں سوویت یونین حالات کا خاموش تماشائی ہرگز نہ بنا رہتا۔ آیئے امریکی حکومت کے طرزِ عمل کا واقعات کی روشنی میں جائزہ لیں۔ ممکن ہے کہ ہم اس نتیجے پر پہنچیں کہ امریکی رویے کے تعین میں یہ چاروں عناصر کارفرما تھے۔

اس دور کا پہلا اور نہایت اہم واقعہ رضا شاہ پہلوی کا نومبر ۱۹۷۷ء کا سفر واشنگٹن ہے۔ شاہ کے اس سفر کو 'کامیاب' بنانے کی غرض سے ساواک نے سی۔آئی۔اے کے تعاون سے ایک کروڑ دس لاکھ ڈالر (گیارہ کروڑ روپے) واشنگٹن میں خرچ کیے تھے (ہفت روزہ ٹائم، نیویارک ۶/ اگست ۱۹۷۹ء)۔ امریکی حکام پر شاہ کی مقبولیت کا رعب جمانے کی خاطر کئی ہزار نوجوان 'طالب علم' ہوائی جہاز سے واشنگٹن لے جائے گئے تاکہ وہ وہائٹ ہاؤس کے روبرو شاہ کا پُرجوش خیر مقدم کریں اور امریکہ میں مقیم ایرانی طلبا شاہ کے ظلم وتشدد کے خلاف جو مظاہرہ کرنے والے تھے اسے ناکام بنا دیں لیکن ایرانی طلبا کی یلغار پر جس طرح بھاڑے کے 'شاہی طالبعلم' میدان چھوڑ کر بھاگے اس کا منظر صدر کارٹر اور ان کے وزرا نے اپنی آنکھوں سے دیکھا بلکہ احتجاجی طلبا پر (جو شاہ کے خلاف بڑے بڑے پوسٹر اٹھائے ہوئے تھے) جب پولیس نے اشک آور گیس پھینکی تو صدر کارٹر اور شاہ دونوں کو رومال سے آنسو پونچھنے پڑے۔ شاہ کی مقبولیت کا بھانڈا عین وہائٹ ہاؤس کے سامنے پھوٹ گیا۔

اس کے بعد دسمبر ۱۹۷۷ء کے آخری دنوں میں صدر کارٹر نے تہران کا سرکاری دورہ کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایران میں شاہ کے نام محضروں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ ادیبوں اور

وکیلوں کے مطالبات شائع ہو چکے تھے۔ تہران یونیورسٹی میں طلبا نے جو مظاہرہ کیا تھا، ساواک نے اس کو منتشر کر دیا تھا۔ کرج کے مقام پر مظاہرین اور ساواک کے تصادم میں بہت سے لوگ زخمی ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ اخبار 'اطلاعات' میں آیت اللہ خمینی کے خلاف اشتعال انگیز مضمون کی اشاعت، مضمون کے خلاف اہلِ قلم کا ردعمل، مظاہرین پر فائرنگ، ایمنسٹی انٹرنیشنل (Amnesty International) کی ایران میں انسانی حقوق کی پامالی اور سیاسی قیدیوں پر مظالم کی رپورٹ کی اشاعت، برطانوی پارلیمنٹ کے وفد کی شاہ سے حقوق انسانی کے بارے میں ملاقات اور دنیا بھر کے اخبارات میں ایران کے اقتصادی بحران اور سیاسی بے چینیوں کا تذکرہ ایسے واقعات نہ تھے کہ صدر کارٹر اور ان کے مشیروں کو ان کی سرے سے خبر ہی نہ ہو۔ اس کے باوجود صدر کارٹر ۳۱ دسمبر ۱۹۷۷ء کی رات کو نئے سال کی تقریب میں شاہ کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے اعلان فرماتے ہیں:

'ایران مشرق وسطیٰ میں استحکام اور پائیداری کا جزیرہ ہے۔'

حالانکہ عوامی نفرت کی لہریں 'استحکام اور پائیداری' کے اس جزیرے کو غرقاب کرنے کے لیے قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھیں۔

وقت گزرتا رہا لیکن امریکی حکومت کے 'عالمِ بے خبری' میں کوئی فرق نہ آیا۔ چنانچہ آٹھ ماہ بعد اگست ۱۹۷۸ء میں کہ ایران میں بلوے بڑے پیمانے پر شروع ہو چکے تھے، سی۔آئی۔اے نے صدر کارٹر کو اپنی رپورٹ میں اطلاع دی کہ 'ایران میں انقلاب کجا، انقلاب سے قبل کے حالات بھی رونما نہیں ہوئے ہیں' اور امریکی سفیر مسٹر سلی وین کی رائے تھی کہ 'ایران کے حالیہ ہنگامے بہت معمولی اور غیر اہم ہیں۔ شاہ کو کسی قسم کا خطرہ درپیش نہیں۔' موصوف ویت نام میں 'کامیاب' سفارت سے فارغ ہونے کے بعد جون ۱۹۷۷ء میں تہران تشریف لائے تھے اور ایشیائی امور کے بہت بڑے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ 'نیوز ویک' کی رپورٹ کے مطابق مسٹر سلی وین شاہ سے روزانہ ملتے اور اُن کو اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتے تھے۔ اِدھر واشنگٹن میں شاہ کے داماد اور سفیر اردشیر زاہدی کے گہرے تعلقات صدر کارٹر کے نیشنل سیکورٹی کے مشیر اعلیٰ مسٹر بریزنسکی سے تھے۔ بریزنسکی صاحب مسٹر سلی وین سے بھی بڑے سیاسی بزرجمہر سمجھے جاتے

ہیں۔ مسٹر بریزنسکی کی رائے تھی کہ شاہ کے مخالفین کو پوری طاقت سے کچل دیا جائے اور ایران میں ایک فوجی حکومت قائم کی جائے۔ چنانچہ اردشیر زاہدی کی ایک دستاویز شاہی محل سے برآمد ہوئی ہے جس میں اس نے شاہ کو اطلاع دی تھی کہ مسٹر بریزنسکی، ڈاکٹر ہنری کسنجر سابق وزیر خارجہ، نلسن راکفیلر، سینیٹر ہوورڈ بیکر اور سینیٹر ابراہام ربی کوف اس بات پر متفق ہیں کہ ایران میں فوجی حکومت قائم کردی جائے۔ اردشیر زاہدی نے کسنجر کے یہ الفاظ نقل کیے تھے کہ 'میری رائے ہے کہ جن سیاسی قیدیوں کو حال ہی میں رہا کیا گیا ہے وہ دوبارہ پکڑ لیے جائیں اور مظاہرین سے سختی کے ساتھ پیش آیا جائے۔'

مسٹر بریزنسکی امریکی سیاست کے 'حلقۂ شاہین' (hawk) سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے 'بحرانی قوس' (arc of crisis) کے نظریے کے مطابق وسطی ایشیا سے شمال مشرقی افریقہ تک کا علاقہ سوویت یونین کی زد میں ہے۔ اس علاقائی 'قوس' کو سوویت یونین سے بچانے کے لیے امریکہ کو 'سخت' رویہ اختیار کرنا چاہیے بلکہ بوقت ضرورت فوجی مداخلت سے بھی گریز نہیں کرنا چاہیے۔ بریزنسکی کے نزدیک ایران اس 'بحران زدہ قوس' کا اہم حصہ تھا لہٰذا امریکہ کو وہاں مداخلت سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وزیر خارجہ مسٹر سائرس وانس اور صدر کارٹر دونوں اس نظریے سے متفق نہ تھے یا ان کو مہم پسندی کے عواقب ونتائج کا بریزنسکی سے زیادہ احساس تھا۔ وہ شاہ کی اخلاقی امداد اور حوصلہ افزائی کے حق میں تھے لیکن فوجی مداخلت کر کے اپنی انگلیاں جلانے کے لیے تیار نہ تھے۔

ایرانی مسائل پر غور وفکر کے لیے ایک سابق نائب وزیر خارجہ اور 'ماہر مشرق' مسٹر جارج بال کی خدمات حاصل کی گئیں۔ نائب وزیر خارجہ ڈیوڈ نیوسم کو کہ وہ امور پاکستان کے بھی ماہر ہیں چھٹی سے واپس بلایا گیا۔ صدر کارٹر نے شاہ اور دنیا کو یہ یقین دلانے کے لیے کہ امریکہ شاہ کا بدستور دوست ہے، ولی عہد پرنس رضا کو ۱۸ ویں سالگرہ منانے وہائٹ ہاؤس مدعو کیا اور اس موقع پر اعلان کیا کہ 'ایران کے ساتھ ہماری دوستی اور یکجہتی ایسی بنیاد ہے جس پر ہماری خارجہ پالیسی کی پوری عمارت کھڑی ہے۔' ایران میں شاہ نے فوجی حکومت قائم کی تو وزارت خارجہ نے فوراً شاہ کی تائید میں بیان جاری کیا اور جمہوریت پسندوں پر الزام لگاتے ہوئے کہا کہ 'ان کی

قومی حکومت میں شرکت سے انکار کے بعد شاہ کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ فوج طلب کر لی جائے۔'

شاہ کے پاس مشق ستم کے لیے گولیوں کی کمی نہ تھی لیکن اشک آور گیس کا استعمال اس فراوانی سے ہوا تھا کہ اشک آور گیس کے پٹاخے اور پولیس کے ڈنڈے جن سے مظاہرین کی 'خدمت' کی جاتی تھی ختم ہو گئے تھے۔ لہٰذا یہ سامان امریکہ نے فوراً ہوائی جہاز کے ذریعے تہران روانہ کر دیا۔

جنرل ازہری کی فوجی حکومت سے پہلے بریزنسکی کی صدارت میں ایک ہنگامی اجلاس نیشنل سیکورٹی کونسل کا ہوا اور سفیر سلی وین کو ہدایت بھیجی گئی کہ 'شاہ کو مطلع کر دو کہ وہ جو قدم بھی اٹھائیں گے امریکہ اس کی حمایت کرے گا۔'

جنرل ازہری کی فوجی حکومت کی ناکامی کے بعد امریکہ شاہ کے مستقبل کی طرف سے مایوس ہو گیا۔ اس نے طیارہ بردار جنگی جہاز کو بحرالکاہل سے بحر ہند کی جانب روانگی کا حکم تو دیا کہ شاید مظاہرین کے حوصلے اس خیال سے پست ہو جائیں کہ امریکہ فوجی مداخلت کر رہا ہے لیکن مظاہرین کا غصہ اور تیز ہو گیا۔ کئی امریکن مارے گئے۔ 'امریکی کتوں ایران خالی کر دو' اور 'مرگ بر کارٹر' کے نعروں میں اور شدت پیدا ہو گئی لہٰذا جنگی جہاز سنگاپور سے آگے نہیں بڑھا بلکہ ۴۵ ہزار امریکیوں کا انخلا شروع ہو گیا۔ شاہ پسند امریکیوں نے جب امریکی حکومت پر یہ الزام لگایا کہ امریکہ وقت پڑنے پر اپنے دوستوں کا ساتھ نہیں دیتا تو سرکاری ترجمان نے جواب دیا کہ 'یہ اس صورت میں ممکن تھا کہ ہم بھاری پیمانے پر مداخلت کرتے لیکن کوئی ہم کو بتائے کہ ۳،۵ کروڑ انسانوں کے ملک میں بھاری پیمانے پر مداخلت کیسے کی جاتی؟ ہم زلزلے کا ہولناک منظر دیکھ رہے ہیں مگر ہم اس کا کوئی تدارک نہیں کر سکتے۔'

حقیقت یہ ہے کہ امریکی حکومت کو ایران کی صورت حال کا ابتدا ہی سے پورا پورا علم تھا۔ البتہ اس کا خیال تھا کہ شاہ فوج اور ساواک کے ذریعے ان حالات پر قابو پالیں گے لیکن حالات جب بد سے بدتر ہوتے چلے گئے تو امریکہ کے سامنے دو راستے تھے، فوجی مداخلت بڑے پیمانے پر یا خاموشی۔ شاہین بچوں کا گروہ فوجی مداخلت کے حق میں تھا مگر دوسرا گروہ فوجی مداخلت کو

بہت خطرناک سمجھتا تھا۔ ایسا جوا جس میں ہار یقینی تھی۔ اس گروہ کا کہنا تھا کہ شاہ سے ہماری رشتہ داری تو نہیں، وہ جاتا ہے تو جائے البتہ ہم کو پوری کوشش کرنی چاہیے کہ آئندہ جو عناصر برسراقتدار آئیں ان سے ہمارے تعلقات دوستانہ ہوں۔ امریکی حکومت خمینی صاحب کی کمیونسٹ دشمنی سے بخوبی آگاہ تھی اور ان افراد کے رجحانات کا بھی علم رکھتی تھی، جو خمینی صاحب کے مشیر بنے ہوئے تھے۔

حوالہ جات

1- *Meed*, 20 July, 1979.
2- *Newsweek*, 13 November, 19/8.
3- *Newsweek*, 25 September, 1978.
4- *Ibid*.



انقلابِ ایران کے محرکات واسباب

یوں تو پہلوی طرزِ حکومت کی جو تفصیلات پچھلے صفحات میں پیش کی گئی ہیں وہ انقلاب ایران کی توجیہہ کے لیے کافی ہیں مگر انقلاب کا بنیادی سبب دراصل یہ تھا کہ تاریخِ انسانی کے موجودہ دور میں کہ سلطانئ جمہور کا دور ہے مطلق العنان بادشاہتیں نہ تو لوگوں کو قابلِ قبول ہیں اور نہ اب ان کے وجود کا کوئی جواز باقی رہا ہے۔ وہ جن کا مقدر غلامی اور بار برداری تھا اب مصر ہیں کہ زمامِ اختیار ان کے ہاتھ میں ہو اور ملک کا نظم ونسق اُن کی مرضی اور منشا سے سرانجام پائے۔ چنانچہ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے کتنے ملک آزاد ہوئے ہیں، کتنے بادشاہوں کے تخت الٹے ہیں۔ کتنے ڈکٹیٹروں کو فرار کی راہ اختیار کرنی پڑی ہے۔ برطانیہ، فرانس، ہالینڈ، پرتگال اور امریکہ سب نے اپنی نو آبادیات میں عوامی قوتوں سے شکست کھائی ہے۔ مصر کے شاہ فاروق، عراق کے شاہ فیصل، افغانستان کے ظاہر شاہ، شمالی یمن کے امام محمد، حبشہ کے شہنشاہ ہیل سیلاسی، لیبیا کے شاہ ادریس، ویت نام کے تھیو، یوگنڈا کے عیدی امین، نکاراگوا کے سموزا سب کو اقتدار اپنی رعایا کے حوالے کرنا پڑا ہے۔

ایرانی قوم میں آلام ومصائب کو برداشت کرنے کی بڑی قوت ہے۔ شاہ نے اگر دُور

اندیشی سے کام لے کر آئینی بادشاہت پر اکتفا کی ہوتی تو شاید دس پانچ سال اور گزر جاتے لیکن اس نے تو استبداد و استحصال کی انتہا کردی اور داریوش اعظم بننے کی سوچنے لگا۔ حالانکہ آج اگر داریوش قبر سے اٹھ کر آجائے تو اس کا بھی وہی حشر ہو جو ہٹلر اور مسولینی کا ہوا۔ آخر ہٹلر نے بھی تو دنیا فتح کرنے کا عزم کیا تھا۔ مارکس نے نپولین اور اس کے گھمنڈی بھتیجے لوئی بونا پارٹ بادشاہ فرانس کا موازنہ کرتے ہوئے کیا خوب کہا تھا کہ:

'ہیگل نے کہیں لکھا ہے کہ تاریخِ عالم کے تمام اہم واقعات اور اشخاص دوبار ظاہر ہوتے ہیں مگر وہ یہ اضافہ کرنا بھول گیا کہ ایک بار المیے کی صورت میں اور دوسری بار مسخروں کے بہروپ میں۔ چچا المیہ تھا اور بھتیجا مسخرہ بہروپیہ'[1]

فاؤسٹ نے دنیاوی عیش و راحت کی طلب میں شیطان سے اپنی روح کا سودا کرلیا تھا۔ رضا شاہ نے دولتِ اقتدار کی ہوس میں ایران کی آزادی اور ساڑھے تین کروڑ ایرانیوں کے جان و مال عزت و آبرو کو داؤ پر لگا دیا۔ وہ اس کا غرور کجکلاہی، وہ اس کی بے رحمی اور سفاکی، ہم وطنوں پر ظلم و ستم کے تازیانے، اغیار پر لطف و کرم کی بارش، زراندوزی کا جنون، جمہوری حقوق کی پامالی، نظم و نسق کی ابتری، رشوت، خیانت اور خورد برد کی گرم بازاری، خونِ انسان کی ارزانی اور اشیائے خور و نوش کی گرانی۔ امیروں کی روز افزوں امارت، مفلسوں کا روز افزوں افلاس اور پھر حرفِ شکایت زبان پر لانے والوں کو اذیت ناک سزائیں۔۔۔ غرضیکہ ایرانی معاشرے کا کوئی پہلو نہ تھا جو شاہ کے ناوکِ جور کا زخم خوردہ نہ تھا۔ ایران کے گزشتہ چند برسوں کے حالات کا بغور مطالعہ کرو تو یوں محسوس ہوتا ہے گویا گبن کی تصنیف 'سلطنت روما کا زوال و انحطاط' کی فلمی تصویر دکھائی جا رہی ہے، وہی دولت کا زیاں، وہی درباری سازشیں، وہی اخلاقی پستی، وہی عیاشیاں اور فضول خرچیاں، وہی فرعونیت، وہی انسان کی بے حرمتی اور انسانی قدروں کی شکست و ریخت، وہی درندوں سے بھی بڑھی ہوئی درندگی اور وہی نوشتۂ دیوار کو پڑھنے سے انکار جس کے باعث روما کی سلطنت برباد ہوئی، پہلوی سلطنت کا بھی معمول بن گیا تھا۔

مگر آمریت ایک ایسا طلسم ہے جو آخر کار آمر کو بھی اپنے جال میں پھنسا لیتا ہے۔ اس کو نہ معاشرے کی خرابیاں نظر آتی ہیں نہ وہ لوگوں کی بڑھتی ہوئی بے چینیوں کو محسوس کرتا ہے۔

اس کے جی حضوری وزرا اور مصاحب بھی اس کو وہی مشورہ دیتے ہیں جو اس کی مرضی ہوتی ہے بلکہ وہ مشیر بناتا ہی اُن کو ہے جو اُس کی ہاں میں ہاں ملائیں۔ ابلاغِ عامہ کے ذرائع دن رات اس کے نظم ونسق کی قصیدہ خوانی اور اس کی عقل وفراست کی مدح سرائی کرتے ہیں۔ سرکاری مخبر بھی اس کو ملک کے ٹھیک ٹھیک حالات سے آگاہ کرنے کے بجائے رعایا کی خوشحالی اور حاکمِ وقت کی ہر دلعزیزی کے من گھڑت قصے سناتے رہتے ہیں۔ اگر بہ فرضِ محال کسی گوشے سے اختلاف یا اعتراض کی آواز اٹھتی ہے تو اس کو یہ کہہ کر پوری قوت سے دبادیا جاتا ہے کہ یہ آواز شرپسندوں، تخریب کاروں یا بیرونی طاقت کے ایجنٹوں کی ہے جو امنِ عامہ میں خلل ڈالنے کی کوشش کررہے ہیں اور سیدھے سادے عوام کو گمراہ کررہے ہیں۔ جھوٹ کا یہ زہر رفتہ رفتہ اتنا پھیل جاتا ہے کہ ہمارا یہ ڈکیٹٹر اپنے آپ کو واقعی قوم کا محسنِ اعظم اور نجات دہندہ سمجھنے لگتا ہے۔ دور کیوں جایئے خود ہمارے ملک میں غلام محمد اور اسکندر مرزا کے وقت سے خود فریبی کا یہی تماشا کھیلا جارہا ہے۔ ایوب خاں کے وزیروں کو تو اُن کے چہرے کے گرد نور کا ہالہ دکھائی دینے لگا تھا اور افسرانِ عالی مقام کہتے تھے کہ اگر آنحضرت صلعم آخری نبی نہ ہوتے تو ہم آپ کو پیغمبر مان لیتے (معاذ اللہ) پھر رضا شاہ کو اپنی شاہانہ عظمت اور مقبولیت پر گھمنڈ تھا تو ہم کو حیرت کیوں ہو؟ البتہ اس خوش فہمی کا خمیازہ دوسرے ڈکیٹٹروں کی طرح اس کو بھی بھگتنا پڑا۔ ایرانی عوام کی نفرت اور برہمی کا شعلہ اٹھا تو نمرود کی خدائی چشمِ زدن میں جل کر خاکستر ہوگئی۔

شاہ نے جو داخلی اور خارجی حکمتِ عملی اختیار کی تھی اس کا منطقی ردعمل وہی تھا جو ۱۹۷۸ء کے اوائل میں ظاہر ہوا مگر شاہ نے عوامی تحریک کو بالکل درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور نہ وطن پرستوں کی قوت کا اندازہ کیا۔ اس کا خیال تھا کہ مٹھی بھر شرپسند کمیونسٹ ہیں جنھوں نے مولویوں کو بھڑکا رکھا ہے۔ میں ان کو مار مار کر سیدھا کردوں گا۔ مگر تحریک برابر زور پکڑتی گئی اور ساواک کا تشدد بھی حالات پر قابو نہ پاسکا۔ تب شاہ نے یہ کہنا شروع کیا کہ قدامت پرست عناصر میرے درپے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ ایران ایک جدید ترقی یافتہ ملک بن جائے لیکن یہ حربہ بھی کارگر نہ ہوا تو شاہ نے سامراج دشمنی کا سوانگ بھرا اور لوگوں کو یہ باور کرانا چاہا کہ اس تحریک کے پیچھے امریکہ کا ہاتھ ہے جو میری تیل کی پالیسی کے خلاف ہے اور ایران کی بڑھتی ہوئی قوت کو مشرقِ وسطیٰ میں

اپنا حریف تصور کرتا ہے لیکن جو شخص تیس سال سے امریکہ کے سایۂ عاطفت میں حکومت کر رہا ہو اس کی امریکہ دشمنی پر کس کو اعتبار آتا۔

رضا شاہ نے ایران کو اپنی ذاتی جاگیر سمجھ لیا تھا۔ لوگوں کے ساتھ اُس کا برتاؤ قرون وسطیٰ کے نودولتیے نوابوں کا سا تھا۔ مجلس کے نمائندے جن کی حیثیت شطرنج کے مہروں سے زیادہ نہ تھی شاہ کی پارٹی 'رستخیز' سے چنے جاتے تھے۔ وزیروں کو وہ مقرر اور برطرف کرتا تھا۔ فوج اور پولیس اس کے تابع تھی۔ ملک کی اقتصادی اور سیاسی پالیسی وہ وضع کرتا تھا۔ ابلاغ عامہ کے ذرائع اس کے ماتحت تھے۔ غرضیکہ ملک کا سارا نظم و نسق اس کی مرضی سے چلتا تھا۔ قوم تقریر، تحریر، تنظیم اور اجتماع کے جمہوری حقوق سے محروم تھی۔ اربابِ اختیار نہ پبلک کے روبرو جواب دہ تھے نہ پبلک اُن سے کسی قسم کی باز پرس کر سکتی تھی۔ ایران ایک قید خانہ تھا جس کی کنجی شاہ کی جیب میں تھی۔

امریکی غلبہ اس جلتی پر تیل کا کام کرتا تھا۔ کوئی ایسا شعبہ نہ تھا جس پر دو چار امریکی مسلط نہ ہوں۔ ان کی تنخواہیں اپنے ہم رتبہ ایرانیوں سے دس گنا، بیس گنا زیادہ ہوتی تھیں اور ان کا برتاؤ بھی بڑا حاکمانہ تھا۔ ان کو تنخواہ کے علاوہ دوسری مراعات بھی حاصل تھیں۔ مثلاً ان کو گرفتار نہیں کیا جا سکتا تھا اور نہ اُن پر کسی ایرانی عدالت میں مقدمہ چلایا جا سکتا تھا۔ ان دنوں ایرانی اخبار شاہ کے خفیہ احکام قسط وار شائع کر رہے ہیں۔ چنانچہ اخبار 'اطلاعات' میں ایک شاہی حکم نظر سے گزرا جس کی رو سے ایران میں مقیم امریکی، پٹرول نصف قیمت پر خریدتے تھے۔ واضح رہے کہ ان کی تعداد پچاس ہزار سے بھی زیادہ تھی۔

ایران کی صنعت اور تجارت پر امریکی جس طرح چھائے ہوئے تھے اس کا ذکر ہم تفصیل سے کر چکے ہیں مگر سب سے اہم اور نفع بخش کاروبار تیل کا تھا۔ اس کا سارا انتظام ایک کنسورشیئم کے سپرد تھا جس میں پانچ کمپنیاں امریکی تھیں اور ایک ایک ڈچ اور انگریز۔ تیل کی پیداوار اور آمدنی کا سارا حساب کتاب کنسورشیئم کے غیر ملکی حکام کرتے تھے۔ اُن کے بیان کے مطابق ۱۹۷۷ء میں ۳۰۵ء۵ کروڑ ٹن تیل نکالا گیا۔ اس سے ۴۲ ارب ڈالر آمدنی ہوئی۔ مصارف کا تخمینہ ۷ ارب ڈالر تھا جس کو وضع کرنے کے بعد ۳۵ ارب ڈالر خالص نفع ہوا مگر نصف

رقم (۵ء۷ارارب ڈالر) کنسورشیئم لے گیا۔ ۵ء۷ارارب ڈالر جو حکومت کو ملے وہ بھی امریکہ، مغربی جرمنی، برطانیہ اور فرانس کے ٹھیکے داروں کی جیب میں گئے، یا امریکہ سے جنگی سامان خریدنے میں صرف ہوئے۔ انقلاب کے دوران میں اگر 'مرگ بر امریکہ' اور 'امریکیوں ملک سے چلے جاؤ، اور اپنے پالتو کتے کو بھی ساتھ لے جاؤ' کے نعرے لگتے تھے، اور امریکی سفارتخانے کے سامنے مظاہرے ہوتے تھے تو اس نفرت کے ٹھوس اسباب موجود تھے۔

کرپشن

رضا شاہ کی حکومت سے لوگوں کی بیزاری کا ایک اور سبب کرپشن تھا۔ یوں تو ریاست کا کوئی شعبہ کوئی محکمہ رشوت، خرد برد اور بے ایمانی سے پاک نہ تھا مگر کرپشن کا سرچشمہ دراصل شاہ اور اس کے اہلِ خاندان تھے اور جہاں ریاست کا سربراہ خود بددیانت اور رشوت خور ہو وہاں وزیروں اور سرکاری افسروں کی رشوت ستانی کی روک تھام کیونکر ہوسکتی تھی۔ غیر جانبدار ذرائع کے مطابق شاہ اور اس کے اہلِ خاندان کے ملک سے باہر اثاثوں کی مالیت ۲۲ارب ڈالر ہے۔ یہ ہوشربا رقم شاہ کو باپ دادا سے ترکے میں نہیں ملی تھی اور نہ ہی سربراہِ ریاست کی حیثیت سے ان کو جو وظیفہ ملتا تھا اس میں سے بچائی گئی تھی بلکہ غیر ملکی کمپنیوں کو اربوں ڈالر کے جو ٹھیکے دیئے گئے تھے اُن سے یا فوجی سامانوں کی خریداری سے بطور کمیشن وصول کی گئی تھی۔ رشوت کے اس کاروبار کو معزز بنانے کی غرض سے شاہ نے ۱۹۵۸ء میں ایک نام نہاد فلاحی ادارہ پہلوی فاؤنڈیشن کے نام سے قائم کیا تھا۔ اس کے صدر وہ خود تھے۔ پانچ سال کے اندر پہلوی فاؤنڈیشن کے اثاثے کی مالیت ۱۳ارکروڑ ڈالر ہوگئی۔ پہلوی فاؤنڈیشن چار نائٹ کلبوں اور متعدد ہوٹلوں کا مالک تھا۔ اس کے علاوہ فاؤنڈیشن کے بہت سے تیل بردار جہاز چلتے تھے اور ایک بیمہ کمپنی (نیشنل انشورنس کمپنی) بھی۔ شاہ کی جڑواں بہن شہزادی اشرف منشیات کا کاروبار کرتی تھی یہاں تک کہ جیل خانوں میں چرس اور افیون کی ناجائز سپلائی بھی شہزادی صاحبہ کی اجارہ داری تھی۔ شہزادی اشرف کا بیٹا پرنس بہرام ایران کی ۸۰ ۴ کمپنیوں کا چیئرمین، مینجنگ ڈائریکٹر یا ڈائریکٹر تھا۔ کاروباری حضرات پرنس بہرام کو اعزازی حصص دے کر اپنی کمپنی میں شریک کر لیتے تھے اور پھر اس کے

ذریعے سے لائسنس پرمٹ اور دوسری مراعات حاصل کرتے تھے۔ تہران میں زمینوں اور عمارتوں کا نفع بخش کاروبار پرنس غلام رضا اور پرنس عبدالرضا کی اجارہ داری تھا۔ وہ ایک یہودی کمپنی 'اسٹارٹ' کے تعاون سے دولت سمیٹتے تھے۔ تہران کی کوئی کنسٹرکشن کمپنی شاہ کے ان بھائیوں کو شریکِ کار بنائے بغیر نہ زمین حاصل کرسکتی تھی نہ کوئی عمارت بناسکتی تھی۔

مگر رشوت کی حوصلہ افزائی جس پیمانے پر غیر ملکی کمپنیوں بالخصوص امریکی کمپنیوں نے کی اس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔ مثلاً امریکہ کی ایک انجینئرنگ کمپنی 'نارتھ راپ' ہے۔ وہ جنگی جہازوں سے لے کر ٹیلیفون سازی تک ہر طرح کا کاروبار کرتی ہے۔ ایران میں اس کمپنی کے ایجنٹ پرنس شہرام اور ایئرفورس کے سپہ سالار جنرل خاتمی تھے۔ لہٰذا جنگی جہاز بھی نارتھ راپ سے خریدے جاتے تھے اور جو کمیشن ملتا تھا وہ ان دونوں حضرات کی جیبوں میں جاتا تھا۔ ۱۹۷۰ء میں ایرانی حکومت نے ایران میں ٹیلیفون لگانے کا چھ ارب کا ٹھیکہ نارتھ راپ کو دیا۔ نارتھ راپ نے اس کام میں سیمنز الیکٹرک کمپنی کو شریک کرلیا۔ سیمنز کے نام پر سوئزرلینڈ کے کسی بینک میں ۲۲،۵ لاکھ ڈالر کا کھاتہ کھولا گیا اور رجسٹروں میں یہ دکھایا گیا کہ یہ رقم بعض افراد کو ادائیگی کے سلسلے میں بینک میں جمع کرائی گئی ہے۔ ۱۹۷۵ء میں جب کرپشن کا چرچا بہت عام ہوا تو ایک تحقیقاتی کمیشن غیر ملکی کمپنیوں کے لین دین کی جانچ پڑتال کے لیے قائم کیا گیا۔ اس کمیشن نے بہت سر مارا مگر یہ پتہ نہ چلا کہ ۲۲،۵ لاکھ ڈالر کن افراد کو ادا کیے گئے ہیں۔ سوئس بینک، نارتھ راپ اور سیمنز تینوں نے نام بتانے سے انکار کردیا اور ناموں کا انکشاف کیسے ہوتا جب کہ یہ رقم شاہی خاندان میں تقسیم ہوئی تھی۔ اسی طرح ناتھ راپ نے ایک ایرانی کمپنی Denrees Equipment شرکت ایران کو ۵۷،۵ لاکھ ڈالر کمیشن ادا کیے تھے مگر تحقیقات کرنے پر پتہ چلا کہ اس نام کی کوئی کمپنی ایران میں سرے سے موجود ہی نہ تھی۔ یہ تمام واقعات مسٹر فریدوں ہویدا نے اقوام متحدہ کی دوسری کمیٹی میں کرپشن کے ریزولیشن پر تقریر کرتے ہوئے بیان کیے تھے۔

ایسا ہی انکشاف امریکی کمپنی Grumman کے بارے میں ہوا۔ یہ کمپنی ایف ـ ۱۴ (F-14) لڑاکا طیارے بناتی ہے اس نے ایران سے آرڈر حاصل کرنے کے لیے ۶۰ لاکھ ڈالر

رشوت دی۔ ۳۱ لاکھ ڈالر ہوشنگ لیوی، پرویز لیوی اور منصور لیوی کے حصے میں آئے اور ۲۹ لاکھ ڈالر پرنس شہنام کی کمپنی کو ملے۔

سرمایہ دار کمپنیاں رشوت کی رقمیں اپنی جیب سے ادا نہیں کرتیں بلکہ مال کا دام بڑھا کر گاہکوں ہی سے وصول کرتی ہیں۔ مثلاً ایران میں ہسپتالوں کے لیے سامان کا ٹھیکہ تین کمپنیوں کو دیا گیا۔ ان میں ایک کمپنی امریکی تھی، دوسری برطانوی اور تیسری فرانسیسی، تینوں نے قیمتوں کا جو تخمینہ پیش کیا وہ بازار بھاؤ سے سات گنا زیادہ تھا۔

شاہی خاندان کے افراد کی یہ لوٹ نہ شاہ سے چھپی ہوئی تھی اور نہ پبلک سے۔ کبھی کبھار جب شاہ صاحب اپنے کسی وزیر سے ناخوش ہوتے تھے تو اس کی رشوت ستانی منظر عام پر آجاتی تھی۔ مثلاً فریدوں مہدوی، وزیرِ مال یا منصور روحانی وزیر زراعت پر رشوت کا مقدمہ یا ۱۹۷۸ء میں شورش کے دوران عباس ہویدا اور چھ سات دوسرے وزیروں کی رشوت کے الزام میں گرفتاری۔

وہ کمپنیاں جن میں شاہی خاندان کے افراد یا وزیروں اور با اثر افسروں کے حصص تھے انکم ٹیکس ادا کرنا تو درکنار انکم ٹیکس کے کاغذات بھی داخل نہیں کرتی تھیں، چنانچہ ۱۹۶۹ء میں سرکاری آمدنی کا فقط پانچ فیصد انکم ٹیکس سے حاصل ہوا۔ مئی ۱۹۷۵ء میں وزیرِ مال ہوشنگ نے انکشاف کیا کہ ایران کی بیس ہزار رجسٹرڈ کمپنیوں میں سے فقط ۹۳ ۶۲ نے انکم ٹیکس کے کاغذات داخل کیے۔ ان میں سے ۴۳ فی صد نے خسارہ دکھایا وزیرِ مال نے کہا کہ تہران کے ۸۱۷ کارپوریشنوں کا اعتراف تھا کہ انہوں نے ۱۹۷۳ء۔ ۱۹۷۴ء میں دس کروڑ ریال سے زیادہ کا کاروبار کیا لیکن کسی کو دس فیصدی سے زیادہ نفع نہیں ہوا بلکہ ۲۸۰ کارپوریشنوں نے گھاٹا دکھایا۔ ایک صنعتی ادارے نے جس کے اثاثے کی مالیت ۴ ارب ریال ہے اور جس کی بکری ۵ء ۱۲ر ارب ریال تھی کہا کہ اس کو ۵ء ۱۲ کروڑ کا گھاٹا ہوا۔ ایک مینوفیکچرنگ کمپنی نے جس کی سالانہ بکری ۸ر ارب ریال تھی، ۳ کروڑ ریال کا گھاٹا دکھایا اور ایک کمپنی نے ۳ر ارب کی بکری اور ۶ر ارب کا گھاٹا دکھایا۔

سرکاری دفتروں میں رشوت دیئے بغیر کوئی کام نہیں ہوسکتا تھا۔ جتنا بڑا کام اتنی بڑی

رشوت۔ مرض اتنا عام تھا کہ ایران ایئر (ہوائی پیمائے ملی ایران) کا ٹکٹ بھی 'حق حساب' ادا کیے بغیر نہیں مل سکتا تھا۔ اس پر یاد آیا کہ شاہ جس وقت بھاگے ہیں تو ان کے اہلِ خاندان پر ایران ایئر کے ٹکٹ کے ۲۵ لاکھ ڈالر واجب الادا تھے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ شاہی خاندان کے افراد اور لواحقین ساری دنیا میں مفت سفر کرتے تھے۔

سرکاری افسروں کی زر اندوزی اور رشوت خوری کا اندازہ ۱۹۷۸ء میں ہوا جب عوامی تحریک کے خوف سے ان افسروں نے بھاری بھاری رقمیں ملک سے باہر منتقل کرنی شروع کیں۔ ایران میں چونکہ ڈالر کی خرید و فروخت پر کوئی پابندی نہ تھی۔ ہر شخص ریال کے بدلے جتنے ڈالر چاہتا بینکوں سے خرید سکتا تھا۔ لہٰذا ایک شاہ پرست مصنف کے بیان کے مطابق 'وزیروں، سیکریٹریوں، کسٹم افسروں، پولیس والوں اور فوجی جنرلوں کی فوج ظفر موج نے صرف پانچ ماہ میں گیارہ ارب ڈالر کی رقم ملک سے باہر بھیجی'۔

ملک سے ڈالر کے اس فرار پر جب احتجاج کے باوجود پابندی نہ لگی تو بینک ملی کے بابوؤں نے دسمبر ۱۹۷۸ء میں اُن سو افراد کی فہرست شائع کردی جنہوں نے ایک لاکھ ڈالر سے زائد رقمیں باہر بھیجیں تھیں۔ ایک لاکھ سے کم والوں کو انہوں نے ذکر کے قابل بھی نہ سمجھا۔ ان سو اشخاص نے تین ماہ کے اندر ایک ارب ڈالر برآمد کیے۔ اس دوران میں شاہی خاندان نے چار ارب ڈالر بیرونی بینکوں میں منتقل کیے۔

بدنظمی کا یہ حال تھا کہ مال بردار جہاز 'بندر عباس' اور 'خرم' شہر کی بندرگاہ میں مال اتروانے کے انتظار میں سو سو دن کھڑے رہتے تھے اور یہ مال جہاز سے اترنے کے بعد بھی مہینوں گودی میں پڑا رہتا تھا۔ اس لاپرواہی کی وجہ سے ایران کو ۱۹۷۵ء میں ڈیڑھ ارب ڈالر تاوان ادا کرنا پڑا جو تیل کی آمدنی کا سات فیصد تھا۔

بے چینی کا ایک اور سبب غیر پیداواری مصارف میں روز افزوں اضافہ تھا۔ ان غیر پیداواری مصارف میں سب سے بڑی مد فوجی سامانوں کی تھی۔ ان سامانوں سے کسی کا پیٹ نہیں بھر سکتا تھا نہ تن ڈھک سکتا تھا۔ فوجی تنصیبات، سرکاری تعمیرات اور ہوائی اڈوں کی توسیع سے روزمرہ کی ضرورتیں پوری نہیں ہو سکتی تھیں۔ البتہ افراطِ زر ضرور بڑھتا تھا اور اشیائے صرف اسی

نسبت سے گراں سے گراں تر ہوتی جارہی تھیں۔ یہ چیزیں عموماً باہر سے آتی تھیں مثلاً تہران میں سبزی، پھل اور انڈے روزانہ اسرائیلی طیاروں سے تل ابیب سے آتے تھے۔ یخ بستہ گوشت اور خشک دودھ آسٹریلیا سے درآمد ہوتا تھا۔ گندم امریکہ اور کینیڈا سے منگوایا جاتا تھا اور ان کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرتی تھیں۔ نتیجہ یہ تھا کہ دوہزار روپیہ ماہانہ آمدنی والوں کے لیے بھی جینا حرام ہوگیا تھا۔ مکان کے کرایوں کا بھی یہی حال تھا مثلاً تہران میں ۱۹۷۴ء میں کرایوں میں دوسو فیصد اضافہ ہوا اور ۱۹۷۵ء میں مزید سو فیصد۔ کہتے ہیں کہ ایران میں فقط دس فیصد لوگوں میں ضروریاتِ زندگی حاصل کرنے کی استطاعت رہ گئی تھی۔

ملک اگر کسی ارضی یا سماوی آفت میں مبتلا ہو، اگر زلزلہ یا سیلاب آجائے تو غریب آدمی صبر کرلیتا ہے لیکن جب وہ دیکھتا ہے کہ مٹھی بھر اشخاص عیش کررہے ہیں بلکہ ان کے عیش وطرب میں اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے تو اُن کا غصہ حق بجانب ہوتا ہے اور اگر چیخنے فریاد کرنے کی بھی ممانعت ہوتو تکلیف کا احساس اور شدید ہوجاتا ہے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ انقلابِ ایران میں مزدوروں اور طالبعلموں کے علاوہ اہلِ بازار نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ یہ متوسط درجے کے وہ دکاندار اور سوداگر تھے جن کی رسائی سرکار، دربار تک نہ تھی۔ ان کا روایتی رشتہ علمائے دین سے تھا بلکہ اکثر علما کاروبار میں اُن کے شریک تھے۔ شاہ نے اقتصادی اجارہ داری کی جو پالیسی اختیار کی تھی اس سے سب سے زیادہ نقصان اسی طبقے کو پہنچا تھا اور یہ طبقہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ شاہ کو ہٹائے بغیر اُس کی مالی حالت کبھی نہ سنبھل سکے گی۔

حوالہ جات

1. Karl Marx, *The Eighteenth Brumaire of Louis Bonaparte*, Moscow, Progress Publishers, 1983.

گیارہواں باب

ایک قدم آگے دو قدم پیچھے

(۱)

ایران کا حالیہ انقلاب دورِ حاضر کا نہایت عہد آفریں واقعہ ہے۔ اس انقلاب کی وجہ سے ایک جابر بادشاہت ہی کا خاتمہ نہیں ہوا ہے بلکہ سامراجی طاقتوں کے اثر و اختیار کو بھی زبردست دھکا لگا ہے اور مشرق وسطیٰ میں قوت کا توازن بدل گیا ہے۔ دنیا کی نگاہیں ان دنوں ایران پر جمی ہوئی ہیں کہ دیکھیں انقلاب وہاں کیا رخ اختیار کرتا ہے۔ آیا جمہوری عناصر فروغ پاتے ہیں اور ایران کا قدم آگے کی طرف بڑھتا ہے یا 'ملائیت' کے شکنجے مضبوط ہوتے ہیں اور ملک پیچھے کی طرف مڑ جاتا ہے۔ بعض مبصرین ایرانی انقلاب کا موازنہ ۱۹۵۳ء کے مصری انقلاب سے کرتے ہیں جس کی بدولت عرب اقوام ایک نئے فلسفۂ زیست، نئی سیاسی فکر اور نئی تہذیبی معنویت سے روشناس ہوئی تھیں۔ عربوں نے خواہ وہ بحرین کے باشندے تھے یا حجاز و یمن کے، اپنے آزاد وجود کا ادراک کیا تھا اور جنرل ناصر ان کے قومی وقار اور خود مختاری کی علامت بن گئے تھے مگر افسوس ہے کہ صدر سادات نے جنرل ناصر کے کیے دھرے پر پانی پھیر دیا ہے اور مصر آج وہاں ہے جہاں ذلت اور رسوائی کے سوا کچھ نہیں۔ مصری حکومت امریکہ کے رحم و کرم پر

ہے اور امریکہ اس کو جس طرف چاہتا ہے جھکا دیتا ہے۔ کیا ایرانی انقلاب کا حشر بھی یہی ہوگا؟

فروری ۱۹۷۹ء میں جس وقت ایران میں انقلاب آیا تو ملک سخت بحران کا شکار تھا۔ نظم ونسق کے تار و پود بکھر گئے تھے۔ فیکٹریاں، کارخانے، دکانیں اور دفتر سب بند تھے۔ بیروزگاروں کی تعداد تیس لاکھ سے بھی تجاوز کر گئی تھی۔ شہروں میں کھانے پینے کی چیزوں کا کال پڑا ہوا تھا۔ ایندھن ناپید تھا اور مہنگائی آسمان سے باتیں کر رہی تھی مگر ان دشواریوں کے باجود انقلاب کا سب سے بیش بہا سرمایہ یعنی قومی اتحاد صحیح سلامت تھا۔ تہرانی اور تبریزی، کُرد اور عرب، ترکمان اور بلوچ، دائیں اور بائیں بازو والے غرضیکہ وہ سب لوگ جو شاہی استبداد کے خلاف شانہ بشانہ لڑے تھے خوشی خوشی تکلیفیں جھیل رہے تھے۔ یکجہتی اور دردمندی کا یہ حال تھا کہ جب اصفہان والوں کو خبر ملی کہ تہران میں روٹی کا قحط ہے تو انہوں نے ہزاروں من پکی پکائی روٹیاں ٹرکوں اور چھکڑوں میں لدوا کر تہران بھجوا دیں۔ ہر شخص کو یقین تھا کہ یہ پریشانیاں عارضی ہیں۔ جمہوریت کے قدم جمیں گے تو حالات خود بخود سدھر جائیں گے۔

ایسے نازک وقت میں جب ملک کی معیشت تہہ وبالا تھی اور ریاست کا ڈھانچہ بھی تتر بتر ہوگیا تھا، لوگوں کو یہ توقعات بے جا نہ تھیں کہ خمینی صاحب انقلاب کے تسلیم شدہ قائد کی حیثیت سے پوری قوم کو اپنے ہمراہ لے چلیں گے اور سیاسی گروہ بندیوں میں پھنسنے کے بجائے مختلف جماعتوں اور تنظیموں کو معاشرے کی از سرِ نو تعمیر کے کاموں میں اپنا شریکِ کار بنانے کی کوشش کریں گے مگر طاقت کا نشہ انسان کو خطرناک حد تک خود غرض اور تنگ نظر بنا دیتا ہے۔ چنانچہ خمینی صاحب نے قومی تقاضوں کو پسِ پشت ڈال دیا ہے اور ایسا آمرانہ طرزِ عمل اختیار کیا ہے کہ قومی یکجہتی کا شیرازہ بکھر گیا ہے۔ آج وہی عناصر جنہوں نے انقلاب کو کامیاب بنایا تھا ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ ہر طرف لاقانونیت اور افراتفری پھیلی ہوئی ہے۔ انقلابی جوش نے انتقام کی صورت اختیار کر لی ہے۔ شہری آزادی سلب ہوگئی ہے۔ اب تک ۹۲ اخبارات اور رسالے بند کیے جا چکے ہیں جن میں 'آئندگان' اور 'مردم' سرِفہرست ہیں۔ 'پاسدارانِ انقلاب' سیاسی پارٹیوں کے دفتروں پر رائفلوں اور اسٹین گنوں سے حملے کر رہے ہیں بلکہ کئی سیاسی پارٹیوں کے دفتر بشمول حزب تودہ سر بمہر کر دیے گئے ہیں اور ان کے رہنما روپوش

ہوگئے ہیں۔ کتابوں کی دکانیں جلائی جارہی ہیں۔ بیروزگاروں کے جلوسوں پر فائرنگ ہورہی ہے۔ فوج کو قتل وغارت گری کا اذن عام مل گیا ہے اور کردوں اور عربوں کا خون پلا کر اس کی ازسرِ نو حوصلہ افزائی کی جارہی ہے۔

ساواک کے طرز کی ایک نئی خفیہ پولیس (سازمانِ اطلاعات وامنیت ملیِّ ایران) ساواما قائم کردی گئی ہے۔ شاہ کے دور کا خوف وہراس لوٹ آیا ہے۔ خمینی صاحب علانیہ کہہ رہے ہیں کہ بہت سی سیاسی پارٹیوں کا وجود غیر اسلامی ہے۔ بس رستخیز کی طرح ایک سیاسی جماعت کافی ہوگی۔ امریکہ سے اسلحے دوبارہ منگوائے گئے ہیں (۴ ارب ڈالر کے) اور اخباری اطلاعات کے مطابق روزانہ چھ ہزار ایرانی دل شکستہ ہوکر ترک وطن کررہے ہیں۔

لیکن چھ مہینے کے اندر یہ کایا پلٹ کیوں ہوئی؟ قومی اتحاد کیوں ٹوٹا؟ انقلاب سے کس نے بیوفائی کی اور کیوں کی؟ کیا یہ ساری تبدیلیاں اتفاقی ہیں یا خود انقلاب کے اندر کوئی بنیادی خامی تھی جس کا خمیازہ ایرانی عوام بھگت رہے ہیں۔ ان سوالوں پر غور کرنے سے پہلے آیئے ذرا گذشتہ چھ سات ماہ کے حالات پر ایک نظر ڈالیں۔

آیت اللہ روح اللہ خمینی یکم فروری ۱۹۷۹ء کو تہران پہنچے۔ اس وقت تک ڈاکٹر شاپور بختیار وزیر اعظم تھا۔ اس نے استعفیٰ دینے سے انکار کیا تو خمینی صاحب نے ۵ فروری کو ڈاکٹر مہدی بازارگان کو اپنی طرف سے وزیر اعظم مقرر کردیا۔ ہر شخص جانتا تھا کہ ڈاکٹر شاپور کی حکومت انقلابی قوتوں کے دباؤ کو زیادہ دن تک برداشت نہیں کرسکے گی لیکن میت کی آخری رسموں کا انتظار سب کو تھا۔ یہ خدمت ایرفورس کے جانبازوں نے ۹ فروری کو ادا کردی۔ دوش پتے میں جو تہران کے مضافات میں فضائیہ کا مرکز ہے، فضائیہ کے جونیئر افسر ٹیلی ویژن پر خمینی صاحب کی تقریر سن رہے تھے کہ سینئر افسر وہاں آن دھمکے۔ انہوں نے نوجوانوں کو منع کیا تو وہ نہ مانے۔ بات بڑھی تو ٹیکنیکل اسٹاف بھی جونیئر افسروں کے ساتھ ہوگیا۔ سینئر افسروں نے شاہی حفاظتی فوج کے جاوداں دستے سے کمک مانگی اور تب فضائی اڈے پر باقاعدہ جنگ شروع ہوگئی۔ شہر میں خبر پہنچی کہ فضائیہ نے بغاوت کردی ہے تو مجاہدینِ خلق اور فدائینِ خلق کے مسلح نوجوان سڑکوں پر نکل آئے۔ فوج اور پولیس کی چوکیوں پر حملے شروع ہوگئے۔ فضائیہ کی کامیاب بغاوت کے بعد فوج

کے حوصلے بالکل پست ہو گئے اور جنرلوں نے محسوس کرلیا کہ اب عافیت اسی میں ہے کہ فوج کو بارکوں میں واپس بلالیا جائے اور شاپور بختیار کی حکومت کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔

شاپور بختیار نے ان آخری دنوں کا ذکر کرتے ہوئے لندن میں انکشاف کیا کہ 'فوج نے وعدہ کیا تھا کہ وہ خمینی کے ساتھ کوئی سمجھوتہ نہیں کرے گی اور نہ حکومت پر قبضہ کرے گی۔ بقیہ انتظامات کی ذمے داری میری ہوگی لیکن خمینی جب میرے ساتھ مفاہمت پر راضی نہ ہوئے تو فوج کے قدم ڈگمگا گئے۔ میں نے ۱۱ر فروری کو نو بجے چیف آف اسٹاف کو ملاقات کا وقت دیا تھا مگر وہ نہیں آئے۔ دو گھنٹے انتظار کرکے میں نے ۱۱ر بجے ان کو ٹیلی فون کیا تو انہوں نے کہا کہ فوج نے اب غیر جانبدار رہنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ تب میں سمجھ گیا کہ اب کھیل ختم ہو چکا ہے۔ اسی وقت میرے دفتر کے آس پاس سے مشین گنوں کے چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں پچھلی سیڑھیوں سے نیچے اترا اور ہیلی کاپٹر میں سوار ہو کر چل دیا۔'[۲]

حالات کا تقاضا تو یہ تھا کہ انقلاب کی کامیابی کے بعد اُن سب سیاسی جماعتوں اور تنظیموں سے صلاح مشورے کے بعد کوئی قومی حکومت تشکیل دی جاتی جنھوں نے انقلاب میں شرکت کی تھی، مگر خمینی صاحب نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ حتیٰ کہ بائیں بازو کا ایک نمائندہ بھی کابینہ میں شامل نہیں کیا گیا۔ اس کے علاوہ خمینی صاحب نے دوسری کلیدی اسامیوں پر بھی اپنے معتمدین چن چن کر مقرر کردیے لیکن ان کو اپنی نامزد کردہ وزارت پر بھی اعتبار نہ آیا لہٰذا قم پہنچ کر انہوں نے ایک 'اسلامی انقلابی کونسل' بنائی۔ یہ اتنی خفیہ تنظیم تھی کہ عوام تو درکنار خواص کو بھی اس کے ارکان کی خبر نہ تھی۔ مثلاً یہ راز کہ آیت اللہ مطہری اس کونسل کے صدر تھے، اس وقت کھلا جب 'فرقان' والوں نے ان کو قتل کردیا۔ اس کونسل نے خمینی صاحب کی قیادت میں ایک متوازی حکومت قائم کررکھی ہے۔ اسلامی عدالتوں کی نگرانی بھی اسی کونسل کے سپرد ہے اور بازارگان کی حکومت کو احکام و ہدایات اسی دربار سے جاری ہوتے ہیں۔

قم پہنچ کر خمینی صاحب نے دوسرا کام یہ کیا کہ 'حزب اللہ' کی سرپرستی قبول کرلی۔ حزب اللہ جنرل فرانکوں کی فاشسٹ تنظیم 'فلانج' اور ہٹلر کے طوفانی دستوں (storm troopers) کے نمونے پر بنائی گئی تھی۔ اس کے پاس پندرہ ہزار مسلح جوانوں کی ایک فوج ہے جس کی تربیت

نائب وزیر اعظم مصطفےٰ چمران کے سپرد تھی۔ ان صاحب کا تعلق لبنان کے شیعہ رہنما امام موسیٰ صدر کی فوجی تنظیم 'العمل' سے ہے۔ چنانچہ ایرانی اخبار حزب اللہ کے دستے کو 'فلانج' ہی لکھتے ہیں۔ مئی ۱۹۷۹ء میں خمینی صاحب نے جب 'پاسدارانِ انقلاب' کی تنظیم قائم کی تو اس کے چھ ہزار مسلح جوان حزب اللہ ہی سے بھرتی ہوئے۔ اس تنظیم کا کام اخباروں اور سیاسی پارٹیوں کے دفتر جلانا، جلوسوں کو توڑنا، خمینی صاحب کے مخالفین کے گھروں پر حملے کرنا اور عام لوگوں میں دہشت پھیلانا ہے۔ چنانچہ یہی 'پاسدارانِ انقلاب' تھے جنھوں نے اپریل میں آیت اللہ طیلقانی کی بہو اور بیٹیوں کو مارا پیٹا اور گرفتار کیا۔

خمینی صاحب نے برسرِ اقتدار آتے ہی پہلا حملہ عورتوں پر کیا اور ان کو حکم دیا کہ چادر اوڑھ کر نکلو بلکہ بہتر ہے کہ گھروں کے اندر بیٹھو لیکن عجیب بات ہے کہ جب تک عورتیں انقلاب کے دوران میں سڑکوں پر لاٹھیاں اور گولیاں کھاتی رہیں خمینی صاحب نے ان کی بے پردگی پر اعتراض نہیں کیا البتہ انقلاب کامیاب ہوگیا تو ان کو عورتوں کی بے حجابی تنگ کرنے لگی۔ خمینی صاحب کو بالکل خیال نہ آیا کہ ایران میں ہزاروں، لاکھوں عورتیں دفتروں، دکانوں اور کارخانوں میں کام کرکے اپنا اور اپنے گھر والوں کا پیٹ پالتی ہیں۔ ایسی صورت میں اگر وہ چہار دیواری میں بیٹھ گئیں تو ان کو رزق کون دے گا؟ لیکن رزق کا مسئلہ خمینی صاحب کا مسئلہ کبھی نہ تھا مگر عورتیں خاموش نہیں بیٹھیں۔ وہ تین دن تک بلا چادر اوڑھے مظاہرے کرتی رہیں۔ آخر خمینی صاحب نے مجبور ہوکر اپنے احکام واپس لے لیے۔

فروری ہی میں طلبا کا ایک زبردست اجتماع تہران یونیورسٹی کے فٹ بال گراؤنڈ میں ہوا۔ اس اجتماع میں ایک لاکھ سے زائد لڑکے لڑکیوں نے شرکت کی۔ ان کا مطالبہ تھا کہ کابینہ میں تمام سیاسی جماعتوں کے نمائندے شامل کیے جائیں۔ اس کے جواب میں خمینی صاحب نے طلبا کو اسلام کا دشمن اور بے دین ہونے کی سند دی۔ حالانکہ وہ انھیں بے دینوں کے کندھوں پر بیٹھ کر اقتدار کی دہلیز تک پہنچے تھے۔

مارچ ۱۹۷۹ء میں نسلی اقلیتوں کی جانب سے صوبائی خودمختاری کا مطالبہ ہونے لگا۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں ایران میں نسلی اقلیتوں کو نظم و نسق میں کسی قسم کا اختیار حاصل نہیں ہے۔

ان کے علاقوں میں نہ صوبائی اسمبلیاں ہیں نہ وزارتیں بلکہ مرکز کا مقرر کردہ گورنر جنرل ہی وہاں سیاہ وسفید کا مالک ہوتا ہے۔ کُردوں، عربوں، ترکمانوں اور بلوچوں نے انقلاب میں یہ سوچ کر شرکت کی تھی کہ نئے نظام میں ان کو صوبائی خودمختاری کا حق مل جائے گا۔ اس سلسلے میں انقلاب کے بعد سب سے پہلے کُردوں نے پیش قدمی کی۔ مارچ میں ان کے کئی وفدوں نے کُرد ڈیموکریٹک پارٹی کے لیڈر ڈاکٹر عبدالرحمان قاسملو کی قیادت میں خمینی صاحب اور ڈاکٹر مہدی بازارگان سے ملاقات کی۔ کُرد ڈیموکریٹک پارٹی ۳۸ سال سے خلاف قانون جماعت تھی اور ڈاکٹر قاسملو پیرس اور پراگ میں جلاوطنی کے دن گزار کر چند ہفتے قبل ایران واپس آئے تھے۔ مہدی بازارگان نسلی اقلیتوں کو تھوڑی بہت مراعات دینے کے حق میں تھے مگر خمینی صاحب مرکز کے اختیارات میں ذرہ برابر تخفیف کے لیے تیار نہ تھے۔ کُردوں کی عرض داشت مسترد کر دی گئی اور کُردوں کی صوبائی خودمختاری کی تحریک کو کچلنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ چنانچہ مارچ میں ایرانی فوج اور حزبِ اللہ سے تصادم میں پانچ سو کُرد سنندج میں، جو صوبۂ کُردستان کا صدر مقام ہے، اور دو سو کُرد نقدہ میں جان سے مارے گئے۔

نسلی اقلیتوں کے حقوق کے بارے میں خمینی صاحب اور دوسری سیاسی جماعتوں کے درمیان شدید اختلافات رونما ہوئے۔ جبہۂ ملی دیموکرات، حزب تودہ، فدائینِ خلق اور مجاہدین خلق کا مؤقف یہ تھا کہ نسلی اقلیتوں کو صوبائی خودمختاری دینے سے ملک کی وحدت اور سالمیت کو کوئی صدمہ نہیں پہنچے گا بلکہ ایران اور مستحکم ہوگا۔ ان جماعتوں کا کہنا تھا کہ پہلوی دور میں نسلی اقلیتوں کی اقتصادی، تہذیبی اور لسانی ترقی کی طرف سے جو مجرمانہ غفلت برتی گئی ہے اس کی تلافی کی یہی صورت ہے کہ اقلیتوں کو اپنی مرضی سے اصلاحِ احوال کا موقع دیا جائے۔

اپریل میں ریاست کی نوعیت کے تعین کا سوال اٹھا تو خمینی صاحب نے فتویٰ صادر کر دیا کہ رائے دہندگان سے فقط یہ دریافت کیا جائے کہ آیا وہ اسلامی ری پبلک کے حق میں ہیں یا نہیں۔ استصواب رائے کے اس انوکھے پن پر بائیں بازو کی جماعتوں کے علاوہ آیت اللہ شریعت مداری نے بھی سخت اعتراض کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ لوگوں کو ملوکیت، جمہوریت اور اسلامی ری پبلک میں سے کسی ایک کو چننے کا حق ملنا چاہیے۔ اکیلے اسلامی ری پبلک کی تجویز پر 'ہاں' یا

نہیں کہلوانا رائے دہندگان کی حق تلفی ہوگی مگر خمینی صاحب اپنی ضد پر اڑے رہے تو فدائین خلق نے احتجاجاً استصواب رائے میں شرکت سے انکار کردیا۔ بہر حال استصواب رائے ہوا اور اسلامی ری پبلک کی تجویز حسبِ توقع بھاری اکثریت سے منظور ہوگئی۔ ایران اسلامی ری پبلک بن گیا۔

یوں تو یہ حقیقت پہلے دن ہی سے روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی تھی کہ مہدی بازار گان کی حکومت کو ملک کے نظم ونسق پر کوئی اختیار نہیں ہے بلکہ طاقت کا اصل مرکز خمینی صاحب ہیں یا ان کی خفیہ انقلابی کونسل لیکن حالات روز بروز بد سے بدتر ہوتے گئے اور قم اور تہران کی دوعملی نے مضحکہ خیز صورت اختیار کرلی مثلاً اپریل میں بینکوں کو قومی ملکیت بنانے کا فیصلہ اس طرح کیا گیا کہ وزیر اعظم کو بھی کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ یہی حال سیاسی گرفتاریوں اور اسلامی عدالتوں کی سزاؤں کا تھا۔ چنانچہ مہدی بازار گان نے اپنی ایک نشری تقریر میں اعتراف کیا کہ 'لوگ نہ میرے حکم سے پکڑے جاتے ہیں اور نہ میری اجازت سے ان کو گولی ماری جاتی ہے۔ مجھ کو تو ان واقعات کا علم اخباروں سے ہوتا ہے۔' انہوں نے یہ بھی کہا کہ 'ایران کی مثال ان دنوں ایک ایسے شہر کی ہے جس میں سو کوتوال ہوں اور سب اپنی اپنی جگہ با اختیار ہوں۔'

اب جبہ ملی کو بھی یہ احساس ہوگیا کہ انقلاب کے دوسرے عناصر کی عدم موجودگی میں جبہ ملی کے نمائندوں کی ایک کٹھ پتلی کابینہ میں شرکت بے سود ہے۔ چنانچہ اپریل میں جبہ ملی کی مرکزی کمیٹی نے متفقہ طور پر یہ تجویز منظور کی کہ اگر چھاپہ ماروں سمیت دوسری جماعتوں کے نمائندوں کو وزارت میں شریک نہیں کیا گیا تو جبہ ملی کے نمائندے مستعفی ہوجائیں گے۔ خمینی صاحب نے جبہ ملی کے اس مطالبے پر دھیان نہیں دیا تو ڈاکٹر کریم سنجابی وزیر خارجہ نے جو جبہ ملی کے صدر تھے استعفیٰ دے دیا۔ انہوں نے استعفیٰ دیتے وقت انقلابی کمیٹیوں اور اسلامی عدالتوں کے طرز عمل پر بھی کڑی نکتہ چینی کی اور کہا کہ 'ان کی حرکتوں سے لوگوں میں سخت خوف وہراس پھیل گیا ہے۔' ڈاکٹر کریم سنجابی کے استعفیٰ کا ایک سبب ڈاکٹر ابراہیم یزدی کی مداخلت بے جا بھی تھی۔ ڈاکٹر یزدی، خمینی صاحب کے خاص معتمدین میں سے ہیں۔ وہ ۱۸ برس امریکہ میں رہ چکے ہیں۔ ان کے پاس امریکی شہریت ہے اور ان کی بیوی بھی امریکی ہیں۔ البتہ اکتوبر ۱۹۷۸ء میں وہ پیرس چلے گئے اور خمینی صاحب کے حلقے میں شامل ہوگئے۔ انقلاب کے

بعد خمینی صاحب نے ان کو نائب وزیرِ اعظم اور انقلابی امور کا ناظمِ اعلیٰ مقرر کر دیا۔ چنانچہ انقلابی کمیٹیوں کی فاشسٹ انداز میں تربیت و تنظیم یزدی صاحب ہی نے کی۔ ان کے داماد شہر یار روحانی ابھی تک واشنگٹن میں ایرانی سفارتخانے کے ناظم الامور ہیں۔ ابراہیم یزدی کے داماد ہونے کے ناتے وہ ڈاکٹر کریم سنجابی کے احکامات کو خاطر میں نہ لاتے اور من مانی کرتے رہتے تھے مگر ڈاکٹر سنجابی میں اُن سے باز پرس کرنے کی طاقت نہ تھی۔

عجیب بات ہے کہ جہاں کہیں اسلامی نظام رائج کرنے کی باتیں کی جاتی ہیں، وہاں سارا زور سزاؤں پر صرف ہوتا ہے۔ شراب پینے والوں کو کوڑے لگائے جاتے ہیں، چوری کرنے والوں کے ہاتھ کاٹ دیئے جاتے ہیں اور زانیوں کے سر قلم ہوتے ہیں۔ خمینی صاحب کے اسلامی نظام میں تو کئی پیشہ ور عورتوں کو بھی گولی ماری جا چکی ہے البتہ خمینی صاحب اور ان کے رفقا نے کبھی یہ دریافت کرنے کی کوشش نہیں کی کہ لوگوں کو روٹی روزگار میسر ہے یا نہیں، بیماروں کے لیے دوا علاج کا انتظام ہے یا نہیں، لڑکے لڑکیوں کے لیے درسگاہیں موجود ہیں یا نہیں، دردمندی، رحم اور عفو جیسے الفاظ ان کی لغت سے خارج ہیں لیکن سزاؤں سے نہ معاشرے کی تطہیر ہوتی ہے اور نہ لوگوں کے روز مرہ کے مسائل حل ہوتے ہیں۔ چنانچہ اپریل میں بیروزگاروں کے مظاہرے ہونے لگے۔ ان کی تعداد بیس لاکھ تھی۔ اور انہوں نے روزگار کا مطالبہ شروع کر دیا۔ اصفہان، ایران کا سب سے بڑا صنعتی مرکز ہے۔ وہاں ۷ار اپریل کو انجمن بے کاراں کے زیرِ اہتمام ایک لاکھ بے روزگاروں کا جلوس نکلا تو 'پاسداران انقلاب' نے ان پر حملہ کر دیا۔ حالانکہ جلوس نہایت پُر امن تھا اور وہ لوگ گورنر جنرل کے پاس اپنی گیارہ نکاتی عرض داشت پیش کرنے جا رہے تھے۔ پاسداروں کی فائرنگ سے ناصر توفیقیان نامی ایک طالب علم جو ڈل میں ویلڈر کا کام بھی کرتا تھا شہید ہوا اور دس آدمی زخمی ہوئے۔ پاسداروں نے مزدوروں کے دفتر کو بھی آگ لگا دی۔ یکم مئی مزدوروں کا عالمی دن ہوتا ہے مگر اصفہان کے مزدوروں کو جلسہ کرنے اور جلوس نکالنے کی ممانعت کر دی گئی۔ اسی اثنا میں گرگان اور آذر بائیجان اور بحرِ خزر کے ساحلی علاقوں میں دہقانوں کی بے دخلی شروع ہو گئی۔ قصہ یہ تھا کہ انقلاب کے دوران میں بڑے بڑے زمیندار جن کو شاہ نے زمینیں دے رکھی تھیں، اپنا نقدی اثاثہ لے کر ملک سے فرار ہو گئے

تھے لہٰذا دہقانوں نے ان کی زمینوں پر قبضہ کر کے فصل اگا دی تھی۔ ایران کے ارباب اختیار کو دہقانوں کو یہ طرزِ عمل پسند نہیں آیا۔ ذاتی ملکیت کا تحفظ مسلمان کاشتکاروں کی فلاح و بہبود سے کہیں زیادہ مقدس مذہبی فریضہ سمجھا گیا اور اسلامی نظام کا تادیبی قانون فوراً حرکت میں آ گیا۔ یہی صورت حال گنبد کابوس کے علاقے میں پیش آئی۔ وہاں ترکمان کسانوں نے پرتی زمینوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ لہٰذا ان کو بھی بے دخل کر دیا گیا۔

ان استبدادی کارروائیوں کے باوجود خمینی صاحب نے اس وقت تک بائیں بازو کی جماعتوں پر براہِ راست حملے سے احتراز کیا تھا۔ اُن کی جلالی تقریروں کا رخ زیادہ تر امریکہ کی طرف ہوتا تھا مثلاً جنرل قرنی اور آیت اللہ مطہری کو دائیں بازو کی انتہا پسند جماعت 'الفرقان' والوں نے قتل کیا تو خمینی صاحب نے امریکہ پر الزام لگاتے ہوئے کہا کہ 'میں امریکی ایجنٹوں کو جنرل قرنی اور آیت اللہ مطہری کے قتل کا ذمے دار ٹھہراتا ہوں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے شاہ کی خدمت کی اور اب نام نہاد مذہبی تنظیم 'فرقان' کے پیچھے چھپے ہوئے ہیں حالانکہ وہ اسلام سے ذرا بھی واقف نہیں۔' لیکن خمینی صاحب کے رفقا اٹھتے بیٹھتے بائیں بازو والوں کو برا بھلا کہتے تھے۔ چنانچہ خمینی صاحب کے دستِ راست آیت اللہ رفسنجانی نے خمینی صاحب کی موجودگی میں قتل کے ان دونوں حادثات کے لیے کمیونسٹوں کو موردِ الزام ٹھہرایا مگر خمینی صاحب نے ان کو نہ ٹوکا۔ فرانسیسی اخبار 'لی ماند' کے نمائندے ایرک رولو نے جب خمینی صاحب سے اس دورخی طرزِ عمل کی تشریح چاہی تو خمینی صاحب نے جواب دیا کہ 'بایاں بازو ہمارے ملک میں ایک سیاسی دھارا ہے۔ اس کا قطعاً کوئی تعلق ان جرائم سے نہیں ہے۔ آیت اللہ رفسنجانی نے کمیونسٹوں کو برا بھلا نہیں کہا تھا بلکہ اُن لوگوں پر اعتراض کیا تھا جو امریکی امپیریل ازم کی بہتر خدمت کرنے کی غرض سے بائیں بازو کا سوانگ بھر لیتے ہیں۔'

ایرک رولو لکھتا ہے کہ خمینی کا جواب مجھ کو بہت مبہم نظر آیا۔ لہٰذا میں نے ان کے پوتے سے بعد میں وضاحت چاہی اس نے کہا کہ 'آیت اللہ رفسنجانی کمیونسٹ اصولوں کے خلاف ہیں۔ انہوں نے یہ غلطی کی کہ اپنے نظریاتی اختلافات کو سیاسی جنگ میں بدل دیا۔ اس قسم کے جرائم کے ذریعے سی۔ آئی۔ اے ہماری سامراج دشمن جدوجہد کی نوعیت بدلنے کی کوشش کر رہا

ہے۔ وہ خانگی افتراق پیدا کر کے ہماری توجہ اصل مقصد سے ہٹانا چاہتا ہے اور وہ مقصد ہے ایران کو امریکہ کے پنجے سے چھڑانا۔ مارکسسٹ بے شک ہمارے حریف ہیں لیکن اسلام ہم کو ان سے رواداری برتنے کی تعلیم دیتا ہے۔ ان کو زیر تربیت آئین کی حدود میں رہ کر اظہار خیال کی مکمل آزادی ہوگی۔ ۳۳

لیکن بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ رفسنجانی، خلخالی اور دائیں بازو کے دوسرے انتہا پسند عناصر جو کچھ کرتے ہیں اس میں خمینی صاحب کا اشارہ ضرور شامل ہوتا ہے۔ سوشلزم اور کمیونزم تو الگ رہے، جمہوری آزادی کے خلاف بھی جو اقدامات ہوئے ہیں ان سے خمینی صاحب پوری طرح باخبر تھے۔ اب خمینی صاحب وہ خمینی صاحب نہ تھے جن کو یہ غم ستا رہا تھا کہ 'شاہ نے اظہار خیال اور پریس کی آزادی کا گلا گھونٹ دیا ہے۔' (۶ نومبر ۱۹۷۸ء) اور نہ وہ خمینی صاحب تھے جو ایرانیوں سے وعدہ کرتے تھے کہ 'اسلامی ری پبلک میں عورت مرد دونوں کو مساوی آزادی ملے گی اور شہری حقوق بحال کیے جائیں گے۔' اب تو ان کے کسی فیصلے سے ہلکا سا اختلاف بھی ناقابل معافی جرم تھا اور ان کی حکومت پر اعتراض ملک سے غداری۔ عتاب کی زد میں سب سے پہلے روزنامہ 'آئندگان' آیا جس کی اشاعت تین لاکھ سے زائد تھی۔ اس نے نشرو اشاعت کے سربراہ صادق قطب زادہ کی سابقہ شاہ پرستی کو دستاویزوں کے ذریعہ افشا کیا تھا اور قطب زادہ کو ریڈیو، ٹیلی ویژن اور پریس کا ناظم اعلیٰ مقرر کرنے پر کڑی نکتہ چینی کی تھی۔ 'آئندگان' کا دوسرا قصور یہ تھا کہ اس نے سابق نائب وزیر خارجہ احمد سلامتیاں کا ایک بیان شائع کیا تھا جس میں احمد سلامتیاں نے ڈاکٹر ابراہیم یزدی کے داماد شہریار روحانی کے طرز عمل پر اعتراض کیا تھا۔ اسی دوران میں آئندگان سے یہ گناہ بھی سرزد ہوا کہ اس سے خمینی صاحب کے ایک انٹرویو کے حوالے سے جو اخبار 'لی مانڈ' میں چھپا تھا کوئی خبر شائع کر دی۔ اس پر ایوانِ اقتدار میں ہل چل مچ گئی۔ آئندگان پر دروغ گوئی کا الزام لگایا گیا۔ آئندگان کی کاپیاں سرِعام جلائی گئیں اور قم اور تہران وغیرہ میں اخبار کے دفتروں کو آگ لگا دی گئی۔ آخر کار آئندگان نے ۱۲ مئی کو اخبار کی اشاعت احتجاجاً بند کر دی۔ ایران کے سب سے کثیر الاشاعت اخبار 'کیہان' نے آئندگان کے خلاف مہم کو پریس کی آزادی پر حملے سے تعبیر کیا تو اس کو بھی اس

دریدہ دہنی کی سزا مل گئی ۔ اسلامی انقلابی کونسل کے ایک دولت مند رکن اور خمینی صاحب کے مشیر اقتصادیات ابوالحسن بنی صدر عرصے سے ایک اخبار نکالنے کی فکر میں تھے لیکن کیہان کی موجودگی میں نئے اخبار کی کامیابی بہت مشکوک تھی۔ لہٰذا انہوں نے سوچا کہ کیوں نہ کیہان پر قبضہ کرلیا جائے۔ انہوں نے ابراہیم یزدی کے ذریعے 'پاسدارانِ انقلاب' کی خدمات حاصل کیں اور ۱۵رمئی کو کیہان کا گھیراؤ کرلیا۔ کیہان کے صحافیوں نے مزاحمت کی تو ان کو مار پیٹ کر بھگا دیا گیا۔ اس غاصبانہ کارروائی کے بعد کیہان کے نئے کارکنوں کا وفد آیت اللہ خمینی صاحب سے ملا تو موصوف نے وفد کو مبارکباد دی اور فرمایا کہ اخباروں کا فرض ہے کہ رائے عامہ کی پیروی کریں۔ کیہان کے صحافیوں نے اپنی پریس کانفرنس میں یہ انکشاف بھی کیا کہ کیہان پر قبضے کا منصوبہ خمینی صاحب کے دفتر میں تیار ہوا تھا۔ ہاتھی کے کھانے کے دانت آہستہ آہستہ نظر آنے لگے تھے۔

۱۹رمئی کو جبہۂ ملی دیموکراتیک اور ادیبوں اور صحافیوں کی انجمنوں کے زیرِ اہتمام پریس کی آزادی کی حمایت میں ایک جلسہ صنعتی یونیورسٹی کے فٹ بال میدان میں ہوا، جس میں ایک لاکھ سے زیادہ نوجوانوں نے شرکت کی۔ جلسے میں تقریروں کا موضوع 'آزاد اور جمہوری پریس' تھا۔ اس اجتماع میں مقررین نے پریس کا گلا گھونٹنے کی کوششوں کی شدید مذمت کی۔ ایک ریزولیوشن کے ذریعے حکومت کو 'غیر جمہوری اقدامات اور فاشزم کی تبلیغ' کے خطرات سے متنبہ کیا اور یہ الزام بھی لگایا گیا کہ اربابِ اختیار آمرانہ سرگرمیوں کی طرف سے جان بوجھ کر چشم پوشی کررہے ہیں۔

اسلامی جماعتوں کے فاشسٹ طرزِ عمل کا ثبوت بھی اسی جلسے میں مل گیا۔ جب کارروائی کے آخری لمحوں میں حزب اللہ کے تین سو کارکنوں نے جلسہ گاہ پر دھاوا کر دیا۔ وہ لاٹھیوں، بلموں اور چھروں سے مسلح تھے۔ اس جھگڑے میں لاؤڈ اسپیکر کے تار ٹوٹ گئے اور کئی آدمی زخمی ہوئے۔

ملک کا سیاسی اور اقتصادی بحران جوں جوں بڑھتا جاتا تھا، خمینی صاحب اور ان کے رفقا کار کی جمہوریت کش سرگرمیاں بھی شدت اختیار کرتی جاتی تھیں۔ شاہ کا طریقۂ کار یہ تھا کہ عوام کی طرف سے اگر کبھی بے چینیوں کا اظہار کیا جائے یا حکومت کے آمرانہ طرزِ عمل پر

اعتراض ہو تو کمیونسٹوں کو مورد الزام ٹھہرا کر تشدد سے کام لو اور ملک میں خوف و دہشت کی فضا پیدا کرو تا کہ کوئی زبان نہ کھول سکے۔ یہی فرسودہ حربے خمینی صاحب بھی استعمال کرنے لگے۔ انہوں نے غیر جانب داری کا پردہ ہٹا دیا اور بائیں بازو کو علانیہ انقلاب کا دشمن، طاغوتی، شاہ کا ایجنٹ، روس، امریکہ اور اسرائیل کا ایجنٹ کہنے لگے۔ چنانچہ ڈاکٹر مہدی بازارگان نے 'لی ماند' کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا کہ 'مارکسسٹ عناصر تخریب کاری میں مصروف ہیں اور ریاست کی تعمیر نو میں رخنے ڈال رہے ہیں۔' انہوں نے حزب تودہ کا خاص طور پر ذکر کیا اور کہا کہ 'مارکسسٹ گروپوں کا ہر چند کہ شاہ پسندوں، اسرائیل اور امپیریلزم سے رسمی اتحاد نہیں ہے لیکن ان سب کے مفاد ایک ہیں۔' حالانکہ بائیں بازو کی جماعتوں کے علاوہ جبۂ ملی، جبۂ ملی دیموکرات، مجاہدین خلق، آیت اللہ شریعت مداری کی جماعت حزب جمہوری خلق مسلمانان، نہضت رادیکال ایران، جنبش انقلابی مردم مسلمان (جاما) اور ساز مان اسلامی شورئ (ساش) سبھی خمینی صاحب کی آمریت اور مہدی بازارگان کی حکومت کی بے عملی سے شاکی تھے۔ ان سب کا مطالبہ تھا کہ ملاؤں کو حکومت میں مداخلت سے باز رکھا جائے۔ اسلامی عدالتوں کو منسوخ کردیا جائے۔ مجلسِ آئین ساز کا فوراً انتخاب ہو۔ نسلی اقلیتوں کو صوبائی خود مختاری دی جائے۔ سرکاری صنعتوں کے نظم و نسق میں مزدوروں کو شریک کیا جائے اور مہنگائی پر قابو پانے کی تدابیر اختیار کی جائیں۔

خمینی صاحب نے پیرس کے دوران قیام میں اور ایران واپس آکر بھی بار بار اعلان کیا تھا کہ ملک کا نیا آئین منتخب شدہ مجلسِ آئین ساز مرتب کرے گی۔ اس کے باوجود آئین کا مسودہ چپکے چپکے تیار ہوتا رہا اور ۲۸ مئی کو وزیر داخلہ نے اچانک اعلان کردیا کہ مجلسِ آئین ساز کا انتخاب ملک کے مفاد میں نہیں ہے۔ آئین کا مسودہ تیار کرلیا گیا ہے۔ (حالانکہ یہ فریضہ مجلسِ آئین ساز کا تھا) ۳۵، ۴۰ ماہرین کی ایک کمیٹی اس مسودے پر نظر ثانی کرلے گی اور پھر اس کو استصواب رائے کے لیے قوم کے سامنے پیش کردیا جائے گا۔ آئین سازی کے اس غیر جمہوری طریقے کی تمام سیاسی جماعتوں نے شدید مذمت کی۔ حتیٰ کہ آقائے شریعت مداری نے بھی اس پر سخت اعتراض کیا۔ ۳۰ مئی کو ایران بار ایسوی ایشن نے اس تجویز کو رد کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ خمینی صاحب اپنا وعدہ پورا کریں، مجلس آئین ساز کے انتخابات آزادانہ ہوں، مجلس کے

ارکان کی تعداد ۲۶۰ ہو اور مجلس کو اقتدار اعلیٰ کے اختیارات حاصل ہوں لیکن خمینی صاحب اپنی ضد پر اڑے رہے انہوں نے مجلس آئین ساز کے انتخابات کو سبوتاژ ہی اس ڈر سے کیا تھا کہ مبادا مجلس کی موجودگی میں ان کے اپنے آمرانہ اختیارات میں خلل پڑے۔ ان کا یہ اندیشہ بے جا نہ تھا کیونکہ اقتدار اعلیٰ کی نمائندہ اور مالک ہونے کی حیثیت سے مجلس آئین ساز ملک کی انتظامیہ اور عدلیہ دونوں پر حاوی ہو جاتی اور خمینی صاحب کو من مانی کرنے کا موقع نہ ملتا۔

۱۸ر جون کو آئین کا مسودہ سرکاری طور پر شائع کر دیا گیا۔ (مسودے کی اہم دفعات کا متن ڈیڑھ ماہ قبل 'کیہان' میں غیر سرکاری طور پر چھپ چکا تھا۔) یہ مسودہ ۱۵۱ دفعات پر مشتمل ہے۔ دفعہ نمبر ۱ کے مطابق 'نوع حکومت ایران جمہوری اسلامی است' دفعہ ۱۵ میں اقتدار اعلیٰ کا مخرج و منبع ملک کے باشندوں کو قرار دیا گیا ہے۔ 'حق حاکمیت ملی از آں ہمہ مردم است' دفعہ ۱۶ کے مطابق 'قوائے ناشی از اعمال حق حاکمیت ملی عبادت انداز قوت مقننہ، قضائیہ و قوت مجریہ' یعنی حاکمیت کے اختیارات مقننہ، عدلیہ اور انتظامیہ کے ذریعے استعمال ہوں گے۔ ریاست کے یہ تینوں عناصر ایک دوسرے سے آزاد ہوں گے اور ان کے مابین تعلقات کی کڑی صدرِ ریاست کی ذات ہوگی۔ دفعہ ۱۹ کے مطابق انتظامیہ کے اختیارات صدرِ جمہوریہ اور مجلس وزرا کے ذریعے استعمال ہوں گے۔ ایران کی مشترکہ سرکاری زبان فارسی ہوگی البتہ مقامی اسکولوں اور پریس میں مقامی زبانوں کو استعمال کرنے کی اجازت ہوگی (دفعہ ۲۱) دفعہ ۲۵ میں پریس کی آزادی کے وہی رسمی دعوے ہیں جو ہر آئین میں ملتے ہیں مگر اس آزادی کے گرد مختلف شرطوں کا ایک حصار کھینچ دیا گیا ہے اور یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ پریس کے لیے جرم و سزا کا قانون الگ بنے گا۔ اسی طرح دفعہ ۲۶ میں ایک طرف مذہبی، سیاسی اور پیشہ ورانہ تنظیموں کی تشکیل کی آزادی کی ضمانت دی گئی ہے تو دوسری طرف اس آزادی کو مختلف شرطوں سے پابہ زنجیر کر دیا گیا ہے۔ دفعہ ۵۰ کے مطابق مجلس شورائے ملی براہ راست اور خفیہ انتخابات کے ذریعے چار سال کے لیے چنی جائے گی البتہ بالغ حق رائے دہی کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ نہ جانے یہ فروگزاشت دانستہ ہے یا اتفاقی۔ وزیر اعظم کو صدر مقرر کرے گا اور وزیروں کو وزیر اعظم۔ کابینہ کے ارکان، مجلس شورائے ملی کے اجلاسوں میں شریک ہو سکتے ہیں۔ (دفعہ ۵۴ اور ۸۴) لیکن یہ واضح نہیں

کہ وہ مجلس کے منتخب شدہ رکن ہوں گے یا نہیں اور یہ کہ اُن کو ووٹ دینے کا حق ہوگا یا نہیں۔ البتہ کابینہ کے لیے مجلس کے اعتماد کا ووٹ حاصل کرنا لازمی ہوگا۔ (دفعہ ۷۲) صدر کو وسیع اختیارات دیے گئے ہیں اور ان اختیارات کو ۲۵ دفعات میں تشریح کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے البتہ یہ پتہ نہیں چلتا کہ صدر کو منتخب کون کرے گا؟ عوام یا مجلس شورائے ملی؟

دفعہ ۱۴۲ ر کی رو سے گیارہ افراد کی ایک 'مجلس پاسدارانِ آئین' ہوگی جس کا بنیادی فریضہ آئین کا تحفظ کرنا اور یہ دیکھنا ہوگا کہ مجلس شورائے ملی جو قوانین وضع کرتی ہے، وہ شریعت کے مطابق ہیں یا نہیں۔ اس مجلسِ پاسداران میں پانچ مجتہد شامل ہوں گے جن کو مجلس شورائے ملی 'مرجع تقلید' مجتہدوں کی پیش کردہ فہرست میں سے چنے گی۔ بقیہ چھ 'ماہرین' میں سے تین قانون کے پروفیسر اور تین جج ہوں گے، ان کا انتخاب بھی مجلس کرے گی۔ مجلسِ پاسداران کے ارکان کی مدت دس سال ہوگی۔

مولوی حضرات خواہ وہ پاکستان کے ہوں یا ایران کے، اسلامی نظام کی ثناء وصفت میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں مگر جب اسلامی نظام کو عملی شکل دینے کا وقت آتا ہے تو مغربی ملکوں کے آئین وقوانین کی نقالی میں ذرا بھی شرم وحیا محسوس نہیں کرتے۔ مثلاً ایران کے آئین کے اس مسودے کا موازنہ جو صدارتی اور پارلیمانی طرز حکومت کا ملغوبہ ہے، فرانس کے آئین سے کیجئے تو صاف معلوم ہوگا کہ فرانسیسی آئین کو مشرف بہ اسلام کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ البتہ اس کوشش میں فرانسیسی آئین کی خوبیوں پر تو سیاہی پھیر دی گئی ہے مگر اس میں جو خامیاں ہیں ان کو برقرار رکھا گیا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ خمینی صاحب نے اپنی ذات کو پیش نظر رکھ کر یہ مسودہ تیار کروایا ہے۔ اس میں صدر ریاست کو بجنسہٖ وہی اختیارات حاصل ہیں جو شاہ کو پرانے آئین میں حاصل تھے بلکہ ہم کو یقین ہے کہ اگر شاہ کو اس مسودۂ آئین کے تحت صدر جمہوریہ کی پیش کش کی جائے تو وہ خوشی سے قبول کر لے گا۔

پاکستان کے لوگوں کو ایوب خان کے صدارتی نظام کا بڑا تلخ تجربہ ہے، مگر پاکستان پر کیا منحصر ہے پس ماندہ ملکوں میں جہاں جمہوریت کی جڑیں عموماً کمزور ہیں صدارتی نظام ہر جگہ شخصی آمریت کا پیش خیمہ ثابت ہوا ہے کیونکہ صدارتی نظام میں ایک فرد کو اتنے وسیع اختیارات مل

جاتے ہیں کہ ملک میں اگر جمہوریت مستحکم نہ ہو تو صدر کو من مانی کرنے سے روکنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے علاوہ صدارتی نظام کا تجربہ کہیں کامیاب نہیں ہوا ہے بلکہ جنوبی امریکہ، افریقہ اور ایشیا میں جہاں کہیں صدارتی نظام رائج ہے، صدر ڈکٹیٹر بن گیا ہے۔ سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اس طرزِ حکومت میں مجلسِ قانون کی حاکیت باقی نہیں رہتی۔ صدرِ ریاست انتظامیہ کا سربراہ ہوتا ہے مگر مجلس کے روبرو جواب دہ نہیں ہوتا، حالانکہ موجودہ دور میں زندگی کا ہر شعبہ انتظامیہ کے رحم وکرم پر ہوتا ہے۔ ملک کی اقتصادی، صنعتی اور تجارتی سرگرمیاں انتظامیہ کے کنٹرول میں ہوتی ہیں۔ دراصل انتظامیہ ہی معاشرتی ارتقا کا رخ متعین کرتی ہے۔ ایسی صورت میں انتظامیہ کو قوم کے چنے ہوئے نمائندوں کی اطاعت سے آزاد کر کے ایک شخص کی صوابدید پر چھوڑ دینا شخصی آمریت کو ہوا دینا ہے۔ صدارتی نظام کے برعکس پارلیمانی نظام میں مجلسِ قانون ساز اقتدارِ اعلیٰ کا مرکز ہوتی ہے کیونکہ وہ اقتدارِ اعلیٰ کے سرچشمے یعنی عوام کی چنی ہوئی نمائندہ ہوتی ہے۔ انتظامیہ اس کے تابع ہوتی ہے لہٰذا شخصی آمریت کے امکانات بہت کم ہو جاتے ہیں۔

مگر حیرت ہے کہ پہلوی فرمانرواؤں کی ۵۵ سالہ شخصی آمریت کے ہولناک تجربوں کے باوجود خمینی صاحب اور ان کے رفقاء کو صدارتی نظام کے خطرات نظر نہیں آتے۔ صدارتی نظام کو اپنانے سے تو یہی گمان ہوتا ہے کہ ذاتی اقتدار کی ہوس ان خطرات کو تاریخ سے سبق سیکھنے کی اجازت نہیں دیتی بلکہ آثار وقرائین یہ بتاتے ہیں کہ ایران کو تھیوکریسی بنانے کے سلسلے میں جو کمی آئین کے مسودے میں رہ گئی تھی 'مجلس خبرگاں' اس کو بھی پورا کر دے گی اور ایران پر ملاؤں کا پورا پورا تسلط ہو جائے گا۔ خمینی صاحب کے دستِ راست کہہ چکے ہیں کہ انقلاب ملا لائے تھے لہٰذا وہی ملک پر حکومت کریں گے۔

آئین کا مسودہ شائع ہوا تو ملک کے جمہوریت پسندوں نے اس غیر جمہوری دستاویز پر کڑی نکتہ چینی کی۔ چنانچہ ۲۳ جون کو جبہ ملی دیموکراتک کے زیرِ اہتمام تہران میں ایک بہت بڑا جلسہ ہوا جس میں ہزاروں مردوں اور عورتوں نے شرکت کی۔ اس جلسے میں جبہ ملی دیموکراتک کے بانی اور ڈاکٹر مصدق کے نواسے ہدایت اللہ متین دفتری نے بار ایسوسی ایشن کے

مطالبات کی تائید کی اور کہا کہ کسی غیر نمائندہ گروہ کو آئین سازی کا حق نہیں پہنچتا لہٰذا مجلسِ آئین ساز کا انتخاب کیا جائے اور آئین سازی کے فرائض اس کے سپرد کیے جائیں۔ ایسا ہی ایک مظاہرہ فدائینِ خلق کی جانب سے ۲۹ جون کو ہوا۔

لیکن خمینی صاحب اور ان کے رفقاء پر ان مظاہروں کا کوئی اثر نہیں ہوا بلکہ حکومت کی طرف سے یہ اعلان کیا گیا کہ آئین کے مسودے کو آخری شکل دینے کے لیے مجلسِ خبرگاں کے ۷۳ ارکان کا انتخاب ۳/ اگست کو ہوگا۔ اس اعلان کی بھی تمام جمہوری تنظیموں نے مخالفت کی۔ جبہ ملی ڈیموکراٹک نے ۲۶ جولائی کو ایک بیان میں خمینی صاحب پر بدعہدی کا الزام لگایا اور انتخابات میں شرکت سے انکار کرتے ہوئے اعلان کیا کہ 'حکومت کی جانب سے بنیادی انسانی حقوق کی جو بے حرمتی ہو رہی ہے، ہمارا بائیکاٹ کا فیصلہ اس بے حرمتی کے خلاف اصولی احتجاج ہے۔' آقائے شریعت مداری نے بھی آئین کے مسودے اور مجلس خبرگاں پر کڑی نکتہ چینی کی اور کہا کہ میں اس انتخاب میں شریک نہیں ہوں گا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آذربائیجان اور خراسان کے صوبوں میں جہاں کے باشندے شریعت مداری کے مقلد ہیں، لاکھوں آدمیوں نے الیکشن میں حصہ نہیں لیا۔ ڈاکٹر کریم سنجابی کی جبہ ملی، حزب جمہوری خلق اور مجاہدینِ خلق نے بھی الیکشن کا بائیکاٹ کر دیا۔ مسٹر حسن نزیہہ نے جو مشہور بیرسٹر اور نیشنل آئل کمپنی کے مینجنگ ڈائریکٹر ہیں اور محمد تقی مولوی بنک مرکزی کے گورنر نے اپنے نام واپس لے لیے۔ مسٹر نزیہہ نے اپنے بیان میں کہا کہ انتخابات جس انداز سے کیے جا رہے ہیں، وہ انقلاب کے وقار کی توہین ہے۔ خزستان کے بیس لاکھ عربوں نے بھی جو چار پانچ ماہ سے خمینی صاحب کے تشدد کا نشانہ بنے ہوئے ہیں، احتجاجاً انتخابات میں شرکت سے انکار کر دیا۔ جمہوری عناصر کے اس ملک گیر بائیکاٹ کے باوجود الیکشن میں بڑے پیمانے پر دھاندلیاں ہوئیں اور عقیدت مند ایرانیوں کو بھی پتہ چل گیا کہ اسلامی نظام کے علمبردار کتنے دیانتدار ہیں۔ حزب اللہ کے مسلح جتھوں نے بیلٹ بکس اپنے امیدواروں کی پرچیوں سے بھر دیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۷۳ میں سے ۵۵ نشستیں ملاؤں کو مل گئیں۔ ان میں سے بیشتر اتنے بوڑھے ہیں کہ دوسروں کے سہارے چھڑی ٹیک کر چلتے ہیں اور آئین سازی کے اصولوں سے بالکل ناواقف ہیں۔ خمینی صاحب نے ۱۹/ اگست کو مجلس کے افتتاح کے موقع

پر جو پیغام بھیجا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آئین میں ترمیمات کی نوعیت کیا ہوگی۔ انہوں نے ارکان مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ 'نئے آئین کو سو فیصدی اسلامی ہونا چاہیے۔ مسودے میں اس لحاظ سے ضروری ترمیمیں کرتے وقت آپ حضرات ہرگز یہ پروا نہ کریں کہ اخبارات کیا کہتے ہیں اور مغرب زدہ ارباب قلم کیا لکھتے ہیں۔'

خمینی صاحب کے فرماں بردار ملا، ان کے احکام کی بجا آوری بڑی سعادت مندی سے کررہے ہیں چنانچہ آئین کے مسودے میں جو ترمیمیں ہو رہی ہیں، ان کا واحد مقصد ایران کو ایک انتہائی رجعت پرست اور جابر تھیوکریسی میں تبدیل کرنا ہے۔ لہٰذا اسلام کی آڑ لے کر مولویوں کی آمریت کو مستحکم کرنے کے ایسے عجیب وغریب طریقے اختیار کیے جارہے ہیں جن کی مثال مسلمانوں کی چودہ سو سالہ تاریخ میں نہیں ملتی اور نہ جعفری یا حنفی فقہ ان کی تصدیق کرتا ہے۔ مثلاً آئین کی دفعہ ۵ میں ایک ترمیم کی گئی ہے جس کی رو سے 'امام آخرالزماں کے غیاب میں ایران کی اسلامی جمہوریہ کی سربراہی اور قیادت 'ولایت فقیہہ' کے سپرد ہوگی جو عادل، دین دار اور مومن ہوگی اور ملک کی اکثریت کے لیے قابلِ قبول ہوگی۔' ظاہر ہے کہ یہ صفات فقط آیت اللہ خمینی میں موجود ہیں۔ مزید برآں 'اگر کسی فردِ واحد کو اکثریت کا اعتماد حاصل نہ ہو تو ایک مجلس فقہا تشکیل دی جائے گی۔ مجلس فقہا کی تشکیل کا طریقہ قانون کے ذریعے متعین ہوگا۔'

اس دفعہ کی رو سے ریاست کے سربراہ کو شاہ سے بھی زیادہ اختیارات حاصل ہوں گے کیونکہ شاہ نے کبھی روحانی پیشوا ہونے کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ جبکہ نئے آئین کے تحت ریاست کا سربراہ دنیاوی اور روحانی دونوں امور کا پیشوا ہوگا۔ حضرت علیؑ کے بعد یہ اعلیٰ مقام خمینی صاحب ہی کو نصیب ہوگا۔ وہ پہلے آیت اللہ سے امام بنے، پھر گردوں سے جن کو وہ طاغوتی کہتے ہیں جہاد کے دوران 'اول الامر' بنے اور اب خلافت کی مسند پر بیٹھنے کی کوشش کررہے ہیں۔

ملاؤں کے اس بڑھتے ہوئے اثر و اقتدار نے مہدی بازارگان کے سے اطاعت گزار کو بھی منہ کھولنے پر مجبور کردیا ہے۔ انہوں نے ۱۶ر ستمبر کو سرکاری خبر رساں ایجنسی 'پارس' کو انٹرویو دیتے ہوئے ملاؤں کو علانیہ 'رجعت پرست' کہا اور ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ ملک کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ بازارگان نے مجلس خبرگاں پر بھی کڑی نکتہ چینی کی اور کہا کہ اس نے اپنی طرف

سے دفعہ ۵ کا اضافہ کر کے معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے۔ کیونکہ آئین کے مسودے کی خمینی صاحب نے، حکومت نے اور اسلامی انقلابی کونسل تینوں نے منظوری دے دی تھی۔ مولویوں نے شخصیت پرستی کی جو وبا ملک میں پھیلا رکھی ہے اس کی مذمت کرتے ہوئے مہدی بازارگان نے کہا کہ کیا اندھیر ہے کہ آنحضرت صلعم کو تو فقط ایک صلواۃ (صلواۃ بر محمدؐ و آل محمدؐ) ملے اور خمینی صاحب کو تین صلواتیں ملیں۔ انہوں نے آیت اللہ طیلقانی مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ طیلقانی نے مغربی تہذیب کے مثبت پہلوؤں کی ہمیشہ تعریف کی اور کٹرپن، لکیر کی فقیر ملائیت اور جبر واستبداد کے خلاف لڑتے رہے۔ انہوں نے کہا کہ اسلام دین میں جبر کا قائل نہیں بلکہ جبری آزادی بھی غلامی سے بدتر ہے اور عورتوں کو چادر یا نقاب اوڑھنے پر زبردستی مجبور کرنا چادر اور نقاب اوڑھنے سے سو گنا برا ہے۔

ڈاکٹر مہدی بازارگان کی جانِ مجنوں دوگونہ عذاب میں مبتلا ہے۔ ان سے نہ لیلائے وزارت چھوڑی جاتی اور نہ اپنائی جاتی۔ اُن کی مثال اُس اونٹ کی ہے جو بانس کے سہارے رسی پر چلتا ہے اور اپنا توازن برقرار رکھنے کی خاطر بانس کو کبھی دائیں جانب جھکاتا ہے اور کبھی بائیں جانب۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ خمینی صاحب مہدی بازارگان کے ہاتھ سے یہ بانس کب چھین لیتے ہیں۔

دفعہ ۵ کے بارے میں ڈاکٹر عزت اللہ صحابی کا ایک انٹرویو تہران کے اخباروں میں چھپا ہے— ڈاکٹر عزت اللہ صحابی اسلامیات کے مشہور عالم ہیں۔ خمینی صاحب نے آئین کا مسودہ تیار کرنے کے لیے جو کمیٹی بنائی تھی ڈاکٹر صحابی اس میں شامل تھے۔ دفعہ ۵ کے بارے میں ان کا ایک انٹرویو تہران کے اخباروں میں چھپا ہے— جس میں انہوں نے اس دفعہ کو 'اسلام کے لیے زبردست خطرے' سے تعبیر کیا ہے۔ انہوں نے یہ انکشاف بھی کیا کہ آیت اللہ طیلقانی مرحوم جو انقلابی کونسل کے صدر تھے، اس دفعہ کو آئین میں شامل کرنے کے سخت خلاف تھے اسی بنا پر انہوں نے گزشتہ چار ماہ سے اسلامی انقلابی کونسل کا احتجاجاً مقاطعہ کر رکھا تھا۔ ڈاکٹر عزت اللہ نے اس دفعہ کی خرابیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا کہ 'حکومت اگر غلطی کرے گی تو اُس کو بدلا جاسکتا ہے لیکن 'ولایت فقیہہ' سے اگر غلطی سرزد ہوئی تو لوگوں کا علما اور اسلام دونوں پر سے اعتبار اٹھ جائے گا۔'

نسلی اقلیتوں کا مسئلہ

نسلی اقلیتوں کا مسئلہ بورژوا ریاستوں کی بڑی دُکھتی رگ ہے۔ ہر چند کہ حاکم طبقہ، ملک کے محنت کشوں کی غالب اکثریت کے مقابلے میں خود اقلیت ہوتا ہے لیکن وہ نسلی اقلیتوں کے حقوق کو تسلیم نہیں کرتا اور نہ ان کو اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ وہ اپنی قومی انفرادیت اور اپنی زبان وتہذیب کو فروغ دینے کے ذرائع اختیار کریں۔ اقلیتیں اگر ریاست کی حدود میں رہ کر بھی خود مختاری کا مطالبہ کرتی ہیں تو ان پر فوراً یہ تہمت لگا دی جاتی ہے کہ تم لوگ ریاست کی وحدت اور سالمیت کے دشمن ہو، تم علیحدگی پسند ہو لہٰذا غدار ہو۔ سوچ کا یہ انداز اور اقلیتوں کے ساتھ سوتیلے بھائیوں کا سا، یہ غیر انسانی سلوک مغرب اور مشرق دونوں میں یکساں مقبول ہے چنانچہ امریکہ اپنے دو ڈھائی کروڑ نیگرو باشندوں کو اب تک دوسرے درجے کا شہری تصور کرتا ہے۔ اُن وفاقی ریاستوں میں بھی جہاں نیگرو آبادی کی اکثریت ہے، کالے لوگوں کو نظم ونسق میں کسی قسم کا دخل نہیں ہے اور نہ اسمبلیوں اور عدالتوں میں ان کے نمائندوں کو شریک کیا جاتا ہے۔ وفاقی کانگریس میں بھی کوئی نیگرو، سینیٹ یا ایوانِ نمائندگی کا رکن نہیں ہے۔ کینیڈا میں فرانسیسی اقلیت گلے کی ہڈی بنی ہوئی ہے۔ آئرلینڈ، لبنان اور شام میں مذہبی اقلیتوں کو دبایا جاتا ہے۔ عراق اور ترکی میں کردوں کے ساتھ اسی قسم کا برتاؤ ہوتا ہے۔ اسرائیل میں عربوں پر ظلم توڑا جارہا ہے۔ پاکستان میں بھی نسلی اقلیتوں کا مسئلہ ابھی تک حل نہیں ہوسکا ہے لیکن ایران میں تو اس مسئلے نے باقاعدہ خانہ جنگی کی شکل اختیار کرلی ہے اور اگر ایران کے حاکموں نے کُردوں، عربوں، ترکوں اور بلوچوں کے صوبائی خودمختاری کے حق کو نیک نیتی سے تسلیم نہ کیا بلکہ خمینی صاحب کی قتلِ عام کی مہم بدستور جاری رہی تو ایران کی سالمیت سچ مچ خطرے میں پڑ جائے گی۔

ایران کا حکمراں طبقہ مختلف قوموں کا وجود تو تسلیم کرتا ہے مگر ان کو قومی حقوق دینے پر راضی نہیں ہے۔ مثلاً نئے آئین کی رو سے 'در جمہوریہ اسلامی ایران ہمہ اقوام از قبیل فارس، ترک، کُرد، بلوچ، ترکمان ونظائر ایں ہا از حقوق کاملا مساوی برخوردارند وہیچ کس را بر دیگرے امتیازے نیست مگر اساس تقوی۔' لیکن اس نام نہاد مساوات کی نوعیت وہی ہے جس کا مظاہرہ ہر

روز اقلیتی صوبوں میں دیکھنے میں آتا ہے۔ مرکزی حکومت کا تو ذکر ہی کیا اُن علاقوں میں بھی جہاں نسلی اقلیتوں کی اکثریت ہے، تمام کلیدی اسامیوں پر اہلِ فارس قابض ہیں۔

ایران میں مردم شماری عرصے سے نہیں ہوئی ہے لیکن 'فائننشل ٹائمز' کے نامہ نگار اینڈریو وہیلے کے اندازے کے مطابق ایرانی قوموں کی آبادی حسب ذیل ہے:

(۱)	فارس	ایک کروڑ ۶۵ لاکھ	۹۰ فیصد شیعہ ۵ فیصد سنی ۵ فیصد بہائی
(۲)	ترک	ایک کروڑ ۲۰ لاکھ	۹۵ فیصد شیعہ ۵ فیصد سنی
(۳)	کُرد	۳۵ لاکھ	۶۵ فیصد سنی ۳۵ فیصد شیعہ
(۴)	عرب	۲۰ لاکھ	۷۰ فیصد شیعہ ۳۰ فیصد سنی
(۵)	بلوچ	۵ لاکھ	۸۰ فیصد سنی ۲۰ فیصد شیعہ
(۶)	ترکمان	۵ لاکھ	۹۵ فیصد سنی ۵ فیصد شیعہ
	کل	۳ کروڑ ۵۰ لاکھ	

اس تخمینے کے مطابق فارس قوم کی آبادی بقیہ قوموں سے ہر چند کہ زیادہ ہے لیکن مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو وہ خود اقلیت میں ہے۔ دوسرے نمبر پر آذر بائیجانی ترک ہیں جو بہت ترقی یافتہ ہیں اور حکومت میں بھی وہ اہلِ فارس کے شریک ہیں مثلاً ڈاکٹر مہدی بازارگان، حسن نزیہہ اور دوسرے بہت سے ممتاز عہدے دار آذر بائیجانی ہیں۔ البتہ کُردوں، عربوں، ترکمانوں اور بلوچوں کو کوئی نہیں پوچھتا بلکہ اس بات کی پوری کوشش کی جاتی ہے کہ وہ بدستور پسماندہ رہیں

اور نظم ونسق میں ان کا کوئی عمل دخل نہ ہو۔ لیکن جغرافیائی اور سیاسی اعتبار سے ان نسلی اقلیتوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے کیونکہ وہ سب کی سب سرحدی علاقوں میں آباد ہیں۔ ترکمانی قوم شمال میں سوشلسٹ جمہوریہ ترکمانستان کی ہمسایہ اور ہم قوم ہے۔ آذری ترکوں کی سرحد ترکی اور سوویت آذربائیجان سے ملتی ہے اور کُردستان کے اُس پار عراقی کُرد آباد ہیں جن کی رشتے داریاں ایرانی کُردوں سے ہیں۔ خوزستان کے عرب باشندے عراق اور کویت کے ہم نسل عربوں کے پڑوسی ہیں اور بلوچ قوم افغانستان اور پاکستان کے بلوچوں کی ہمسایہ ہے۔ ایسی صورت میں نسلی اقلیتوں کا مسئلہ ایران اور اس کے ہمسایہ ملکوں کے درمیان کشیدگی کا باعث بن سکتا ہے۔ مگر کُردوں اور عربوں پر حکومتِ ایران کے حالیہ تشدد کی وجہ مذہبی اختلافات نہیں ہیں کیونکہ خوزستانی عربوں کی غالب اکثریت شیعہ ہے اور کُردوں میں بھی کم از کم ۳۵ فیصد شیعہ ہیں بلکہ فساد کی جڑ فارسی حاکموں کا نسلی تعصب ہے۔

شاہ کے ابتدائی دور ۱۹۴۶ء۔۱۹۴۷ء میں صوبائی خود مختاری کی تحریک کے مرکز آذربائیجان اور کُردستان تھے۔ لہٰذا شاہ نے ترکوں اور کُردوں کا زور توڑنے کی غرض سے صوبوں کی ازسرِنو حد بندی اس طرح کردی کہ آذربائیجان دو حصّوں میں (مغربی اور مشرقی آذربائیجان) اور کُرد چار حصّوں (ایلم، کرمان شاہ، کُردستان اور مغربی آذربائیجان) میں بٹ گئے۔ کُرد جن علاقوں میں آباد ہیں وہ بیشتر کوہستانی ہے۔ پہاڑوں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا ہے۔ ان پہاڑوں کے دامن میں جہاں کہیں تھوڑی بہت زمین قابلِ کاشت ملی ہے کُردوں نے وہاں اپنی بستیاں بسا لی ہیں لیکن آبپاشی کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے اناج کی پیداوار ان کی ضرورتوں کو پورا نہیں کرتی۔ لہٰذا وہ بھیڑ بکریاں پال کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کی اکثریت ہنوز خانہ بدوش ہے اور اپنے مویشیوں کو لے کر گھاس چارے کی تلاش میں پہاڑوں پر ماری ماری پھرتی ہے۔ سنندج، ماہ آباد اور نقدہ ان کے خاص شہر ہیں لیکن وہ بھی بہت پس ماندہ ہیں۔ کُردوں کی مذہبی پیشوا عزالدین حسینی ہیں جن کا اثر زیادہ تر خانہ بدوش قبیلوں پر ہے۔ البتہ سیاسی قیادت کُرد ڈیموکریٹک پارٹی کی ذمے داری ہے۔ اس پارٹی کے لیڈر ڈاکٹر عبدالرحمان قاسم لو ہیں۔

کُرد بڑی جفاکش اور بہادر قوم ہے۔ ہمارے سرحدی پٹھانوں کی طرح کُرد بھی بندوق رائفل کو مرد کا زیور سمجھتے ہیں۔ وہ اپنی شخصی آزادی پر کسی قسم کی پابندی کو برداشت نہیں کر سکتے اور اپنے قومی وقار کے لیے بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہیں کرتے مگر افسوس ہے کہ اس غیور اور خود دار قوم کی ان خوبیوں کی قدر نہ تو عراق اور ترکی نے کی اور نہ ایران نے بلکہ تینوں، صدیوں سے کُردوں کی قومی شخصیت کو ختم کر دینے کے درپے ہیں۔

کُرد گزشتہ ۳۵ سال سے برابر یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ صوبائی حد بندیوں کو جن کے باعث ان کی وحدت پارہ پارہ ہو گئی ہے توڑ دی جائے اور ان کا ایک الگ صوبہ بنایا جائے۔ ان کے صوبائی خودمختاری کے حق کو تسلیم کیا جائے اور ان کے علاقے میں جو فوجی چوکیاں بنیں، ان میں کُردوں کی نمائندگی بھی ہو۔ فروری انقلاب کے بعد ڈاکٹر عبدالرحمٰن قاسم لو اور شیخ عزالدین حسینی نے کئی بار خمینی صاحب سے ملاقات کی اور بقول ڈاکٹر عبدالرحمٰن 'ہم نے پوری کوشش کی کہ حکومت سے ہمارا کوئی سمجھوتہ ہو جائے میں نے خمینی صاحب سے عرض کیا کہ کُردوں کا صوبائی خودمختاری کا مطالبہ نیا نہیں ہے بلکہ ہم ۳۴ سال سے اپنا یہ حق مانگ رہے ہیں مگر ہر بار ہم کو یہی جواب ملا کہ ٹھیک ہے ہم سب بھائی بھائی ہیں، ہم سب مسلمان ہیں اور سب کو اس کا حق ملے گا۔' (روزنامہ مسلم، اسلام آباد ۲۲ر ستمبر) انہوں نے خمینی صاحب کو یہ بھی یقین دلایا کہ کُردوں کا کوئی ارادہ الگ ریاست بنانے کا نہیں ہے بلکہ وہ ایران کی سالمیت کو اتنا ہی عزیز رکھتے ہیں جتنا دوسری قومیں۔ انہوں نے اپنی نیک نیتی ثابت کرنے کے لیے مجلس خبرگاں کے انتخاب میں بھی حصہ لیا اور کُردستان سے ڈاکٹر عبدالرحمٰن کو منتخب کیا مگر یہ ساری کوششیں رائیگاں گئیں۔

خمینی صاحب اور ان کے رفقاء صوبائی خودمختاری کے سرے سے مخالف ہیں۔ اُن کو یہ اندیشہ ہے کہ آج اگر کُردوں کا یہ حق مان لیا جائے تو کل خزستان کے عربوں کو بھی صوبائی خودمختاری دینی ہوگی اور پرسوں بلوچ اور ترکمان یہی مطالبہ لے کر اٹھ کھڑے ہوں گے اور فارس قوم کے بالائی طبقے کی حکومت پر اجارہ داری ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ صوبائی خودمختاری کی تحریک کا سر کچلنے کی غرض سے کُردوں کو جو اس تحریک میں پیش پیش تھے۔ سب سے پہلے جبر و تشدد کا نشانہ بنایا گیا مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مہدی بازرگان اور فوج کے سربراہ اس اقدام کے حق میں

نہ تھے لہٰذا فوج نے ٹال مٹول سے کام لیا۔ وہ ہم وطنوں پر گولی چلانے کا انجام دیکھ چکی تھی اور دوبارہ یہ تجربہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ تب خمینی صاحب نے عالمِ دین ہونے کے باوصف ہٹلری ہتھکنڈوں سے کام لیا اور قوتِ قاہرہ کے تمام اعضاء حرکت میں آ گئے۔ ابلاغ عامہ کے نگراں صادق قطب زادہ کو اشارہ ہوا اور تہران کے اخبار، ٹیلیویژن اور ریڈیو چیخنے لگے کہ کردوں نے ماہ آباد اور سنندج میں بغاوت کردی ہے اور فوجی چھاؤنی پر حملہ کر کے سپاہیوں کے بیوی بچوں کو اٹھالے گئے ہیں۔ حزب اللہ کو اشارہ ہوا اور ہزاروں مجاہدین وزیر اعظم کے دفتر کے سامنے مظاہرے کرنے لگے۔ اس طرح ملک میں ایک مصنوعی بحران پیدا کیا گیا۔

لیکن کردوں کی مسلح بغاوت کی خبریں بالکل من گھڑت تھیں۔ چنانچہ کردستان کے گورنر جنرل محمد رشید شکیبا کو جب پتہ چلا کہ کردستان پر فوجی چڑھائی کا حکم دیا گیا ہے تو انہوں نے کہا کہ 'یہاں تو امن ہے، نہ کردوں نے کسی فوجی چھاؤنی پر حملہ کیا اور نہ وہ سپاہیوں کے بیوی بچوں کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔' رشید شکیبا نے اپنے بیان میں اس بات پر بھی افسوس کا اظہار کیا کہ مجھ سے مشورہ کیے بغیر فوج کو ہوائی جہازوں اور ہیلی کاپٹروں سے یہاں بھیجا جا رہا ہے۔' چند دنوں کے بعد مہدی بازارگان نے بھی اعتراف کرلیا کہ بغاوت کی اطلاع 'غلط فہمی' پر مبنی تھی۔ مگر خمینی صاحب کردوں کو سبق سکھانے کا عزم کر چکے تھے۔ بغاوت کی خبریں سچی تھیں یا جھوٹی ان کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔

اگست کے وسط میں جب کردوں کے خلاف سیاسی فضا تیار ہوگئی تو خمینی صاحب بہ نفس نفیس میدان جہاد میں اتر آئے۔ انہوں نے مہدی بازارگان پر کردوں سے رعایت برتنے کا الزام لگایا اور کہا کہ 'تم لوگ کافی انقلابی نہیں ہو۔' انہوں نے یہ دھمکی بھی دی کہ 'اگر حکومت نے اپنے طور طریقے درست نہ کیے تو میں خود تہران آؤں گا اور تم سب کو انقلابی طریقے پر سیدھا کردوں گا۔' ان کو اس بات کا بڑا غم تھا کہ لوگوں کے ساتھ ابتدا میں نرمی کیوں برتی گئی۔ انہوں نے کہا کہ 'ہم سے غلطی ہوگئی اگر ہم نے شروع ہی میں ہر چوراہے پر سولی کھڑی کردی ہوتی اور ان طاغوتیوں کو پھانسی پر لٹکا دیا ہوتا تو آج یہ پریشانی نہ اٹھانی پڑتی۔' خمینی صاحب نے فوج کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ 'ایرانی افواج کا سپہ سالار آج سے میں ہوں۔ میں اولی الامر

ہوں لہٰذا ہر شخص پر میری اطاعت واجب ہے اور اگر فوج نے ۲۴ گھنٹوں کے اندر کردستان پر بھرپور حملہ نہ کیا تو فوج کے خلاف انقلابی کارروائی کی جائے گی۔'

اولی الامر خمینی صاحب کے اس آمرانہ طرزِ عمل کا ردعمل یہ ہوا کہ وزیر دفاع جنرل تقی ریاحی نے جو کردوں پر تشدد کے حق میں نہ تھے، استعفےٰ دے دیا اور پیرس چلے گئے۔ (یاد رہے کہ ڈاکٹر شاپور بختیار اور اس کے رفقاء ان دنوں پیرس میں مقیم ہیں اور خمینی صاحب کے خلاف ایرانیوں کو منظم کر رہے ہیں) حالانکہ جنرل ریاحی ڈاکٹر مصدق کے چیف آف اسٹاف رہ چکے ہیں۔ خمینی صاحب نے فوجی مہم کی کمان ملکی حفاظت کے وزیر مصطفےٰ چمران کے سپرد کر دی (جو لبنان کے شیعہ رہنما امام موسیٰ صدر کی فوج 'العمل' سے وابستہ رہ چکے ہیں۔ البتہ ایران میں ان سے کوئی واقف نہیں) اور جلادی کے فرائض شیخ خلخالی کو سونپے گئے۔ خمینی صاحب نے شیخ خلخالی کو ہدایت کی کہ 'خبردار! تمہارا کام باغیوں یا ان کے سرغنوں سے مصالحت کی بات چیت کرنا نہیں ہے بلکہ ان کی خاطر خواہ سرکوبی ہے۔' اسی کے ساتھ کرد ڈیموکریٹک پارٹی کو خلافِ قانون جماعت قرار دے دیا گیا۔ ڈاکٹر عبدالرحمان قاسم لو اور شیخ عزالدین حسینی کو غداری کا تمغہ ملا اور ان کو ان کی غیر حاضری میں موت کی سزا دے دی گئی۔

ایرانی فوج نے تین ہفتوں تک ماہ آباد، سنندج، نقدہ اور دوسری کرد بستیوں پر دن رات ہوائی جہازوں اور ٹینکوں سے گولہ باری کی، سینکڑوں کرد مارے گئے اور ان کے گھر جل کر خاک سیاہ ہو گئے۔ کردوں نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا لیکن تا کجے، آخر انہوں نے بھاگ بھاگ کر پہاڑوں میں پناہ لی جو گرفتار ہوئے ان کو اسلامی عدالت کے حکم سے گولی مار دی گئی۔ فقط سقاز میں خلخالی صاحب کی موجودگی میں ۸۰ کردوں کو گولی سے اڑا دیا گیا۔ قرنا کردوں کی ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ ۴ ستمبر کو جب گاؤں والوں نے سنا کہ 'پاسدارانِ انقلاب' ان کی حفاظت کرنے آ رہے ہیں تو مسجد کے پیش امام ملا محمود نے سب لوگوں کو پاسداروں کا خیر مقدم کرنے کے لیے جمع کیا۔ ملا محمود آگے آگے چل رہا تھا اس طرح کہ اس کے ایک ہاتھ میں قرآن تھا جس کو سر پر رکھے ہوئے تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ ایک بچے کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھا لیکن اسلام کے مجاہدوں نے نہ قرآن کا احترام کیا اور نہ نہتی عورتوں، بچوں کی پرواہ کی اور دیکھتے

ہی دیکھتے ۴۶ لاشیں زمین پر تڑپنے لگیں۔ ان میں چار عورتیں اور سات بچے بھی تھے۔ جو مرد زندہ بچے، پاسداروں نے ان کے بھی سر قلم کر دیے۔ اس 'جہاد' کا سب سے بیش قیمت تحفہ یقیناً قرآن کریم کا وہ نسخہ ہوگا جس پر ملا محمود اور معصوم بچے کے خون کی چھینٹیں پڑی ہوں گی۔

ایرانی حکومت نے وقتی طور پر کردوں پر غلبہ پا لیا ہے لیکن اس غلبے سے کردستان کا مسئلہ ہرگز حل نہیں ہوگا اور نہ کردوں کا قومی جذبہ سرد پڑے گا۔ آقائے شریعت مداری نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ 'اس امن کی کیا قدر و قیمت ہے جو توپوں کی طاقت سے قائم کیا جائے۔' دراصل خمینی صاحب نے اپنے جارحانہ طرزِ عمل سے ثابت کر دیا ہے کہ 'روحانیوں' میں ملک کے مسائل کو حل کرنے کی بالکل صلاحیت نہیں ہے۔ ان کے پاس لے دے کر ایک ہی نسخہ رہ گیا ہے اور وہ ہے تشدد۔ اخبار نویس آواز اٹھائیں تو ان پر تشدد، سیاسی جماعتیں احتجاج کریں تو ان پر تشدد، نسلی اقلیتیں اپنا حق مانگیں تو ان پر تشدد۔ خمینی صاحب اور ان کے رفقا کا سیاسی دیوالیہ پن روز بروز نمایاں ہوتا جا رہا ہے اور وہ لوگوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر رہے ہیں کہ اسلامی نظام فقط جبر و تشدد اور پھانسی کوڑوں کا نظام ہے۔ اس نظام میں عوام کے دکھ درد کا مداوا نہیں ہے۔

کردوں کا خیال تھا کہ صوبائی خود مختاری کا مسئلہ افہام و تفہیم سے پُرامن طریقے پر حل ہو جائے گا مگر افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہوا اور اب وہ اپنے حق کے لیے مسلح جدوجہد کے لیے مجبور کر دیے گئے ہیں۔ ان کے چھاپے مار دستے 'پیش مرگاں' پہاڑوں میں تربیت پا رہے ہیں اور ایرانی فوجوں پر وقتاً فوقتاً حملے کر رہے ہیں۔ اس جدوجہد کا انجام جو بھی ہو کردستان کا علاقہ طویل عرصے کے لیے امن سے اور استحکام سے محروم ہو گیا ہے اور ایرانی حکومت نے جس کے سامنے بے شمار حل طلب مسائل پہلے ہی سے موجود ہیں خود کو بلاوجہ دلدل میں پھنسا لیا ہے۔

کردستان میں قتل عام کرنے سے خمینی صاحب کا مقصد دوسری نسلی اقلیتوں کو بھی متنبہ کرنا تھا کہ دیکھو، اگر تم نے سر اٹھایا تو تمہارے ساتھ بھی وہی برتاؤ کیا جائے گا جو کردوں کے ساتھ ہوا۔ اس کے علاوہ خمینی فوج کا حوصلہ بھی بڑھانا چاہتے تھے کیونکہ شاہ کی طرح اب وہ بھی محسوس کرنے لگے ہیں کہ دوامی طاقتوں سے نمٹنے کے لیے ان کو فوج کا سہارا لینا پڑے گا لیکن شاہ کی پروردہ فوج کا وقار بحال کرنے کی کوشش بڑا خطرناک کھیل ہے۔ اس کا انجام عموماً وہی ہوتا ہے

جس سے پاکستان ان دنوں گزر رہا ہے۔ اس کی کیا ضمانت ہے کہ جمہوری تحریکوں کی سرکوبی کے بعد فوج خمینی صاحب کو ہٹا کر اقتدار خود نہیں سنبھال لے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ ملاؤں نے ایران میں جو اندھیر مچا رکھا ہے اس سے لوگ اتنے عاجز آ چکے ہیں کہ فوج اگر حکومت پر قبضہ کر لے تو لاکھوں ایرانی اس کا خیر مقدم کریں گے۔ خمینی صاحب نے کردوں کی فرضی بغاوت کی آڑ لے کر سیکولر جماعتوں پر بھی ضرب لگائی۔ ان کے دفتر سر بمہر ہو گئے ان کے اخبار اور رسالے بند کر دیئے گئے اور ان کے لیڈر روپوش ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہے ایران میں اب نہ کوئی اخبار باقی ہے جو حکومت کی بدعنوانیوں کی نشاندہی کر سکے، نہ کوئی جماعت جو خمینی صاحب کی آمریت کو للکارے۔ سرکاری محکموں اور قومی صنعتوں سے ان لوگوں کو چن چن کر نکالا جا رہا ہے جن کی وفاداری مشکوک نظر آتی ہے اور ان حضرات کو انعام واکرام سے نوازا جا رہا ہے جنہوں نے کردوں کی شورش کو کچلنے میں اعلیٰ خدمات سرانجام دی تھیں۔ یہ کوئی اتفاقی بات نہیں ہے کہ 'فتح کردستان' کے فوراً بعد وزارتوں میں اہم تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ مصطفےٰ کمال کو جنرل ریاحی کی جگہ وزیر دفاع مقرر کیا گیا اور حسن نزیہہ چیئرمین نیشنل ایرانی آئل کمپنی برطرف کر دیئے گئے ہیں۔

حسن نزیہہ کو ڈاکٹر مہدی بازرگان نے گذشتہ مارچ میں نیشنل ایرانی آئل کمپنی کا سربراہ مقرر کیا تھا۔ وہ تہران کے ممتاز وکیل ہیں اور شاہ کے خلاف تحریک میں پیش پیش رہ چکے ہیں۔ اُن کا جھکاؤ بائیں بازو کی جانب نہیں ہے اور نہ وہ تیل مزدوروں کے چہیتے ہیں۔ البتہ وہ ریاستی امور میں ملاؤں کی مداخلت کے ابتدا ہی سے مخالف تھے اور اپنے ان خیالات کا اظہار برملا کرتے رہتے تھے۔ اس وجہ سے خمینی صاحب سے اُن کی کبھی نہیں بنی۔ اخباروں پر پابندی، احتصوبِ رائے، اسلامی عدالتوں کی لاقانونیت، سیاسی جماعتوں پر تشدد، مجلس خبرگاں کی تشکیل غرضیکہ ملک کے ہر اہم مسئلے پر انہوں نے ملاؤں کے طرزِ عمل پر کڑی نکتہ چینی کی ہے۔ مجلس خبرگاں کے انتخاب کے موقع پر تو انہوں نے اپنا نام یہ کہہ کر واپس لے لیا تھا کہ اس انتخاب میں شرکت انقلاب کی توہین ہے۔ ایسی صورت میں خمینی صاحب اور حسن نزیہہ کے درمیان اختلافات کا بڑھنا لازمی بات تھی۔ یوں بھی ملک کے سب سے اہم سرکاری عہدے پر کسی ایسے شخص کی موجودگی کیسے برداشت کی جا سکتی تھی جو خمینی صاحب کا سو فیصدی وفادار نہ ہو۔ چنانچہ

حسن نزیہہ سے نمٹنے کے لیے کردستان کی طرح تیل کمپنی کے اندر بھی ایک فرضی بحران کی فضا تیار کی گئی۔ اخباروں میں تیل مزدوروں کی بے چینی کی خبریں چھپنے لگیں اور حسن نزیہہ پر یہ الزام لگایا گیا کہ مزدوروں سے ان کا سلوک اچھا نہیں ہے اور وہ غیر ملکی ماہرین کی پشت پناہی کررہے ہیں۔ تب تیل کمپنی کے نظم ونسق کی تحقیقات کے لیے خمینی صاحب نے اپنے داماد حجتہ الاسلام اشراقی کو مقرر کیا۔ اس پر حسن نزیہہ کا ردِعمل یہ تھا کہ 'سارا فساد ان لوگوں کا ہے جو خمینی صاحب کو اسلام کے نام پر جھوٹی خبریں پہنچاتے ہیں۔' حجتہ الاسلام صاحب کی کارروائی کی سوجھ بوجھ پر طنز کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ 'حجتہ الاسلام کو چاہیے تھا کہ کم ازکم سات مہینے تک تیل کمپنی کی جانچ پڑتال کرتے تب اپنی رائے کا اظہار کرتے کیونکہ تیل کی صنعت کے اسرار و رموز ہفتے دو ہفتے میں سمجھ میں نہیں آسکتے۔' لیکن حسن نزیہہ کی قسمت کا فیصلہ تحقیقات سے بہت پہلے ہوچکا تھا۔ تحقیقات تو محض ایک رسمی کارروائی تھی۔

تحقیقات کی رپورٹ تو شائع نہیں ہوئی البتہ ایک روز اشراقی صاحب نے ٹیلیویژن سے اعلان کردیا کہ حسن نزیہہ، آیت اللہ خمینی کا اعتماد کھو چکے ہیں۔ دوسرے دن ۲۸ ستمبر کو حسن نزیہہ برطرف کردیے گئے اور اسلامی عدالت نے ان کو حکم دیا کہ ۲۴ گھنٹے کے اندر حاضر ہوکر تیل مزدوروں کے الزامات کا جواب دو۔ تیل کمپنی کے اسلام پسند گروہ ان پر انقلاب دشمنی اور غداری کے سنگین الزامات لگا رہے ہیں، جن کی سزا موت ہے۔

پہلے افواہ گرم تھی کہ آیت اللہ رفسنجانی یا صادق قطب زادہ کو حسن نزیہہ کی جگہ تیل کمپنی کا سربراہ بنایا جارہا ہے لیکن بدنامی کے ڈر سے اس فیصلے کو وقتی طور پر ملتوی کردیا گیا ہے اور تیل کمپنی کی عارضی نگرانی علی اکبر معین فر کے حوالے کردی گئی ہے جو وزیر صنعت بھی ہیں۔

خزستان کے عربوں کا مسئلہ کردوں سے کہیں زیادہ نازک اور پیچیدہ ہے۔ ایرانی کردوں سے نہ ترکی کو کوئی ہمدردی ہے اور نہ عراق کو بلکہ دونوں کی برابر یہی کوشش ہے کہ ایرانی کردوں کی جدوجہد کا اثر ان کے ملک میں بسے ہوئے کردوں پر نہ پڑنے پائے۔ اس کے علاوہ کردستان میں کوئی ایسی معدنی دولت بھی نہیں ہے جس کی کشش ہمسایہ ملکوں کو اپنی جانب متوجہ کرے مگر خزستان کو تو قدرت نے تیل اور گیس کی دولت سے مالا مال کیا ہے اور ایران کی

معیشت کا سارا انحصار ہی تیل اور گیس کی آمدنی پر ہے۔ خرم شہر اور ابادان جہاں دنیا کی سب سے بڑی آئل ریفائنری ہے، تیل کی نکاسی کا واحد مرکز ہیں۔ یہ بندرگاہیں عراق کی سرحد پر ہیں۔ اس کے علاوہ خلیج فارس کے ساحل پر واقع ہونے کے باعث خزستان کے عرب باشندے خلیج کی عرب ریاستوں سے بھی بڑی آسانی سے رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ ایران میں اسمگلنگ کا کاروبار عرب امارتوں ہی کے توصل سے ہوتا ہے۔

عرب ریاستوں کے حکمران طبقے نے ایرانی انقلاب کو کبھی اچھی نظروں سے نہیں دیکھا۔ عربوں کو یہ تشویش تھی کہ شاہ کے خلاف تحریک سے مبادا ان کے علاقوں میں بھی جمہوریت پسند عناصر کے حوصلے بڑھیں اور لوگ اپنے حقوق کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ اسی خیال سے عراق نے اکتوبر میں آیت اللہ خمینی کو جو پندرہ سال سے نجف میں مقیم تھے، ملک چھوڑ دینے پر مجبور کیا اور کویت نے ان کو اپنی ریاست میں داخل ہونے کی بھی اجازت نہ دی۔ آیت اللہ خمینی نے برسر اقتدار آنے کے بعد جو رویہ اختیار کیا ہے اس سے بھی ایران اور عرب ریاستوں کے مابین تعلقات بہتر نہیں ہوئے بلکہ روز بروز کشیدہ ہوتے جا رہے ہیں۔ اس پس منظر میں خزستان کے مسئلے کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔

رضا شاہ اول خزستان کو طنزاً عربستان کہا کرتا تھا۔ تیل کی دریافت سے پہلے اس خطے کی حیثیت آزاد علاقے کی سی تھی۔ مرکزی حکومت کا اثر و رسوخ بس واجبی واجبی تھا۔ عراق اور ایران کی سرحدیں بھی متعین نہ تھیں چنانچہ ایک ہی قبیلے کے کچھ لوگ سرحد کے اس طرف آباد تھے اور کچھ دوسری طرف۔ البتہ تیل کی صنعت کو فروغ ہوا تو مرکزی حکومت نے فوج کے ذریعے خزستان پر اپنا تسلط قائم کیا۔ صوبائی حکومت کے نظم و نسق کے لیے تہران سے فارسی نژاد ایرانی افسر خزستان روانہ کیے گئے۔ فوج، پولیس اور دوسرے سرکاری محکموں میں فارسیوں کی ریل پیل ہو گئی اور تیل کی صنعت بھی انہیں کے سپرد کر دی گئی۔ اہواز، خرم شہر، ابادان، مسجد سلیمان وغیرہ میں فارسیوں کی سہولت کے لیے کوٹھیاں، بنگلے، سڑکیں، بازار تعمیر ہوئے اور خزستان پوری طرح فارس قوم کی نو آبادی بن گیا۔

خزستان کے عربوں کو امید تھی کہ پہلوی دور میں ان کے ساتھ جو ناانصافی ہوئی ہے،

خمینی صاحب کے راج میں اس کی تلافی ہوجائے گی۔ کیونکہ عربوں نے انقلاب میں پورے جوش اور ولولے سے شرکت کی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ شاہ کی فوج کو جس چیز نے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کیا تھا وہ خزستان کے تیل کے مزدوروں کی تین ماہ کی زبردست ہڑتال تھی۔ چنانچہ شاہ کے ایک امریکی مشیر نے سچ کہا تھا کہ 'ہم تہران کی سڑکوں پر مظاہرہ کرنے والوں سے نہیں ڈرتے لیکن تیل کے مزدوروں کی ہڑتال سے تو حکومت کی کمر ٹوٹ جائے گی۔'

عربوں کے روحانی پیشوا شیخ محمد طاہر البشیر خاقانی ہیں۔ وہ بہت بوڑھے اور تقریباً نابینا ہیں اور خرم شہر کے نہایت پس ماندہ علاقے میں رہتے ہیں۔ وہ تقریباً دو مہینے تک خمینی صاحب سے عربوں کے حقوق کی خاطر گفت وشنید کرتے رہے مگر بے سود۔ خمینی صاحب یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے کہ خزستان میں عربوں کی اکثریت ہے یا ان کے کچھ اقلیتی حقوق ہیں۔ انہوں نے عربوں کا یہ مطالبہ بھی رد کردیا کہ تیل اور گیس کی آمدنی کا معقول حصہ خزستان کے ترقیاتی منصوبوں کے لیے وقف کردیا جائے اور عربوں کو سرکاری ملازمتیں ان کی آبادی کے تناسب سے ملیں۔

مئی کے اواخر میں حکومت کی طرف سے اشتعال انگیز کارروائیاں شروع ہوئیں۔ خزستان کے گورنر جنرل امیر الجرمدنی نے (جو بحریہ کے سربراہ بھی ہیں) عربوں کی تنظیم سازمان ثقافت وسیاست عربیہ کو ہدایت کی کہ وہ اپنے دفتر کی عمارت فوراً خالی کردے حالانکہ یہ عمارت سرکاری نہ تھی بلکہ کسی شاہ پسند بھگوڑے کی تھی، جس پر عرب نوجوانوں نے انقلاب کے دوران میں قبضہ کرلیا تھا۔ مدنی نے عربوں کو یہ حکم بھی دیا کہ وہ اپنے اسلحے حکومت کے حوالے کردیں۔ لطف یہ ہے کہ مدنی صاحب نے حزب اللہ کے مسلح دستوں سے ہتھیار واپس نہیں مانگے۔ عربوں نے اس کھلم کھلا جانب داری کے خلاف احتجاج کیا۔ وہ سازمان کے دفتر کے سامنے دھرنا دے کر بیٹھ گئے اور انہوں نے اسلحے واپس کرنے سے انکار کردیا۔

امیر الجرمدنی اسی موقع کے منتظر تھے۔ انہوں نے ابادان اور خرم شہر میں راتوں رات ایرانی فوجیں اتار دیں اور ۳۱ مئی کی صبح کو عرب بستیوں پر دھاوا کردیا۔ اس فوجی مہم میں تین دن کے اندر دو سو سے زائد عرب مارے گئے۔ ایرانی فوجوں نے شہر کی عرب بستیوں ہی کو تشدد کا

نشانہ نہیں بنایا بلکہ شیخ البشیر خاقانی کے بیان کے مطابق ۳۱ مئی اور یکم جون کو قرب وجوار کے پانچ عرب گاؤں پر بھی ہوائی جہازوں اور ہیلی کاپٹروں سے بمباری کی گئی۔ شیخ نے ان گاؤں کی نشاندہی بھی کی تھی مگر اخبارنویسوں نے وہاں جانے کی کوشش کی تو پاسدارانِ انقلاب نے گاؤں کی ناکہ بندی کردی اور کسی کو وہاں جانے کی اجازت نہ دی۔ شیخ خاقانی نے یہ دھمکی دی کہ اگر عربوں پر تشدد فوراً بند نہ کیا گیا تو میں ایران سے ہجرت کر جاؤں گا۔ انہوں نے کہا کہ 'ہم نے اسلام کی تعمیرنو کے لیے انقلاب کیا تھا لیکن حکومت اسلام کے خلاف چل رہی ہے۔ میں دنیا میں اسلام کا مسخ شدہ چہرہ نہیں دکھانا چاہتا بلکہ میری خواہش ہے کہ نسلی اقلیتوں، عورتوں، یہودیوں اور غیرملکیوں سب کے حقوق کی حفاظت ہو۔'

لیکن عربوں کی شورش تشدد سے ختم نہیں کی جاسکتی۔ وہ بے یارو مددگار نہیں ہیں بلکہ اُن کو ہمسایہ ملکوں بالخصوص عراق اور کویت کی اخلاقی حمایت حاصل ہے اور غالباً باہر سے ہتھیار بھی مل رہے ہیں۔ یہ صورتحال انتہائی تشویشناک ہے اور اگر خمینی صاحب نے تدبر اور دور اندیشی سے کام نہ لیا اور عربوں کے جائز حقوق کو بدستور نظر انداز کرتے رہے تو خزستان میں بیرونی مداخلت کے امکانات بڑھ جائیں گے۔ ایسی صورت میں تیل کی صنعت ہی تباہ نہیں ہوگی بلکہ ملک کی سالمیت بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔

کُردستان اور خزستان میں فوج کی انتقامی کارروائیاں جاری ہیں اور پاسدارانِ انقلاب کو پوری آزادی ہے کہ جس کو چاہیں گولی کا نشانہ بنائیں، جس کا گھر بار چاہیں لوٹ لیں۔ چنانچہ شاید ہی کوئی دن جاتا ہو جب دس بیس عربوں یا کُردوں کو گولی سے اڑا دینے کی خبر نہ آتی ہو۔ کسی پر توڑ پھوڑ کرنے کا الزام لگایا جاتا ہے، کسی پر بم پھینکنے اور تیل کی پائپ لائن میں آگ لگانے کا اور کسی پر ریل کی پٹڑی اکھاڑنے کا۔ یہ الزامات صحیح ہوں یا غلط، اسلامی عدالت کی انصاف پروری کا یہ عالم ہے کہ ملزموں کو نہ وکیل کرنے اور صفائی کے گواہ پیش کرنے کا موقع ملتا ہے اور نہ ہائی کورٹ میں اپیل کرنے کا۔ فیصلوں پر جس عجلت سے عمل ہوتا ہے اس سے شاہ کے دنوں کی یاد تازہ ہوجاتی ہے جب سیاسی مخالفین کو دہشت گردی کے الزام میں فوجی عدالت کے حکم سے گولی ماردی جاتی تھی۔

تازہ ترین اطلاع یہ ہے کہ ایرانی بلوچوں میں بھی خود مختاری کے حق کا جذبہ آہستہ آہستہ پیدا رہورہا ہے اور وہ صوبائی خود مختاری کا مطالبہ کرنے لگے ہیں۔ ابھی حال ہی میں مہدی بازارگان کو بھاگ کر زاہدان جانا پڑا تھا۔ اکتوبر کے اوائل میں لوکل باڈیز کے الیکشن کے موقع پر تو اس علاقے میں خاصی گڑ بڑ ہوئی اور بار بار صوبائی خود مختاری کے حق میں مظاہرے بھی ہوئے۔ اخبار، ایرانی بلوچوں کے مطالبوں کو مذہبی فرقہ واریت کا رنگ دے رہے ہیں حالانکہ کردوں اور عربوں کی مانند بلوچوں کا مطالبہ بھی قومی خود مختاری کے اصولوں پر مبنی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ 'خبر و نظر' ایران کے وزارت خارجہ کے شعبۂ اطلاعات کا مجلّہ ہے۔ یہ سرکاری رسالہ معترف ہے کہ 'ہر چند کہ سرکاری طور پر سنسر شپ موجود نہیں ہے لیکن دباؤ ڈالنے والے گروہ لوگوں کو مجبور کر رہے ہیں۔ حکومت کا دعویٰ ہے کہ اس کا ان گروہوں سے کوئی تعلق نہیں ہے مگر کسی کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کی پشت پر کون ہے۔ یہ لوگ کتابوں کی دکانوں اور چھاپہ خانوں پر، حتیٰ کہ نیوز اسٹینڈ اور چھابڑی والوں پر حملہ کرتے ہیں اور بائیں بازو کے لٹریچر کو ضائع کر دیتے ہیں۔ ذرفول میں ہجوم نے کتابوں کی ایک دکان میں آگ لگائی تو مالک کا آٹھ سالہ بچہ جل کر ہلاک ہوگیا۔ اصفہان میں کئی دکانوں پر بم پھینکے گئے، کتابوں کی ایک دکان تو بالکل برباد ہوگئی لیکن ان حادثات کی طرف اب تک حکومت نے کوئی توجہ نہیں دی ہے۔ نئی حکومت نے پہلی کتاب جس کی طباعت واشاعت ممنوع کی ہے وہ ایران کے جدید دور کے انتہائی لائق ادیب صادق ہدایت کی مشہور کتاب ہے۔' (۲۰ ستمبر)

2- *Guardian* (London), 18 September 1979.

3- *Guardian* (London), 20 May, 1979.

4- *Dawn,* 16 May, 1979.

بارہواں باب

ایک قدم آگے دو قدم پیچھے

(۲)

انقلابی عمل منفی اور مثبت اقدامات کا جدلی آمیزہ ہوتا ہے بلکہ منفی اقدامات بجائے خود مثبت اقدامات ہوتے ہیں جو مزید مثبت اقدامات کے لیے حالات کو ساز گار بناتے ہیں۔ انقلاب روحانی تطہیر کا سبب بھی ہوتا ہے اور اثر بھی۔ انقلاب کے دوران میں لوگوں کی نفسیات بدل دی جاتی ہیں۔ ان کا معاشرتی اخلاق اونچا ہو جاتا ہے اور ان کی فطری شرافت، انسانیت اور درد مندی میں نئی جان پڑ جاتی ہے۔ روٹی روزگار کے مسائل پسِ پشت ڈال دیئے جاتے ہیں اور ذاتی تکلیفوں کا ذکر بھی معیوب سمجھا جاتا ہے۔ البتہ معرکہ سر کرنے کے بعد جب انقلاب کا جوش وخروش کم ہوتا ہے اور حالات معمول پر آنے لگتے ہیں تو افکارِ حیات کی انبوہ در انبوہ یلغار ایک بار پھر شروع ہو جاتی ہیں اور انقلاب کے اغراض ومقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے تقاضے ہونے لگتے ہیں۔ ایران ان دنوں اسی نازک دور سے گزر رہا ہے۔

انقلاب کے دوران میں تو لوگوں کو بس ایک ہی دھن تھی کہ شاہ کا تختہ الٹے اور امریکی غلبہ ختم ہو مگر اب کہ انقلاب کا منفی دور گزر چکا ہے عوام اگر ملک کی اقتصادی بحالی اور تعمیرِ نو کے

مثبت اقدامات کا مطالبہ کریں تو ان پر خفا ہونے کا کسی کے پاس کیا جواز ہے؟

ایران بڑا دولت مند ملک ہے۔ اس کے وسائل اتنے وافر ہیں کہ لوگوں کو اگر اپنے اقتصادی حالات سدھارنے کا موقع ملا ہوتا تو ایران میں آج نہ کوئی بھوکا ہوتا نہ بے روزگار لیکن جہاں استحصال اور زر پرستی زندگی کا نصب العین بن جائے وہاں امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہوتے جاتے ہیں اور کرپشن، لوٹ، رشوت اور مہنگائی کی بدولت زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ یہی اقتصادی زبوں حالی ایرانی انقلاب کا سبب بنی۔ اب کوئی لاکھ کہے کہ 'ایرانیوں نے اسلام کے لیے خون کی قربانی دی تھی، سستے تربوزوں اور مکانوں کے لیے نہیں۔' (خمینی ۸ ستمبر) واقعہ یہی ہے کہ ایرانیوں نے روز مرہ کی پریشانیوں سے عاجز آکر انقلاب میں شرکت کی تھی۔ خمینی صاحب فرماتے ہیں کہ 'یہ بات بالکل ناقابلِ فہم ہے کہ کوئی شخص اپنے بیٹے کو سستی روٹی کے لیے قربان کر دے۔' مگر اس قسم کی طنز آمیز باتیں وہی شخص کر سکتا ہے جو زندگی میں کبھی بھوکا نہیں رہا یا جس نے کبھی اپنی محنت سے روٹی نہیں کمائی۔ خمینی صاحب کے اس بیان سے کیا ہم یہ نتیجہ نکال لیں کہ اسلامی نظام کو عوام کے دکھ درد سے کوئی دلچسپی نہیں؟ کیا خمینی صاحب کا اسلام یہ چاہتا ہے کہ سستے تربوز فقط اہلِ ثروت ہی کے دسترخوانوں پر نظر آئیں؟ کیا خمینی صاحب کا اسلام یہ چاہتا ہے کہ فقط دولت مند طبقہ مکانوں میں رہے اور غربا آسمان کی کھلی چھت کے نیچے سوئیں؟

شاہ کے عہد میں ایران کی معیشت ملی جلی سرمایہ دارانہ معیشت تھی جو امریکی امپیریئل ازم کے تابع تھی۔ تیل اور گیس کی صنعت اور اصفہان کی اسٹیل مل ریاستی ملکیت تھی بقیہ تمام صنعتی اور تجارتی ادارے، بینک اور بیمہ کمپنیاں نجی ملکیتیں تھیں جن کے مالک امریکہ، برطانیہ، مغربی جرمنی اور جاپان کی بڑی بڑی فرموں سے شرکت میں کاروبار کرتے تھے۔ صنعت و تجارت کے سب سے اہم مرکز تہران، اصفہان، اہواز، خرم شہر، ابادان، تبریز اور کرمان شاہ تھے۔ انقلاب کے دوران میں بالخصوص ستمبر ۱۹۷۸ء اور فروری ۱۹۷۹ء کے درمیان یہ نظامِ معیشت درہم برہم ہو گیا۔ غیر ملکی عناصر اور بیشتر ایرانی سرمایہ دار ملک سے بھاگ گئے، مزدوروں نے ہڑتال کر دی اور صنعتی پیداوار پچاس فی صد سے بھی کم رہ گئی۔ درآمد کا سلسلہ بھی قریب قریب منقطع ہو چکا تھا لہٰذا اشیائے ضرورت کی ملک میں بالخصوص شہروں میں بڑی قلت

تھی۔ اس کی وجہ سے مہنگائی اور چور بازاری بہت بڑھ گئی تھی اور بیروزگاروں کی تعداد تیس لاکھ سے بھی تجاوز کر گئی تھی۔

خمینی صاحب اور ان کے رفقا نے جس وقت اقتدار سنبھالا تو وہ ملک کے اقتصادی مسائل کی سنگینی سے ہرگز بے خبر نہ تھے۔ ان کے ذہن میں اقتصادی بحالی کا کوئی نہ کوئی خاکہ یا منصوبہ ضرور رہا ہوگا۔ (ابوالحسن بنی صدر جو ان دنوں خمینی صاحب کے مشیر اقتصادیات ہیں، پیرس کے دورانِ قیام میں ان کے ہم رکاب تھے) لیکن اقتصادی منصوبہ بناتے وقت زندگی کی حقیقتوں کو سامنے رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ ملک کی اقتصادی تنظیم کن اصولوں اور کن خطوط پر کی جائے اور کن لوگوں کے مفاد کو نظر کے سامنے رکھا جائے۔ اگر عوام کی خوشحالی اور ترقی منظور ہے تو منصوبے کی نوعیت کچھ اور ہوگی اور اگر سرمایہ داروں یا جاگیرداروں کے مفاد کا تحفظ مقصود ہے تو منصوبے کی نوعیت دوسری ہوگی۔ اسی طرح اگر منصوبے کا نظم و نسق اور اس کی تکمیل کی ذمے داریاں عوام کے نمائندوں کے سپرد کی جائیں تو منصوبہ سازوں کا زاویۂ نظر کچھ اور ہوگا اور اگر یہ فرائض بڑے بڑے سرکاری افسروں اور بالائی طبقوں کے حوالے کر دیے جائیں تو صورتِ حال کچھ اور ہوگی اور نتائج بھی مختلف ہوں گے۔

انقلاب کے آخری دنوں میں جب بڑے بڑے سرمایہ دار اور دوسرے شاہ پرست عناصر ملک چھوڑ کر بھاگنے لگے تھے تو فیکٹریوں، ملوں اور تجارتی اداروں میں کام کرنے والوں نے ہر جگہ اپنی کمیٹیاں بنا لی تھیں اور سارا انتظام خود سنبھال لیا تھا کہ پیداوار کا سلسلہ بالکل ٹوٹ نہ جائے۔ یہ کمیٹیاں خود رو تھیں اور حُبّ الوطنی کے جذبے کے تحت وجود میں آئی تھیں نہ کہ ذاتی منفعت کے خیال سے۔ ان کمیٹیوں نے یہ بھی ثابت کر دیا تھا کہ صنعت گاہوں کا پیداواری عمل سرمایہ داروں کے بغیر بھی جاری رہ سکتا ہے۔ (ناظرین کو شاید یہ یاد ہو کہ ۱۹۷۱ء۔ ۱۹۷۲ء میں لاہور اور کراچی کی متعدد ملوں میں مزدوروں نے اسی قسم کے کامیاب تجربے کیے تھے) حتیٰ کہ تیل کی صنعت کے مختلف شعبوں میں بھی اسی قسم کی کمیٹیاں بن گئی تھیں اور انھوں نے غیر ملکی انجینئروں اور مستریوں کے چلے جانے کے باوجود ملکی ضرورتوں کو پورا کرنے کی غرض سے تیل کی پیداوار جاری رکھی تھی۔ انقلابی عہد کا یہ انقلابی تجربہ اقتصادی بحالی کے حق میں بہت سود مند

ہوسکتا تھا اور معاشرے کی تعمیرِ نو میں عوامی شرکت کے احساس کو اس سے بڑی تقویت مل سکتی تھی مگر ایران کے نئے حاکموں کو مزدوروں کی یہ 'خودسری اور خود مختاری' پسند نہیں آئی۔ ان کو یہ اندیشہ تھا کہ مزدوروں کو اگر فیکٹریوں، ملوں اور کارخانوں کے نظم ونسق میں شرکت کی اجازت دے دی گئی تو کل کو یہی لوگ کہیں حکومت میں اپنا حصّہ نہ مانگنے لگیں لہٰذا پرانے مالکوں کو جو انقلاب کے ڈر سے گھروں میں چھپ گئے یا ملک سے باہر چلے گئے تھے دعوت دی گئی کہ آؤ اور اپنا کاروبار سنبھالو۔ انقلاب کا پیچھے کی طرف یہ پہلا قدم تھا۔ اس صورتِ حال کی بہت اچھی تصویر ہفت روزہ 'تہران مصور' کے نمائندے نے کھینچی ہے جو تبریز کی ایک ماچس فیکٹری دیکھنے گیا تھا۔ اس فیکٹری کو ان دنوں مزدوروں کی کمیٹی چلا رہی تھی۔ رپورٹ کا عنوان ہے 'کارگراں، کارخانہ رالمّی کنید'

'اس کارخانے کو ایک مجلسِ شوریٰ چلاتی ہے جس کو جملہ کاریگروں نے منتخب کیا ہے۔ انھوں نے سرمایہ داروں کو نکال باہر کیا ہے۔ مجلسِ شوریٰ کا ایک سن رسیدہ رکن مجھ کو کارخانے کے اندر لے گیا جہاں ہر طرف مشینیں شور مچارہی تھیں اور مزدور کاموں میں مصروف تھے۔ ایک میز کے پاس پہنچ کر وہ رک گیا اور آس پاس کام کرنے والوں سے مخاطب ہوکر بولا کہ آؤ اور ان صاحب کو بتاؤ کہ ہم پر کیا کیا ظلم ہوئے ہیں اور انقلاب کے دوران میں ہم نے کیا کیا سختیاں جھیلی ہیں اور دشمنوں سے کس کس طرح مقابلہ کیا ہے۔ بہت سے مزدور میرے گرد جمع ہوگئے اور سب کی یہی کوشش تھی کہ پہلے میری بات سنی جائے۔ ایک بولا ''مجھ کو پندرہ سو پندرہ تومان ملتے ہیں لیکن بیوی بچے بھوکے رہتے ہیں۔'' دوسرے نے کہا ''آپ لکھیں کہ مجھ کو کئی بار مارا پیٹا گیا تھا۔'' تیسرے نے کہا ''یہ دیکھئے میرے جسم پر ساواک کی اذیتوں کے نشان۔'' چھوٹے قد کا ایک مزدور ہاتھ میں قرآن اٹھائے مجھ کو بار بار اشارہ کررہا تھا لیکن ہجوم اس کو آگے نہ آنے دیتا تھا۔ میری درخواست پر اس کو راستہ ملا تو وہ بڑھ کر سامنے آیا۔ میں نے پوچھا ''قرآن کیوں اٹھائے ہو؟'' اس نے ہنس کر جواب دیا کہ ''ہمارا مالک ہر وقت

قرآن گلے میں لٹکائے رہتا تھا لیکن کارخانے میں کام کرنے والی عورتوں کی تاک میں رہتا تھا۔'' پھر وہ سنجیدہ ہو کر بولا'' میں بھی قرآن کو مانتا ہوں۔ مگر کون سا قرآن؟ سرمایہ داروں کا قرآن یا کاریگروں کا قرآن؟'' کئی مزدوروں نے مجھ سے کاغذ مانگے اور اپنے حالات لکھ کر میرے حوالے کیے۔

پھر میں نے پوچھا کہ'' تمہاری مجلس شوریٰ کیسے بنی؟'' جواب ملا کہ'' انقلاب کے دوران جب تبریز میں مظاہرے ہونے لگے تو ہم لوگ بھی ان مظاہروں میں شامل ہو گئے۔ اس پر کارخانے کے مالک نے تیلیاں بنانے والے اور مسالہ تیار کرنے والے حصّوں کے درمیان میں دیوار کھچوادی اور پہرہ بٹھا دیا کہ مزدور آپس میں ملنے نہ پائیں لیکن کچھ دنوں کے بعد ہم لوگوں نے دیوار گرادی۔ تب مالک فرار ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شوریٰ خود بخود بن گئی۔ بارہ افراد کی ایک کمیٹی تشکیل دی گئی اور مالک کے بھاڑے کے ٹٹوؤں کو نکال باہر کر دیا گیا۔''

ان لوگوں نے مجھ کو بتایا کہ اس کارخانے کا بال بال مقروض ہے۔ مالک کا اس میں ایک پیسہ نہیں لگا ہے بلکہ وہ بینکوں اور سرکاری اداروں سے ادھار لے کر کارخانے کو چلاتا تھا اور عیش کرتا تھا۔ اب شاید وہ حکومت سے روئے گائے گا کہ میں تو ایران کا سب سے مستضعف انسان ہوں۔

ایک جوان کاریگر نے بتایا کہ'' تبریز میں ماچس کے دو اور کارخانے ہیں'' لیکن ابتدا میں وہاں شوریٰ نہیں بنی تھی۔ جب ہم نے سنا کہ تینوں کارخانوں کے مالک حکومت سے مدد مانگنے تہران گئے ہیں تو ہم لوگوں نے سوچا کہ ماچس کے مزدور بھی کیوں نہ متحد ہو جائیں۔ چنانچہ ہم نے دونوں کارخانوں کے مزدوروں کو بھی شوریٰ تشکیل دینے پر آمادہ کیا اور پھر تینوں کارخانوں کی مشترکہ شوریٰ کا ایک جلسہ آیت اللہ محمد قاضی کی صدارت میں منعقد ہوا جو تبریز میں امام خمینی کی کمیتہ مرکزی انقلاب کے نمائندے ہیں لیکن ابھی تک حکومت نے ہماری

شوریٰ کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ ہم مزدوروں کی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ حکومت کا یہ طرزِ عمل کیوں ہے؟ انقلاب کے زمانے میں ہم مظاہروں میں شریک ہوئے، ہم نے گولیاں کھائیں، ہم کو شکنجوں پر کسا گیا، قید کیا گیا، ہم بھوکے رہے اور کارخانے کے مالک نے ہمارے خون پسینے کی کمائی سے اپنی کوٹھی بنوائی اور اب انقلاب کے بعد حکومت ہم سے کہتی ہے کہ کارخانے کو مالک کے حوالے کر دو۔ ہم قسم کھا کر کہتے ہیں کہ شوریٰ کی تشکیل کے بعد کارخانے کی حالت بہتر ہوگئی ہے۔ پیداوار بڑھ گئی ہے۔ ہم نے وزارتِ محنت سے درخواست کی ہے کہ کارکردگی کی اجرت میں اضافے کی اجازت دی جائے لیکن وزارت اب تک خاموش ہے حالانکہ ہم فقط ۳۵ تومان یومیہ کا اضافہ چاہتے ہیں۔ آپ مالک کے نفع کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ ۵۵۰ ڈبیوں پر لاگت فقط ۳۵ تومان آتی تھی اور وہ ان ڈبیوں کو ۱۴۵۰ تومان میں فروخت کرتا تھا۔

میں نے پوچھا ''آپ لوگ حکومت سے کیا چاہتے ہیں۔'' جواب میں کئی مزدور ایک ساتھ بول اٹھے کہ ''حکومت کارخانوں کو ملی بنادے اور مزدوروں کی مجلس شوریٰ کو تسلیم کرلے۔'' ایک مزدور نے کہا کہ ''حکومت کو چاہیے کہ جو کارخانے بند پڑے ہیں ان کو بیروزگار کاریگروں کے سپرد کردے تاکہ بیروزگاروں کو کام مل جائے اور پیداوار بھی شروع ہوجائے۔ ہم کو سرمایہ دار کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم کارخانوں کو ٹھیک ٹھیک چلانے کی قدرت رکھتے ہیں۔''

ایک پیر مرد نے کہا کہ ''ماچس فیکٹریوں کی متحدہ کمیتیہ کے ایک رکن نے ایک روز مجھ سے کہا کہ آؤ کوشش کریں کہ شہر کے ۲۱ دوسرے کارخانوں کے مزدور بھی ایک پرچم تلے جمع ہوجائیں۔ میں نے اس مقصد سے ایک پرچہ تیار کیا اور تمام شرعی اور قانونی مرکزوں سے اجازت حاصل کرلی۔ اس کے بعد طے پایا کہ ہم لوگ کام کا آغاز باغِ گلستان سے کریں اور باغِ شمال تک جائیں لیکن

ہم نے ابھی آدھا راستہ طے کیا تھا کہ مزدوروں کے بدخواہوں نے جو اسلام کا سوانگ بھرے ہوئے تھے ہم پر حملہ کر دیا۔ اس وقت دانش گاہ کے لڑکے اور باغ شمال کے کیمونسٹ ہماری مدد کو آ گئے مگر اسی اثنا میں باغ شمال کے مسلح سپاہی (چماق دار) آن دھمکے۔ انہوں نے مجمعے پر لاٹھیاں برسانی شروع کر دیں حتیٰ کہ مزدور عورتیں بھی ان کی زد سے نہ بچیں۔ دیواروں پر جو پوسٹر لگے ہوئے تھے انہوں نے ان کو نوچ کر پھینک دیا مگر میرا ایمان ہے کہ حق ہم زحمت کشوں کے ساتھ ہے اور بالآخر فتح ہماری ہوگی۔ میری اب بھی یہی خواہش ہے کہ سب مزدوروں کو متحد کروں اور ان کی مجلسِ شوریٰ بناؤں۔ میں بیکاروں کی انجمن میں بھی کام کرتا ہوں اور ہماری یہی خواہش ہے کہ حکومت زحمت کشوں کی پشت پناہی کرے نہ کہ مٹھی بھر سرمایہ داروں کی۔[۱۱]

۱۹۵۳ء میں جب ڈاکٹر مصدق نے تیل کی صنعت کو قومی ملکیت قرار دیا تھا تو مغربی دنیا میں تہلکہ مچ گیا تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا گویا سرمایہ داری نظام ہی تہ وبالا ہو جائے گا لیکن اس کے بعد مصر، عراق، ہندوستان، پاکستان، ہر جگہ کلیدی صنعتیں اور بینک اور بیمہ کمپنیاں سرکاری تحویل میں لے لی گئیں اور کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ وجہ یہ تھی کہ ریاست کی انتظامیہ پر اگر بالائی طبقوں کا تسلط بدستور باقی رہے اور قومی ملکیت کا نظم ونسق افسر شاہی کے سپرد ہو تو پیداواری رشتوں میں کوئی تبدیلی نہیں آتی اور نہ سرمایہ داری نظام کو کوئی خطرہ لاحق ہوتا ہے مثلاً انگریزوں کے زمانے میں ریلوے 'قومی' ملکیت تھی لیکن ریلوے مزدوروں کی حالت اتنی ہی خراب تھی جتنی نجی اداروں میں کام کرنے والوں کی۔ البتہ قومی ملکیتیں اگر محنت کاروں کی نگرانی میں چلائی جائیں اور ان کی آمدنی سے محنت کاروں کو فائدہ پہنچے تو قومی ملکیت کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ چنانچہ تبریز کے مزدوروں نے جب یہ مطالبہ کیا کہ کارخانوں کو قومی ملکیت بنا دیا جائے تو ان کی منشا یہی تھی کہ زمامِ کار مزدوروں کے چنے ہوئے نمائندوں کے حوالے کی جائے نہ کہ سرکاری افسروں کے جو عموماً اناڑی اور نااہل ہوتے ہیں اور ان کا طرزِ عمل نجی سرمایہ داروں سے بھی برا ہوتا ہے۔

حکومتِ ایران نے ۸ جون ۱۹۷۹ء کو بینکوں اور بیمہ کمپنیوں کو اور ۵ جولائی کو کلیدی صنعتوں کو جن میں معدنیات، موٹر کار اور جہاز سازی کی صنعتیں بھی شامل تھیں اپنی تحویل میں لے لیا۔ ڈاکٹر مہدی بازارگان بینکوں کو قومی ملکیت بنانے کے حق میں نہ تھے لیکن اسلامی انقلابی کونسل نے ابوالحسن بنی صدر کا مشورہ قبول کرلیا اور مہدی بازارگان کو اس پر عمل کرنا پڑا۔

ایران میں اس وقت کل ۳۷ بینک کاروبار کرتے تھے ان میں ۲۵ عام تجارتی بینک تھے اور بارہ ترقیاتی بینک۔ سب سے بڑا سرکاری بینک ملی بینک تھا۔ ملک کا ایک تہائی ڈپازٹ اسی کے پاس تھا اور اس کے اثاثے کی مالیت ۱۷ ارب ڈالر تھی۔ بینک سپاہ فوجیوں کے پنشن فنڈ سے چلتا تھا۔ بینک صادرات نجی بینکوں میں سب سے بڑا تھا۔ بینکوں کے مجموعی اثاثے میں ان تینوں بینکوں کا حصہ ۵۳ فی صد تھا۔ اخبار 'فائننشل ٹائمز' (۹ جون) کے بیان کے مطابق تقریباً پچاس فی صد بینکوں کی مالی حالت بہت خستہ تھی بلکہ تین چار کا تو دیوالہ نکلنے والا تھا۔ نجی بینکوں میں متعدد ایسے تھے جن میں امریکی اور برطانوی بینکوں کے ۴۰ فی صد تک حصص تھے مثلاً فارین ٹریڈ بینک آف ایران میں ۴۰ فی صد بینک آف امریکہ کا تھا۔ اسی طرح بینک آف ایران اینڈ دی مڈل ایسٹ میں برٹش بینک آف دی مڈل ایسٹ کا ۳۵ فی صد حصہ تھا۔ ایرانو برٹش بینک میں چارٹرڈ اور سٹینڈرڈ کا ۳۵ فی صد حصہ تھا۔ بینکوں کو قومی تحویل میں لیتے وقت مہدی بازارگان نے اپنی نشری تقریر میں کہا کہ 'ہم ذاتی ملکیت کا احترام کرتے ہیں لیکن بینکوں کے غیر نفع بخش حالات کے پیشِ نظر اور معیشت کی گاڑی کے پہیے کو حرکت میں رکھنے کی خاطر بینکوں کو قومی ملکیت میں لینا ضروری ہوگیا تھا۔' گویا بینکوں کو قومی تحویل میں لینے کا مقصد مروجہ مالیاتی نظام کو بدلنا نہیں تھا بلکہ اس کو مستحکم کرنا تھا۔

صنعتی اداروں کو قومی ملکیت بنانے سے شاہ پسند سرمایہ داروں پر بڑی کاری ضرب لگی ہے۔ کم از کم ۵۱ بڑے بڑے صنعت کار خاندان متاثر ہوئے ہیں۔ ان میں فرمان فرمائیاں، علامہ ہدایت، خیامی برادران، اراونی اور ملک کے سب سے بڑے صنعت کار احمد لاجوردی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ جو صنعتیں قومی تحویل میں لی گئی ہیں، ان میں موٹر کار بنانے والی فیکٹریاں، فولاد اور دوسری دھاتوں کے کارخانے، بھاری انجینئرنگ فرمیں، تیل اور پٹرو کیمیکل

کے صنعتی کار خانے اور تعمیراتی سامانوں کے بڑے بڑے کارخانے، بیشتر تعمیراتی کمپنیاں اور ضرورت کی چیزیں تیار کرنے والی بڑی کمپنیاں شامل ہیں۔ ان میں سرکاری اندازے کے مطابق پچاس کروڑ پاؤنڈ کا سرمایہ لگا تھا جو زیادہ تر سرکاری یا نجی بینکوں سے ادھار لیا گیا تھا۔ بیشتر صنعتی اداروں میں چونکہ غیر ملکی سرمایہ کاروں کی شرکت تھی لہٰذا ان کے مفاد پر بھی چوٹ لگی ہے مثلاً ایرانی صنعت کار ثابت کے غیر ملکیوں کے ساتھ ۲۱ مشترکہ کار خانے تھے اور بوشہر گروپ ۷۴ کارخانے غیر ملکیوں کی شرکت سے چلاتا تھا۔ موٹر ساز کمپنی ایران نیشنل میں جو احمد خیامی کی ملکیت تھی، امریکیوں اور انگریزوں کا حصہ تھا جس سے فقط برطانوی حصہ داروں کو ۱۴ کروڑ پاؤنڈ سالانہ آمدنی ہوتی تھی۔ اب لوٹ کے یہ سب ذرائع بند ہو گئے ہیں۔

صنعتی یا تجارتی اداروں کو قومی ملکیت بنا لینا چنداں دشوار نہیں ہوتا البتہ ان کو خوش اسلوبی سے چلانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ نجی صنعت کاروں میں لاکھ عیب سہی مگر وہ اپنے کاروبار کے گر ضرور جانتے ہیں۔ سرمایہ کہاں سے آئے، کچا مال کب اور کہاں سے خریدا جائے، مزدوروں سے کیسے نمٹا جائے، اور مال کی نفع بخش نکاسی کے لیے کیا تدابیر اختیار کی جائیں، وہ ان سب مسائل سے بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ صنعتی اور تجارتی اداروں کو قومی ملکیت بنانے کے بعد حکومت کے سامنے دو راستے رہ جاتے ہیں، ادارے کا نظم و نسق کارکنوں کو سونپ دیا جائے یا صنعت کاروں کی جگہ سرکاری افسروں کو لا بٹھایا جائے۔ ایرانی حکومت نے مقامی کارکنوں پر سرکاری افسروں کو ترجیح دی ہے اور اب کوشش کی جارہی ہے کہ مزدوروں کی کمیٹیاں بھی ٹوٹ جائیں یا بالکل بے اثر ہو جائیں۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ نہ صنعتی پیداوار بڑھی ہے اور نہ بے روزگاری اور مہنگائی میں کمی آئی ہے بلکہ پیداوار نہ بڑھنے کی وجہ سے افراطِ زر میں زبردست اضافہ ہوا ہے مثلاً ۱۹۷۸ء میں بیس (۲۰) ارب ریال کے کرنسی نوٹ گردش میں تھے اور اب ۱۹۰۰ ارب ریال کے نوٹ گردش کر رہے ہیں۔

تعلیم یافتہ بے روزگاروں کا مسئلہ بھی تشویش ناک صورت اختیار کرتا جارہا ہے۔ جگہ جگہ 'انجمنِ بیکاراں' بن گئی ہے اور ہر چند کہ غیر منظور شدہ مظاہروں کی ممانعت ہے، بیروزگاروں کے مظاہرے بدستور جاری ہیں۔ چنانچہ اکتوبر میں دو مظاہرے تہران میں وزیرِ اعظم کے دفتر کے

سامنے ہوئے۔ ایک مظاہرے کو تو پاسدارانِ انقلاب نے باقاعدہ گولی چلا کر منتشر کیا۔ تہران کے علاوہ اصفہان، انزلی، رشت اور دوسرے مقامات سے بھی بے روزگاروں کے مظاہروں کی خبریں آ رہی ہیں۔ اس کے علاوہ گریجویٹ اسٹاف اور عورتوں کی دفتروں اور فیکٹریوں سے بڑے پیمانے پر چھانٹی ہو رہی ہے۔ لہٰذا ۲۵ لاکھ بے روزگاروں کی فوج میں کمی کے بجائے اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

مہدی بازارگان اور ابو الحسن بنی صدر کے درمیان اختلافات کی وجہ سے مسائل اور پیچیدہ ہو گئے ہیں۔ ابو الحسن بنی صدر نے حال ہی میں یزد کے ایک جلسۂ عام میں مہدی بازارگان پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ ’ان کی حکومت کے پاس کوئی منصوبہ نہیں ہے۔ ان کو یہ بھی نہیں معلوم کہ مجھ کو کیا کرنا ہے۔ وہ تو بس تجربے کیے جا رہے ہیں۔‘[۲] مگر مہدی بازارگان پر یہ الزام درست نہیں کہ ان کی حکومت کے پاس کوئی منصوبہ نہیں ہے یا وہ ملک میں نظم وضبط قائم کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ خمینی صاحب جس حکمت عملی پر کاربند ہیں اس کی موجودگی میں نظم وضبط قائم نہیں ہو سکتا اور نہ ملک کی تعمیرِ نو کا کوئی منصوبہ بن سکتا ہے۔ مہدی بازارگان کے پاس منصوبہ تو ہے اور یہ وہی منصوبہ ہے جس کو خمینی صاحب اور ان کے رفقا نے تیار کیا تھا لیکن یہ منصوبہ جمہوری عناصر کو کچلنے کا ہے۔ لوگوں کو اسلام کے نام پر شہری آزادی سے محروم کرنے کا ہے۔ ملک میں مذہبی آمریت قائم کرنے کا ہے۔ اس منصوبے میں اقتصادی بحالی کی گنجائش کہاں ہے۔

اس اثنا میں اقتصادی حالات روز بروز بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں مگر خمینی صاحب ’طاغوتیوں‘ کو کیفرِ کردار تک پہنچانے اور قوم کا اخلاق درست کرنے میں اس درجہ مصروف ہیں کہ ان کو ملک کے بنیادی مسائل کی طرف توجہ دینے کی فرصت ہی نہیں ملتی اور نہ وہ ان مسائل کو اہمیت دیتے ہیں۔ کیونکہ ’سستی روٹی اور سستے تربوزوں‘ کا مطالبہ ان کے نزدیک انقلاب دشمنوں کا مطالبہ ہے، شاہ پسندوں کی شرارت ہے، کمیونسٹوں کی سازش ہے۔ ایران کے اقتصادی مسائل، سیاسی مسائل کو حل کیے بغیر کبھی حل نہ ہو سکیں گے۔ کوئی غیر نمائندہ اور غیر جمہوری حکومت طاقت کے زور سے یا اسلام اسلام کی رٹ لگا کر ان مسائل پر قابو نہیں پا سکتی۔

خمینی کی خارجہ حکمتِ عملی

ایرانی انقلاب دراصل سامراج دشمن انقلاب تھا۔ ایرانی محبانِ وطن کی نظر میں رضا شاہ جبر و استبداد ہی کا مرکز نہ تھا بلکہ ایران پر امریکی غلبے کی علامت بھی تھا۔ اس نے ملک کو امریکہ کی نوآبادی میں تبدیل کر دیا تھا۔ چنانچہ شاہ کے معزولی کے بعد نئی حکومت نے جو خارجہ حکمتِ عملی اختیار کی وہ شاہ کی خارجہ پالیسی کی عین ضد تھی۔ شاہ علانیہ امریکہ سے وابستگی کا دم بھرتا تھا۔ بازارگان کی حکومت نے اعلان کیا کہ ایران کا آئندہ مسلک 'غیر جانب داری اور عدم وابستگی' ہوگا۔ شاہ کو گھمنڈ تھا کہ ایران، خلیج فارس اور مشرقِ وسطیٰ میں پولیس مین کا کردار ادا کرتا ہے۔ ڈاکٹر سنجابی وزیرِ خارجہ نے کہا کہ ایران کو پولیس مین بننے کی کوئی آرزو نہیں ہے اور وہ اس دعوے سے دست بردار ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ ایران سینٹو اور آر۔سی۔ڈی سے بھی، جو سامراجی تنظیمیں تھیں علیحدہ ہوگیا۔ امریکہ کے فوجی اڈے توڑ دیئے گئے اور ۴۵ ہزار فوجی مشیروں کو واپس بھیج دیا گیا۔ ایران نے اسرائیل اور جنوبی افریقہ سے ناتا توڑ لیا، ان ملکوں کو تیل کی سپلائی بند کردی اور فلسطین کے محاذِ آزادی کو تسلیم کرلیا۔ چنانچہ انقلاب کے بعد یاسر عرفات پہلی بین الاقوامی شخصیت تھے جو تہران گئے اور تہران کا اسرائیل ہاؤس پی۔ایل۔او کے حوالے کردیا گیا۔ ایران نے عدم وابستہ ملکوں کی عالمی تنظیم میں رکنیت کی درخواست بھی دے دی۔

ایرانی اقتصادیات پر غیر ملکی کمپنیوں کا تسلط بھی ختم ہوگیا۔ تیل کا کنسورشیئم توڑ دیا گیا اور تیل کا سارا کاروبار نیشنل آئل کمپنی کے حوالے کردیا گیا۔ امریکہ، برطانیہ اور مغربی جرمنی کی کمپنیوں کو شاہ کے دور میں اربوں کے جو ٹھیکے ملے تھے، وہ بھی منسوخ ہوگئے۔

خارجہ پالیسی کی یہ ابتدا بڑی حوصلہ افزا تھی لیکن چند ماہ بعد جب ان منفی اقدامات کے بعد مثبت خارجہ حکمتِ عملی وضع کرنے کا وقت آیا تو انقلاب کے داخلی تضادات ابھر کر سامنے آنے لگے۔ جمہوریت دشمنی کی منطق سامراجی قوتوں کی جانب جھکنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ چنانچہ ایران میں یہی ہوا۔ ایرانی انقلاب جوں جوں جمہوری آدرشوں سے ہٹتا گیا، دائیں بازو کے قدم جوں جوں جمتے گئے، حکومت کا سامراج دشمن مزاج بھی بدلتا گیا۔ ڈاکٹر سنجابی کا استعفےٰ اور

ابراہیم یزدی کا ان کی جگہ وزیرِ خارجہ مقرر ہونا، خارجہ پالیسی میں تبدیلی کی کھلی نشانی تھی۔ ابراہیم یزدی امریکہ کے آوردہ پروردہ ہیں۔ وہ اٹھارہ سال امریکہ میں رہے ہیں۔ ان کے پاس وزیر ہونے سے پہلے تک امریکی شہرت بھی تھی اور ان کی بیوی امریکی ہیں مگر ابراہیم یزدی پر کیا منحصر ہے، ایران کا پورا حکمران طبقہ مغربی طاقتوں سے سمجھوتہ کرنے کے لیے بے چین ہے اور مغربی طاقتیں بالخصوص امریکہ بڑی ہوشیاری سے ایران کی جانب قدم قدم بڑھ رہی ہیں۔ امریکہ نے ایران کو پانچ کروڑ ڈالر کا جلانے کا تیل فروخت کیا ہے تاکہ 'ایرانی عوام کو سردیوں میں تکلیف نہ ہو' امریکہ سے گیہوں کی درآمد بھی ہو رہی ہے۔ تازہ ترین اطلاع یہ ہے کہ ایران کی درخواست پر امریکہ نے تیس کروڑ ڈالر کا فوجی سامان جس کا شاہ کے زمانے کا آرڈر انقلابی حکومت نے منسوخ کر دیا تھا، ایران بھیجنا شروع کر دیا ہے اور ایران کے پانچ ارب ڈالر کے فوجی اسلحوں کی جو فہرست امریکہ کو پیش کی ہے اس پر غور ہو رہا ہے (۶/اکتوبر) ابراہیم یزدی نیویارک میں امریکی وزیر خارجہ سے مل چکے ہیں، امریکہ نے ان کو یقین دلایا ہے کہ وہ شاہ کو اپنے ملک میں پناہ نہیں دے گا۔ وہی امریکہ جو ۱۹۷۸ء میں شاہ سے کہتا تھا کہ:

> 'ایران آپ کی عظیم رہنمائی میں دنیا کے انتہائی متلاطم علاقے میں استحکام کا جزیرہ ہے۔ یہ آپ کی ذات کے لیے، آپ کی قیادت کے لیے اور جو احترام، عزت اور محبت آپ کی رعایا کو آپ سے ہے اس کے لیے بڑا خراجِ تحسین ہے۔'

اب خمینی صاحب کی حکومت کے تحفظ کے لیے کوشاں ہے۔ چنانچہ امریکی وزارت خارجہ کے ترجمان ٹام رسٹن کا ارشاد ہے کہ:

> 'ہمارا ایقان ہے کہ اس علاقے کے استحکام اور ایران میں سول نظم و نسق کے تحفظ کے لیے بازرگان حکومت کے اختیار اور اثر پذیری کو تقویت دی جائے۔'[۲۶]

حکومتِ ایران کے اختیار اور اثر پذیری کو تقویت پہنچانے کی غرض سے امریکہ ایران کو اسلحہ جات فراہم کر رہا ہے اور اب تہران سے خبر آئی ہے کہ حکومت بہت غور و خوض کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ غیر ملکی فوجی مشیروں کو واپس لانا ضروری ہو گیا ہے (۵/اکتوبر) غرضیکہ مغرب

کو گالیاں بھی دی جا رہی ہیں اور مغرب کے اثر و رسوخ میں اضافہ بھی کیا جا رہا ہے۔ شاہ کو سزائے موت کا مژدہ بھی سنایا جا رہا ہے اور شاہ کی خارجہ پالیسی کی تقلید بھی شروع ہو گئی ہے۔

اس ضمن میں نئے وزیر دفاع مصطفیٰ کامران کا یہ بیان بہت معنی خیز ہے کہ حکومت نے فوج کی مکمل تطہیر کا عزم کر لیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس 'تطہیر' کی ضرورت کردستان کی مہم کے بعد کیوں پیش آئی؟ اس لیے کہ کردستان کی مہم کے وقت حکومت پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ انقلابی جدو جہد کے باعث فوجیوں کی نفسیات اور سیاسی سوجھ بوجھ میں بھی بڑی انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ اگر ایک طرف فوج کے اعلیٰ افسر حکومت کے ہر جائز ناجائز احکام کی تعمیل سے گریز کرتے ہیں تو عام لشکری بھی اب بھاڑے کے ٹٹو بننے کے لیے تیار نہیں۔ چنانچہ اگست میں مہدی بازارگان نے اپنی نشری تقریر میں اس بات کی شکایت کی کہ 'فوج میں نظم وضبط گھٹتا جا رہا ہے، فوجی چھاؤنیوں میں ''کمیٹیاں'' بن گئی ہیں اور عام سپاہی اور جونیئر افسر اعلیٰ افسروں کے احکام بجالانے کے بجائے ان سے بحثیں کرتے ہیں بلکہ بعض اوقات ان کا حکم ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔' فوجیوں کے اس طرز عمل کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان میں یہ احساس روز بروز بڑھتا جا رہا ہے کہ ہمارا بنیادی فریضہ وطن کی سرحدوں کی حفاظت کرنا ہے، ابنائے وطن پر گولی چلانا نہیں ہے۔ اس جذبے کا عملی اظہار کردستان کی مہم کے دوران میں ہوا جب کئی موقعوں پر سپاہیوں نے کردوں پر گولی چلانے سے انکار کر دیا۔ لہٰذا دو درجن سے زائد جونیئر افسروں کو حکم عدولی کی پاداش میں گولی مار دی گئی اور متعدد فوجی افسر بھاگ کر کردوں سے جا ملے۔ کردوں کی چھاپہ مار فوج 'پیش مرگاں' میں شامل ہونے والے افسروں میں کئی کرنل اور میجر بھی ہیں مثلاً کرنل اسماعیل علی یار جو ان چند افسروں میں تھے جو فروری انقلاب کے موقع پر آیت اللہ خمینی کی فوجی کمیٹی میں شریک ہو گئے تھے۔ کرنل علی یار نے انقلاب کی خدمت دل و جان سے کی مگر بعد میں انقلاب کی روش نے ان کو بددل کر دیا۔ انہوں نے چیف آف اسٹاف جنرل ناصر فروبد کے مددگار کے عہدے سے استعفےٰ دے دیا اور کرد ڈیموکریٹک پارٹی کے فوجی اسٹاف میں شامل ہو گئے۔ اسی طرح کرنل ربیعی ستمبر میں ایرانی فوج سے نکل کر پیش مرگاں میں مل گئے۔

مختصر یہ کہ فوج کی 'تطہیر' کرنے اور امریکہ سے فوجی مشیر اور اسلحے منگوانے کا اصل مقصد

یہ ہے کہ فوج کو ان عناصر سے 'پاک' کیا جائے جن میں جمہوریت، عوام دوستی یا سوشلزم کے 'جراثیم' سرایت کر گئے ہوں اور ایک ایسی فوج تیار کی جائے کہ جو عوامی تحریکیں سر اٹھائیں تو ان کو بے چون وچرا کچل دے۔

خمینی حکومت کی خارجہ پالیسی سے ایران کا کوئی ہمسایہ ملک خوش نہیں ہے کیونکہ خمینی صاحب اور ان کے رفقا سب سے دشمنی مول لینے پر تلے ہوئے ہیں اور دائیں بائیں ہر سمت حملے کر رہے ہیں مثلاً سوویت یونین پر اعلانیہ الزام لگایا جا رہا ہے کہ وہ کُردوں کی مدد کر رہا ہے۔ حالانکہ دنیا کی بڑی طاقتوں میں سوویت یونین واحد ملک ہے جس نے انقلاب کے دوران میں کبھی نہ شاہ سے ہمدردی کی اور نہ اس کی حمایت کی۔ جب کہ امریکہ، برطانیہ، مغربی جرمنی حتیٰ کہ چین سب شاہ کی ظالمانہ کارروائیوں کو سراہتے رہے۔ چین کے نائب وزیر خارجہ نے تو تہران میں یہاں تک کہہ دیا کہ شاہ کے خلاف تحریک مٹھی بھر شر پسندوں کی سازش ہے۔

ایرانی حکومت کی حالیہ سوویت دشمنی دراصل شاہ کی روایت ہے جس کو دوبارہ زندہ کیا جا رہا ہے تاکہ بائیں بازو کو روس کا ایجنٹ اور غدار کہہ کر دبانے میں آسانی ہو اور مغربی طاقتوں سے ساز باز کے لیے موزوں فضا پیدا کی جاسکے کیونکہ انقلاب کے دوران میں ایران کی برہمی اور نفرت کا نشانہ مغربی طاقتیں تھیں نہ کہ سوویت یونین۔

خمینی صاحب اپنے پُرامن ہمسایہ افغانستان کے اندرونی معاملات میں بھی کھلم کھلا مداخلت کر رہے ہیں۔ وہ بین الاقوامی سفارتی آداب کا بھی لحاظ نہیں کرتے بلکہ افغانستان کے باشندوں سے کہتے ہیں کہ اپنی حکومت کا تختہ الٹ دو۔ حالانکہ افغانستان نے ایرانی انقلاب کا بڑی گرمجوشی سے خیر مقدم کیا تھا۔

ایران کے سرکاری اخباروں میں افغانستان کے خلاف مستقل پروپیگنڈہ ہو رہا ہے اور آیت اللہ حضرات اپنی اشتعال انگیز تقریروں میں افغانوں کو بغاوت کی تلقین کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ ایران کے وزیرِ خارجہ بھی اقوام متحدہ کے بھرے اجلاس میں افغانستان پر کڑی نکتہ چینی کرتے ہیں۔ خمینی صاحب کی حکومت سوویت یونین یا افغانستان کا ایک بال بھی بیکا نہیں کر سکتی البتہ دوستوں کو بلا وجہ دشمن بنا کر وہ اپنے راستے میں خود کانٹے بو رہی ہے۔

اسی طرح خمینی صاحب نے ہمسایہ عرب ریاستوں کی طرف جو طرزِ عمل اختیار کیا ہے وہ بھی ایران کے حق میں نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے۔ ایک طرف مہدی بازار گان اور ابراہیم یزدی بار بار اعلان کررہے ہیں کہ ایرانی انقلاب ایکسپورٹ کا مال نہیں ہے اور نہ ایران کسی عرب علاقے پر قبضہ کرنے کی فکر میں ہے مگر دوسری طرف بحرین کی بازیابی کی مہم بھی جاری ہے اور عراق اور خلیج کی امارتوں میں مذہبی فرقہ واریت کو ہوا دینے کی کوشش ہورہی ہے۔ اس بنیاد پر کہ عراق اور بحرین میں شیعوں کی اکثریت ہے اور کویت میں بھی شیعوں کی کافی تعداد موجود ہے اور اس خیال سے بھی کہ قاچاری اور پہلوی دور میں جن ایرانیوں نے بھاگ کر ابوظہبی، دبئی اور دوسری امارتوں میں پناہ لی تھی ان کی وفاداریاں ایران سے بدستور قائم ہیں۔

اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے خمینی صاحب اور ان کے رفقا نے گزشتہ جون میں اپنی ریشہ دوانیاں شروع کیں۔ خلخالی صاحب خلیج کے دورے پر بھیجے گئے۔ انھوں نے کویت، بحرین، دبئی، ابوظہبی، قطر، غرضیکہ سبھی عرب امارتوں میں شیعہ باشندوں کے اجتماع سے خطاب کیا اور امارتوں کے شیوخ سے اجازت لیے بغیر جگہ جگہ حزب اللہ کے دفتر بھی کھول دیے اور خمینی صاحب کے نمائندے مقرر کردیے۔ البتہ خمینی صاحب کی توجہ کے خاص مرکز بحرین اور کویت ہیں۔ بحرین دو سو مربع میل کا چھوٹا سا جزیرہ ہے جو ساحلِ عرب سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ ۱۸۶۱ء میں جب برطانیہ نے اس جزیرے پر قبضہ کیا تھا تو بحرین مچھیروں کی چھوٹی سی بستی تھی۔ کاروبار اگر کوئی تھا تو موتیوں کا۔ البتہ ۱۹۳۲ء میں تیل دریافت ہوا تو بحرین کی اہمیت بہت بڑھ گئی۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں انگریزوں نے بحرین کو اپنے ہوائی بیڑے کا مرکز بنا دیا مگر ۱۹۶۱ء میں برطانیہ نے بحرین کو ایک مقامی شیخ کے حوالے کردیا اور تب ایران کی طرف سے بحرین کی بازیابی کا مطالبہ ہونے لگا مگر ۱۹۷۰ء میں جس وقت شاہ نے خلیج فارس اور مشرق وسطیٰ کا 'پولیس مین' بننے کی ٹھانی تو اس نے عربوں سے مصالحت کی غرض سے بحرین پر ایران کے حق سے دست بردار ہونے کا اعلان کردیا اور بحرین کی خودمختاری تسلیم کرلی۔ شاہ نے عراق کے ساتھ بھی سرحدوں کا تصفیہ کرلیا اور شط العرب کا جھگڑا ختم ہوگیا۔

بحرین کی موجودہ آبادی ڈھائی تین لاکھ سے زیادہ نہیں ہے اور تیل کی روزانہ پیداوار

بھی گھٹ کر فقط پچاس ہزار پیپے یومیہ رہ گئی ہے مگر وہاں صنعتی کارخانے ہیں اور مزدور بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ اس صدی کی پانچویں اور چھٹی دہائی میں وہاں عوام کی نمائندہ ذمے دار حکومت کے حق میں متعدد بار مظاہرے بھی ہو چکے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۷۲ء میں وہاں پہلی بار ایک منتخب شدہ قومی اسمبلی قائم ہوئی تھی لیکن شیخ عیسیٰ ابن سلیمان خلفیہ نے ۱۹۷۵ء میں اسمبلی کو توڑ دیا تو بحرین میں شیخ کی مطلق العنان حکومت کے خلاف بے چینی بڑھنے لگی۔ اسی دوران میں ایران میں انقلاب آ گیا جس سے بحرین کے لوگ بھی بہت متاثر ہوئے۔

جون میں جب شیخ خلخالی بحرین گئے تو انھوں نے ایک شیعہ مولوی محمد العقری کو خمینی صاحب کا نمائندہ مقرر کر دیا اور بحرین کی جمہوری تحریک کو مذہبی فرقہ واریت کا رنگ دینے کی مدبیریں اختیار کیں۔ اس کے بعد آیت اللہ صادق روحانی کی طرف سے بحرین کی بازیابی کا مطالبہ شروع ہو گیا۔ انھوں نے کہا کہ بحرین ایران کا حصّہ ہے اور شاہ ایران نے ۱۹۷۰ء میں اس حق سے دست برداری کا جو اعلان کیا تھا ہم اس کے پابند نہیں ہیں۔ آیت اللہ صادق روحانی اسلامی انقلابی کونسل کے رکن بھی ہیں۔ ان کی ہدایت پر ۱۷راگست کو بارہ شیعہ مولویوں کا ایک وفد شیخ عیسیٰ ابن سلیمان سے ملا اور چند تجاویز پیش کیں۔ صادق روحانی نے کہا کہ 'اگر شیخ نے ان تجاویز پر عمل نہیں کیا تو مذہبی رہنما بحرین کو ایران میں شامل کرنے کی تحریک چلائیں گے۔'

۱۷راگست کو جس دن ایران میں خمینی صاحب کے حکم سے 'یوم فلسطین' منایا گیا تو بحرین کے صدر مقام منامہ میں بھی ایک جلوس نکلا جو بازاروں سے گزرتا ہوا فلسطینی محاذِ آزادی کے دفتر پر ختم ہوا۔ اس جلوس میں سعودی عرب کے خلاف اور ایران کے حق میں نعرے لگائے گئے۔ ۲۲راگست کو محمد العقری کو تہران سے بحرین واپس آنے پر گرفتار کر لیا گیا۔ ان پر یہ الزام تھا کہ انھوں نے تہران ریڈیو سے تقریر میں بحرین کی بازیابی کے مطالبے کی حمایت کی تھی۔ صادق روحانی نے محمد العقری کی گرفتاری کی سخت مذمت کی اور خلیفہ کو ایک تار بھیجا کہ 'اگر تم نے ہمارے مذہبی رہنماؤں کو رہا نہ کیا تو تمھارا بھی وہی حشر ہوگا جو شاہ کا ہوا۔ مذہبی علما کی گرفتاری جن کا تصور یہ ہے کہ انھوں نے تم کو اسلام اور شریعتِ محمدی کی تقلید کی دعوت دی تھی مسلمانوں کے لیے باعث شرم ہے۔

بحرین کے اندرونی معاملات میں مداخلت کا عرب امارتوں میں شدید رد عمل ہوا ہے۔ مثلاً اخبار 'الخلیج' (بحرین) نے لکھا کہ 'صادق روحانی کے بیانات بحرین کے اندرونی امور میں نہایت گستاخانہ مداخلت ہیں۔' اور 'گلف ڈیلی نیوز' نے لکھا کہ 'عرب دنیا نے ایران کی نئی حکومت کو تسلیم کرلیا ہے لہٰذا اس قسم کے غیر ذمے دار بیانات سے ان عناصر کے ہاتھ مضبوط ہوں گے جو اس خطے میں افتراق وانتشار کے آرزو مند ہیں۔' اور کویت کے روزنامہ 'الرائے العام' نے صادق روحانی پر مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے اور ایرانی انقلاب کو بدنام کرنے کا الزام لگایا۔

کویت کے وزیر دفاع شیخ سالم الصباح بھی بحرین پر ایرانی دباؤ سے سخت ناراض ہیں اور انھوں نے اعلان کیا ہے کہ اگر بحرین پر حملہ ہوا تو کویت بحرین کی فوجی مدد کرے گا۔

کویت خلیج فارس کے جنوب مغربی سرے پر ایرانی سرحد کے قریب واقع ہے (رقبہ ۵ ہزار ۸ سو میل۔ آبادی ۵ لاکھ) کویت بہت دولت مند ہے اس لیے کہ دنیا کے تیل کے ذخیرے کا پانچواں حصہ کویت کے پاس ہے لیکن سعودی عرب، بحرین اور ابوظہبی وغیرہ کی مانند کویت کی تیل کی صنعت بھی اینگلو امریکی کمپنیوں کے تصرف میں ہے۔ یہ علاقہ ۱۸۹۷ء سے ۱۹۶۱ء تک برطانیہ کی نگرانی میں تھا۔ اب وہاں مقامی شیخوں کا خاندان برسرِ اقتدار ہے۔

عرب امارتوں میں ہر جگہ مطلق العنان شیوخ اور ان کے خاندان والوں کی حاکمیت قائم ہے۔ وہاں جمہوریت کا دور دور گذر نہیں ہے اور نہ ریاست کے نظم ونسق میں جمہور سے مشورہ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ امارتوں کی اسی کمزوری سے ایران کے مذہبی پیشوا فائدہ اٹھانے کی کوشش کررہے ہیں البتہ لوگوں کے جمہوری حقوق کی حمایت کرنے کے بجائے وہ مذہبی فرقہ واریت پھیلا رہے ہیں۔ ان کی سرگرمیوں کا مقصد عرب امارتوں کو یہ جتانا ہے کہ اگر تم نے خوزستان میں عربوں کی مدد کی تو ہم بھی تمہارے علاقوں میں گڑبڑ پھیلا سکتے ہیں۔

کویت میں ہر چند کہ شیعوں کی اکثریت نہیں ہے لیکن اقلیت کا مذہبی جنون بھی انتشار پھیلانے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ چنانچہ خلخالی صاحب کے دورے کے بعد کویت میں بھی اس فتنے نے سر اٹھایا ہے۔ خلخالی صاحب حجتہ الاسلام سید عباس موہری کو خمینی صاحب کا نمائندہ مقرر کرگئے تھے۔ اس وقت تو کویت نے کوئی اعتراض نہ کیا البتہ جب حجتہ الاسلام صاحب نے

اشتعال انگیز تقریریں شروع کیں تو ان کو مع اہل وعیال تہران واپس بھجوا دیا گیا۔

ان واقعات کے پیشِ نظر مہدی بازارگان کی حکومت یہ کہہ کر بری الذمہ نہیں ہوسکتی کہ آیت اللہ منتظری یا صادق روحانی یا حجتہ الاسلام عباس موہری کی سرگرمیوں سے حکومت کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ درحقیقت ایران کے مذہبی پیشوا جو قدم بھی اٹھاتے ہیں اس میں خمینی صاحب کی مرضی شامل ہوتی ہے۔ دوئمش حکومتِ ایران کا طرزِ عمل بھی پڑوسی ملکوں کے شک وشبہات کو تقویت پہنچارہا ہے۔ مثلاً ستمبر، اکتوبر میں جن دنوں بحرین اور کویت میں مذہبی فرقہ واریت کی وجہ سے فضا مکدر تھی ایرانی بحریہ کے جنگی جہاز بحری مشقوں کے بہانے خلیج فارس میں مسلسل گردش کرتے رہے۔ بحری طاقت کے اس مظاہرے کا مقصد بحرین اور کویت کو مرعوب کرنے کے سوا اور کیا تھا۔

حوالہ جات

۱۔ 'کارگراں، کارخانہ راملی کنید' ہفت روزہ 'تہران مصوّر'، جمعہ اوّل تیر ماہ ۱۳۵۸، شمارہ ۲۲۔
۲۔ اخبار 'خبرونظر' (تہران) ۱۸ر ستمبر۔

3- *Guardian*, 25 August, 1979.

تیرہواں باب

ایرانی انقلاب کدھر؟

ایرانی انقلاب سوشلسٹ انقلاب نہیں تھا کہ محنت کش طبقہ برسر اقتدار آتا اور ریاست کے پرانے ڈھانچے کو توڑ کر نیا ڈھانچہ تیار کرتا، جیسے روسی انقلاب کے بعد ہوا۔ ایرانی انقلاب فرانس کے ۱۸ ر ویں صدی کے انقلاب کی مانند سماجی انقلاب بھی نہ تھا کہ پرانے سماجی رشتے بدل جاتے اور نوابوں جاگیرداروں کی فیوڈل ملوکیت کی جگہ سرمایہ داروں کی بورژوا جمہوریت قائم ہوجاتی۔ ایرانی انقلاب فقط شاہ دشمن اور سامراج دشمن سیاسی انقلاب تھا جس کے رہنماؤں کا مقصد سرمایہ داری نظام کے دائرے میں رہتے ہوئے بالائی طبقے کے نمائندوں کو اقتدار کا مالک بنانا تھا۔ چنانچہ خمینی صاحب نے قائدِ انقلاب کی حیثیت سے جو وزارت پہلے دن تشکیل دی، اسی سے ان کا اصل منشا واضح ہوگیا۔ جبہ ملی، دیموکرات، مجاہدین خلق، فدائین خلق یا حزبِ تودہ کا تو ذکر ہی فضول ہے، اساتذہ، طلبا اور ادیبوں میں سے بھی کسی کو حکومت کے قریب نہیں آنے دیا گیا۔ ابتدا میں جبۂ ملی کے دو تین نمائندوں کو نمائش کے طور پر وزارت میں شریک کرلیا گیا تھا لیکن آخرکار وہ بھی دل برداشتہ ہوکر استعفیٰ دے گئے۔

مہدی بازارگان کی موجودہ وزارت میں جو ۲۸ ستمبر ۱۹۷۹ء کو قائم ہوئی چار افراد بہت

طاقتور ہیں۔ ڈاکٹر ابراہیم یزدی وزیر خارجہ، صادق طباطبائی نائب وزیر اعظم، مصطفےٰ کامران وزیر دفاع، اور صادق قطب زادہ ٹی وی ریڈیو کے سربراہ۔ یہ حضرات 'شامی' گروپ سے تعلق رکھتے ہیں۔ یعنی انقلاب سے پیشتر ان کا رابطہ شام، لبنان اور فلسطین سے تھا۔ یہ لوگ خمینی صاحب کے خاص معتمدین میں سے ہیں۔ اس وزارت کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ مہدی بازار گان کے داماد حسین بنی اسدی انتظامی امور کے وزیر ریاست ہیں اور ٹریننگ اور ریسرچ کے وزیر، یزیداللہ سحابی اور ان کے بیٹے عزت اللہ سحابی دونوں کابینہ کے رکن ہیں۔ عزت اللہ سحابی کو منصوبہ بندی اور بجٹ کا سربراہ مقرر کیا گیا ہے۔

اس وزارت کی نگرانی اسلامی انقلابی کونسل کے سپرد ہے۔ اسلامی کونسل کے تمام ارکان جن کی تعداد ۱۵ر کے قریب ہے آیت اللہ خمینی کے نامزد کردہ ہیں۔ ان کی غالب اکثریت علما کے طبقے سے تعلق رکھتی ہے اور علما بھی وہ جو کسی زمانے میں خمینی صاحب کے شاگرد تھے۔ آقائے شریعت مداری یا ان کے ہم خیال علما کو انقلابی کونسل میں شریک نہیں کیا گیا ہے۔ یہ نام نہاد انقلابی کونسل حکومت کے معاملات میں مسلسل مداخلت کرتی رہتی ہے۔

لیکن سب سے بااختیار اور مقتدر ہستی آیت اللہ خمینی کی ہے جس طرح پہلوی دور میں طاقت کا سرچشمہ رضا شاہ پہلوی کی ذات تھی اسی طرح آج کل طاقت کا مرکز خمینی صاحب ہیں۔ امور ریاست پر ان کا پورا پورا کنٹرول ہے۔ وہ مسلح افواج کے سپہ سالار بھی ہیں اور ریاست کے سربراہ بھی۔ ان کی اجازت کے بغیر نظم ونسق میں کوئی اصلاح یا تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔ وزارت اور اسلامی انقلابی کونسل دونوں ان کے روبرو جواب دہ ہیں لیکن وہ کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہیں۔ مجلسِ خبرگان نے ان کے اس مطلق العنان مرتبے کو آئینی تحفظ دینے کی خاطر مسودہ آئین میں نئی شقیں بڑھادی ہیں۔ چنانچہ دفعہ ۸۴ میں آیت اللہ خمینی کو 'ولایت امر' (جس کی تشریح ہم آگے چل کر کریں گے) کے اختیارات تفویض کردیے گئے ہیں۔ اس دفعہ کی رو سے ان کو جنگ اور صلح کرنے کا اختیار حاصل ہوگا اور وہی ریاست کی تمام کلیدی اسامیوں پر لوگوں کو مقرر اور برطرف کرنے کے مجاز ہوں گے۔ اس کے علاوہ ان کو مجلسِ قانون ساز کے وضع کردہ قوانین وضوابط کو 'ویٹو' کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہوگا۔ روزنامہ 'گارجین' کی نامہ نگار

لز زودؤ کے بقول' اتنے وسیع اختیارات تو شاہ کو بھی حاصل نہ تھے۔'

غرضیکہ ایران ان دنوں ایک نہایت تنگ نظر اور متشدد مذہبی آمریت کی گرفت میں ہے۔ مذہبی طبقے نے بڑی ہوشیاری سے جمہوری تنظیموں کو بے دست وپا کردیا ہے اور ایک سخت گیر اور استبدادی تھیوکریسی قائم کرنے میں کوشاں ہے۔ خمینی صاحب اور ان کے رفقا کی دلیل یہ ہے کہ انقلابی لڑائی چونکہ اسلام کے نام پر لڑی گئی تھی اور عوام اس لڑائی میں اسلام کے نام پر شریک ہوئے تھے لہٰذا ہمارا دینی اور اخلاقی فرض ہے کہ ملک میں باقاعدہ اسلامی نظام قائم کریں۔ اس سلسلے میں اگر لوگوں کے انسانی حقوق یا پارلیمانی جمہوریت کے اصول پامال ہوتے ہیں تو ہم کو اس کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے (اسلامی نظام کے حق میں یہی دلیل ان دنوں وہ پاکستانی حلقے پیش کررہے ہیں جو تحریکِ پاکستان میں شریک نہ تھے بلکہ جنھوں نے تحریکِ پاکستان اور قائداعظم دونوں کی شدت سے مخالفت کی تھی۔) اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایرانی انقلاب کے قائد خمینی صاحب تھے اور انقلاب میں شرکت کرنے والے تمام عناصر نے ان کی قیادت کو خوشی سے تسلیم کرلیا تھا لیکن یہ دعویٰ تاریخی اعتبار سے غلط ہے کہ انقلابی جنگ اسلام کے نام پر لڑی گئی تھی۔ ایرانی انقلاب کو ابھی ایک سال بھی نہیں ہوا ہے اور جن لوگوں نے ۱۹۷۸ء کی جدوجہد کے تذکرے اخباروں میں پڑھے ہوں گے ان کو یاد ہوگا کہ انقلاب کے سبھی مطالبات سیاسی اور اقتصادی تھے۔ ستمبر ۱۹۷۸ء تک تو شاہ کی برطرفی کا نعرہ بھی بلند نہیں ہوا تھا، بلکہ یہ مطالبہ کیا جاتا تھا کہ ۱۹۰۷ء کے آئین پر عمل کیا جائے، شہری آزادی بحال کی جائے، سیاسی قیدیوں کو رہا کیا جائے اور سیاسی پارٹیاں بنانے کی اجازت دی جائے۔ البتہ تہران میں ۸ ستمبر کے قتلِ عام کے بعد شاہ کی برطرفی کا مطالبہ شروع ہوا۔

مگر یہ مسلمہ امر ہے کہ ایران میں عام لوگوں پر بالخصوص شیعوں پر مذہب کا بڑا اثر ہے۔ وہ اپنے مجتہدوں کا بہت احترام کرتے ہیں اور ان کی اکثریت علمائے دین کے کہنے پر انقلابی جدوجہد میں شامل ہوئی تھی۔ ہر چند کہ پہلوی دور میں اسلامی اقدار وتعلیمات پر بہت کم توجہ دی جاتی تھی لیکن شیعہ مذہب کی جڑیں عوام کے دلوں میں بہت گہری تھیں اور علمائے دین کے مشاغلِ زندگی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ لہٰذا مذہبی جذبے کی آبیاری بدستور جاری تھی۔ اس کے

علاوہ مغربی سامراج کے ظلم و جبر اور شاہ پسندوں کے کرتوتوں کے سبب سے بہت سے پڑھے لکھے لوگ بھی مغرب کی ہر شے سے بیزار ہوتے جا رہے تھے اور اپنی ذہنی اور روحانی تسکین کی خاطر مذہب میں پناہ لیتے تھے۔ دانشوروں میں بھی اسلام شناسی کا رجحان ابھرنے لگا تھا۔ وہ اسلام کو مغربی علوم و افکار سے ہم آہنگ کر کے یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ دنیاوی ترقی اسلام کے دائرے میں رہ کر بھی ممکن ہے اور یہ کہ شیعہ مذہب انقلابی مذہب ہے جو شیعوں کو دور حاضر کے یزیدوں کے خلاف جہاد کی دعوت دیتا ہے۔

ایران میں شیعیت کا جو احیا ہوا ہے اس نے سیاسی مبصرین کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ملکی سیاست پر ملاؤں کا غلبہ بالکل اتفاقیہ ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ اس کے اسباب ہم کو شیعہ مذہب کی تاریخ میں تلاش کرنے ہوں گے۔

شیعہ مذہب دراصل احتجاجی مذہب ہے جس کے محرکات سیاسی تھے۔ شیعوں کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ رسول خداؐ مسلمانوں کے روحانی پیشوا بھی تھے اور دنیاوی امور کے سربراہ بھی۔ یعنی آنحضرتؐ کی ذات خلافت اور امامت دونوں کی امین تھی۔ ان کی وفات کے بعد یہ منصب حضرت علیؓ کو ملنا چاہیے تھا مگر ایسا نہیں ہوا اور اسی سے مسلمانوں کے اندر تفریق کی ابتدا ہوئی۔ جن لوگوں کا خیال تھا کہ خلافت کے مستحق حضرت علیؓ تھے وہ شیعیان علیؓ کہلائے۔ یہ نزاع حضرت علیؓ کے بلآخر خلیفہ ہونے پر بھی ختم نہیں ہوئی بلکہ امام حسینؓ کی شہادت کے بعد مستقل صورت اختیار کر گئی اور شیعیان علیؓ باقاعدہ ایک مذہبی فرقہ بن گئے۔

شیعوں کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ امامت حضرت علیؓ کے جانشینوں کا حق تھی جو نسلاً بعد نسل باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتی رہی۔ بارہویں اور آخری امام محمد مہدی تھے۔ ان کو صاحب الامر بھی کہتے ہیں۔ وہ بچپن ہی میں سامرہ (عراق) کے ایک غار میں غائب ہو گئے تھے۔ مگر شیعہ عقائد کے مطابق وہ ہنوز زندہ ہیں اور دنیا میں جب فسق و فجور بہت بڑھ جائے گا تو دوبارہ ظہور کریں گے۔ البتہ ان کی عدم موجودگی (غیبت کبریٰ) میں مجتہد حضرات نائب امام کی حیثیت سے شیعوں کی رہبری کے فرائض انجام دیں گے لیکن فقط شرعی امور کی حد تک۔ خمینی صاحب اسی سے اپنی 'ولایت فقیہ' کا جواز پیدا کرتے ہیں اور شرعی امور کے علاوہ سیاسی امور کو بھی 'ولایت

فقیہ' کے تابع کرنا چاہتے ہیں۔

شیعیت کی جانب ایرانیوں کے میلان کے اسباب بھی سیاسی تھے۔ جیسا کہ ہم شروع میں لکھ چکے ہیں۔ ایرانیوں نے عربوں کے غلبے کو کبھی صدقِ دل سے قبول نہیں کیا بلکہ عربوں کو ہمیشہ حقارت سے دیکھا۔ وہ بنی امیہ کو عرب اقتدار کی علامت سمجھتے تھے۔ چنانچہ ان کے حب علی میں بغض معاویہ کو بڑا دخل تھا۔ اہلِ بیت رسولؐ سے ان کی الفت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یزدجرد شہنشاہِ ایران کی بیٹی حضرت شہر بانو جب اسیر ہو کر مدینہ پہنچیں تو ان کو حضرت امام حسین کی زوجیت میں دے دیا گیا تھا۔ گویا امام حسین کی اولاد میں ایرانی خون شامل ہو گیا۔ یاد رہے کہ آٹھویں امام علی رضا کا مزار مشہد میں ہے اور ان کی ہمشیرہ کا مزار قم میں ہے جو خالص مذہبی شہر ہے۔ سب سے بڑے دینی مدرسے وہیں ہیں اور آقائے شریعت مداری اور آیت اللہ خمینی دونوں وہیں رہتے ہیں۔ چالیس پچاس ہزار کے اس شہر میں کوئی سینما گھر نہیں ہے۔

ساسانیوں کے عہد میں ایران کا سرکاری مذہب زرتشتی (آتش پرست) تھا۔ زرتشتی کلیسا بہت طاقتور تھا۔ ملک کی دو تہائی آراضی زرتشتی کنشتوں کے تصرف میں تھی اور ان کے 'موبدوں' اور 'دستوروں' کا جال پورے ملک میں پھیلا ہوا تھا۔ زرتشتیوں کے روحانی پیشوا — موبدان موبد — کی ایرانی معاشرے میں وہی حیثیت تھی جو قرونِ وسطیٰ میں پاپائے روم کی تھی۔ ایرانی فرمانروا موبدان موبد کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔

ایرانیوں نے اسلام قبول کر لیا مگر وہ کلیسائی روایتوں کا قلع قمع نہ کر سکے بلکہ ۱۵۰۲ء میں جب صفویوں نے شیعہ مذہب کو ایران کا سرکاری مذہب قرار دیا تو شیعہ علما وہی کردار ادا کرنے لگے جو زرتشتی موبدوں کا ساسانی عہد میں تھا۔ اسی بنا پر ڈاکٹر علی شریعتی ایرانی ملاؤں کو شیعیان علی کی بجائے 'شیعیان صفوی' کہتے ہیں۔ ایران میں آج بھی کوئی شہر، کوئی چھوٹا بڑا قصبہ ایسا نہیں جس میں امام زادوں کے مزار نہ ہوں۔ یہ مزار اور ان سے منسلک وقف کی زمینیں ملاؤں کا ذریعۂ معاش بھی ہیں اور عقیدت مندوں میں ان کے اثر و رسوخ کا سبب بھی۔ امام علی رضا کے روضے پر تو خراسان کا پورا صوبہ وقف ہے۔

ایران میں ان دنوں یوں تو سینکڑوں مجتہد ہیں لیکن 'مرجع تقلید' فقط پانچ ہیں۔ سب سے

بڑے آقائے شریعت مداری ہیں جو آیت اللہ عظمیٰ کہلاتے ہیں۔ ان کے علاوہ آیت اللہ خمینی، آیت اللہ گل پائگانی، آیت اللہ نجفی اور آیت اللہ شیرازی۔

ان میں سے کسی نہ کسی کی تقلید ایرانی شیعوں کا فرض ہے۔ شریعت مداری ترک نژاد ہیں اور اُن کے مقلدین زیادہ تر آذربائیجان اور خراسان میں ہیں۔ ایران میں خمس کا رواج بھی ہے جو آمدنی کا پانچواں حصہ ہوتا ہے۔ یہ رقم مجتہدوں ہی کے ذریعے مستحقین میں تقسیم کی جاتی ہے۔

پہلوی دور میں شیعہ کلیسائیت کے خلاف جس شخص نے سب سے پہلے آواز اٹھائی وہ ڈاکٹر علی شریعتی تھے۔ انھوں نے شیعہ مذہب کو اطاعت وتقلید کے بجائے انکار و جہاد کا مذہب بنا کر پیش کیا اور شیعوں بالخصوص تعلیم یافتہ نوجوانوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ شاہ کے جبر و استبداد اور مغربی سامراج کی مخالفت عین شیعیت ہے۔ ڈاکٹر علی شریعتی تعلیم یافتہ گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں ایک ہائی اسکول میں پڑھانے لگے۔ اسی دوران انھوں نے ٹیچرز ٹریننگ کالج سے ڈپلوما لیا اور ۱۹۵۸ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے پیرس چلے گئے۔ وہاں انھوں نے ساربون یونیورسٹی سے مذہبیات میں ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کی اور مغربی فلسفہ اور عمرانیات کا بھی گہرا مطالعہ کیا مگر ۱۹۶۴ء میں تہران واپس آتے ہی گرفتار کر لیے گئے کیونکہ یورپ کے زمانۂ قیام میں وہ سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے رہے تھے۔ علی شریعتی کو دس ماہ بعد رہا کر دیا گیا اور وہ مشہد یونیورسٹی میں استاد مقرر ہو گئے لیکن اسلامی شریعت کی جو تشریح وہ علومِ جدیدہ کی روشنی میں کرتے تھے یونیورسٹی کے اربابِ اختیار نے اسے پسند نہیں کیا۔ لہٰذا وہ برطرف کر دیئے گئے۔ ۱۹۶۸ء میں انھوں نے حسینیۂ ارشاد کے نام سے ایک تعلیمی مرکز تہران میں قائم کیا اور وہاں درس دینے لگے۔ شریعتی کے لیکچر یونیورسٹی اور کالجوں کے طلبا میں بہت مقبول ہوئے اور ان لیکچروں کے ٹیپ شہروں شہروں گشت کرنے لگے۔

اگست ۱۹۷۳ء میں شریعتی دوبارہ گرفتار ہوئے مگر ڈیڑھ سال بعد رہا کر دیئے گئے۔ مئی ۱۹۷۷ء میں ان کو امریکہ جانے کی اجازت مل گئی مگر لندن پہنچنے کے چند دن بعد ہی ان کا اچانک انتقال ہو گیا۔ وہ بیس کتابوں کے مصنف ہیں۔ یہ کتابیں ایران میں بہت شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ ان کے لیکچروں کے ٹیپ بھی بے شمار گھروں میں موجود ہیں۔

شریعتی اپنے لیکچروں اور تحریروں میں شاہ کی حکومت پر براہ راست اعتراض نہیں کرتے تھے البتہ کبھی اسلامی تاریخ کے حوالے سے، کبھی قرآن، حدیث اور حضرت علی کے فرمودات کی مدد سے اور کبھی مغربی مفکروں کے اقوال کے سہارے ایران کے معاشرتی اور سیاسی نظام پر کڑی تنقیدیں کرتے تھے۔ شیعہ مذہب ان کے نزدیک انقلابی مذہب تھا جس کی روح کو صفوی دور کے علمانے مسخ کردیا تھا۔ وہ شیعہ شہدا کو انقلابی ہیرو تصور کرتے تھے اور ان کی تقلید کو ایران کی نجات کا واحد ذریعہ سمجھتے تھے۔ وہ امپیریلزم، فاشزم، فیوڈلزم اور سرمایہ داری نظام کے سخت خلاف تھے اور سوشلزم کے اقتصادی اصولوں کو منصفانہ اور اسلام کے مطابق خیال کرتے تھے۔ وہ ذاتی ملکیت کو قومی ملکیت بنانے کے حق میں بھی تھے۔ چنانچہ رسالہ 'امت و امامت' میں امام کے مفاہیم سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

'امام: ملّی کردن اموال واملاک وموسسات خصوصی، ناسیونالیزہ (Nationalize) سوسیالیزہ (Socialize) اشتراکی کردن، یعنی مالکیت خصوصی راعمومی کردن، ودر مالکیت اجتماعی قرار دادن، وامت را مالک آن شناختن۔'[۲۲]

یعنی 'امام کے معنی ہیں ذاتی ملکیت کو ملی بنانا، قومی ملکیت بنانا، اشتراکی بنانا یعنی خصوصی ملکیت کو عمومی ملکیت میں تبدیل کرنا، اجتماعی بنانا اور امت کو اس کا مالک قرار دینا۔'

علی شریعتی کے نزدیک انسانی معاشرہ دو طبقوں میں بٹا ہوا ہے۔

'انسان یا از گروہ رنج براست یا رنجدہ، ستم کش یا ستم کار، یکی می خوردبی آنکہ کار کندویکے کار می کندبے آنکہ بخورد'

(انسان یا دکھ اٹھانے والا ہوتا ہے یا دکھ دینے والا، محنت کرنے والا یا محنت لینے والا، ایک بلا کام کیے کھاتا ہے اور دوسرا بلا کھائے کام کرتا ہے۔[۲۳]

ان کی وفاداری واضح طور پر محنت کش طبقے کے ساتھ ہے۔ مگر ان کا پختہ عقیدہ ہے کہ مغربی جمہوریت اس کا مداوی نہیں ہے۔ وہ مغربی جمہوریت کو دولت مندوں کی عیاری سے تعبیر

کرتے ہیں۔ مغربی جمہوریت میں بالغ رائے دہی کے اصولوں پر جو انتخابات ہوتے ہیں، شریعتی کی نظر میں وہ فریب اور دھوکا ہیں۔

'وضع سیاسی امروز ارو پاو امریکه اگر نگاه کینم اهانت بزرگے است اگر به گویم کسانی که 'رائے اکثریت' مردم ارو پا انتخاب شده اند برجسته ترین وشائسته ترین انسان هائے امروز این جامعه هائے نمونه، قرن حاضر در تمدّن فرهنگ بشری اند۔ این هم اهانت بزرگی به مردم ارو پا وهم اهانت بزرگے به جامعه بشری است۔[۵۲]

'ہم جب یورپ اور امریکہ کی دورِ حاضر کی سیاست پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ کہنا کہ فلاں شخص جو اکثریت کی رائے سے چنا گیا ہے، معاشرے کا سب سے موزوں اور مثالی انسان ہے، یورپ کے لوگوں کی بڑی توہین بلکہ انسانی معاشرے کی توہین ہے۔'

علی شریعتی اس خرابی کا ذمے دار سرمایہ داری نظام کو ٹھہراتے ہیں۔ وہ جمہوریت کی دو قسمیں کرتے ہیں۔(1) آزاد جمہوریت اور (2) ہدایت شدہ (Guided Democracy)۔ آزاد جمہوریت تو وہی مروجہ بورژوا جمہوریت ہے جس کو شریعتی رد کرتے ہیں البتہ ان کے خیال میں ہدایت شدہ جمہوریت کی اساس ترقی پسند انقلابی منشور پر ہوتی ہے۔ اس کا مقصد لوگوں کے خیالات، ان کی تہذیب، ان کے اجتماعی رشتوں، میعارِ زندگی اور معاشرے کی ہیئت کو بدلنا ہوتا ہے اور اس کی بہترین شکل کو ابھارنا ہوتا ہے۔ اس کی ایک 'آئیڈیالوجی' ہوتی ہے، ایک واضح نقطۂ نظر ہوتا ہے۔

'این دیمو کریسی متعهداست، رهبری متعهداست که جامه رانه براساس سنت هائے جامعه بلکه براساس برنامۂ انقلابی خودش به طرف هدف نمائی فکری واجتماعی مشرقی براند۔[۵۳]'

یعنی یہی ہدایت شدہ جمہوریت اور ہدایت شدہ رہبری ہے جو معاشرے کو پرانی

ڈگر کے بجائے اپنے انقلابی منشور کی بنیاد پر فکری اور اجتماعی منزل مقصود کی جانب لے جاتی ہے۔'

علی شریعتی عوام کی سیاسی اور سماجی سوجھ بوجھ کے چنداں قائل نہیں ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ عوام کبھی خونی رشتوں کے خیال سے، کبھی برادری، قبیلے یا فرقے کے دباؤ سے اور کبھی دولت مندوں کے پروپیگنڈے سے متاثر ہوکر ان لوگوں کو منتخب کرلیتے ہیں جو نمائندگی کے بالکل مستحق نہیں ہوتے لہٰذا رائے دینے کا حق فقط 'باشعور' اور 'تعلیم یافتہ' لوگوں کو ملنا چاہیے لیکن یہ محدود جمہوریت بورژوا جمہوریت کا بدل تو نہ ہوئی۔ علی شریعتی کو بورژوا جمہوریت سے یہی شکایت ہے کہ اس میں عوام کی صحیح نمائندگی نہیں ہوتی بلکہ دولت مندوں کے نمائندے جو 'باشعور' اور 'تعلیم یافتہ' ہوتے ہیں منتخب ہوجاتے ہیں لیکن عوام کو حقِ رائے دہی سے محروم کردینے کے بعد تو دولت مندوں کا کام اور آسان ہوجاتا ہے۔ بورژوا جمہوریت میں یہ ممکن ہے کہ عوام کے دوچار، دس بیس سچے نمائندے بھی منتخب ہوجائیں مگر محدود جمہوریت میں تو اس کا سرے سے امکان ہی باقی نہیں رہ جاتا۔ علی شریعتی ہم کو یہ بھی نہیں بتاتے کہ 'باشعور' اور 'تعلیم یافتہ' امیدوار کا معیار کیا ہوگا اور اس معیار کا تعین کون کرے گا۔

غور سے دیکھا جائے تو علی شریعتی کے خیالات علامہ اقبال کے بہت مشابہ ہیں۔ علامہ اقبال کی مانند وہ بھی اسلام کو جامد نہیں بلکہ حرکی (dynamic) مذہب سمجھتے ہیں اور وہ بھی ملاؤں اور صوفیوں کے سخت خلاف ہیں جو مسلمانوں کو گوسفندی کی تعلیم دیتے ہیں۔ وہ زمانہ سازی کے بجائے زمانہ ستیزی کی تلقین کرتے ہیں۔ عقیدے کی بنیاد عمل پر رکھتے ہیں اور جہاد کو عقیدے کی صداقت کو جانچنے کا پیمانہ قرار دیتے ہیں۔ علامہ اقبال کی طرح علی شریعتی بھی مغربی سامراج اور سرمایہ داری نظام کے سخت خلاف ہیں اور مغربی تہذیب سے بھی بدظن ہیں۔

ایرانی مولویوں نے علی شریعتی کی شدت سے مخالفت کی مگر ان کی مقبولیت تعلیم یافتہ نوجوانوں میں روز بروز بڑھتی گئی۔ کہتے ہیں کہ ان کے لیکچروں میں چھ چھ ہزار آدمی شریک ہوتے تھے اور حسینیہ ارشاد میں تل دھرنے کی جگہ نہ ہوتی تھی۔ سازمان مجاہدینِ خلق کی تنظیم علی شریعتی کی تعلیمات سے متاثر ہوکر بنائی گئی تھی اور جب تک وہ زندہ رہے مجاہدینِ خلق کی روحانی

رہ نمائی کرتے رہے۔

ڈاکٹر علی شریعتی کو ساواک نے لندن میں ہلاک کیا اور وہ ایرانی انقلاب کے نشیب وفراز کا منظر اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکے۔ حالانکہ ایران کے مذہبی حلقوں میں انقلاب کی ضرورت کا احساس پیدا کرنے میں ان کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ جو فصل انہوں نے بوئی تھی اس کو اب مولوی حضرات کاٹ رہے ہیں۔ یہ سوال بے معنی ہے کہ علی شریعتی اگر زندہ ہوتے تو آیت اللہ خمینی اور ان کے رفقا کے موجودہ طرزِ عمل کے بارے میں ان کا ردِعمل کیا ہوتا۔ ان کی تحریروں میں جو خلوص اور دردمندی ہم کو ملتی ہے اس کے پیشِ نظر یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ علی شریعتی علمائے دین کی تنگ نظری اور عوام دشمنی کی تائید کبھی نہ کرتے۔

ایران کے موجودہ حکمرانوں کا سب سے بڑا مسئلہ ایرانی عوام ہیں۔ انقلابی جدوجہد کے باعث لوگوں کے سیاسی شعور کی سطح اونچی ہوئی ہے۔ ان میں اپنے جمہوری حقوق کا احساس بڑھا ہے اور خود اعتمادی آئی ہے۔ انقلاب سے ان کو جو توقعات تھیں وہ چونکہ پوری نہیں ہوئیں لہٰذا اربابِ اختیار کے خلاف بیزاری اور بےچینی میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ مگر اب ان کو نہ تو پرانے استبدادی حربوں سے دبایا جاسکتا ہے اور نہ کھلونے دے کر بہلایا جاسکتا ہے۔ خمینی صاحب اور ان کے رفقا مغربی جمہوریت میں لاکھ کیڑے نکالیں، ملاؤں کی آمریت کو اسلامی نظام کہہ کر لوگوں کو حشیش پلانے کی لاکھ کوشش کریں، ان کی کوششیں کبھی بار آور نہ ہوں گی۔ کیونکہ ملاؤں کی تھیوکریسی ملک کے سیاسی اور اقتصادی مسائل کو نہ سمجھ سکتی ہے اور نہ اس کے پاس ان مسائل کا کوئی حل ہے۔ اسی لیے وہ اندھیرے میں تیر چلارہی ہے۔

انقلابی تحریک جب شروع ہوئی تو شاہ کا کہنا تھا کہ ساری شرارت مولویوں اور کمیونسٹوں کی ہے ورنہ عوام کو حکومت سے کوئی شکایت نہیں۔ یہی عذر لنگ اب خمینی صاحب پیش کررہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ سارا فساد مغرب پرست 'طاغوتیوں' کا ہے۔ حالانکہ مسائل ملکی حالات سے پیدا ہوتے ہیں اور عوام کو عمل پر مجبور کرتے ہیں۔ کوئی نہ کسی کو بھڑکاتا ہے نہ مسائل پیدا کرتا ہے۔ قومی خود مختاری کا مسئلہ، انسانی حقوق کا مسئلہ، جمہوری آئین کا مسئلہ، بے روزگاری اور مہنگائی کا مسئلہ، نمائندہ حکومت کا مسئلہ، یہ سب سماجی مسائل ہیں۔ ان کا تعلق نہ مغرب سے ہے

نہ مشرق سے۔ ان کو حل کیے بغیر نہ تھیوکریسی کے قدم جم سکتے ہیں اور نہ جمہوریت کامیاب ہوسکتی ہے۔

خمینی صاحب فرماتے ہیں کہ میرا بس چلے تو ایران کے چاروں طرف دیوار کھینچ دوں تاکہ ملک کے نوجوان بیرونی اثرات سے محفوظ ہوجائیں لیکن خیالات ہوا کے دوش پر سفر کرتے ہیں اور اسی وقت اثر پذیر ہوتے ہیں جب حالات ان کے لیے سازگار ہوں۔ خیالات کا توڑ خیالات ہی سے ہوسکتا ہے، فصیلیں کھڑی کرنے سے نہیں۔ 'بیرونی' خیالات اور نظریات کا خوف اس بات کا ثبوت ہے کہ خمینی صاحب کو اپنے خیالات اور نظریات پر بھروسہ نہیں ہے۔ حالانکہ ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ اسلام کا رسولؐ قرآن کی زبان میں کفار کو للکارتا تھا کہ تم اپنی اولاد کو لاؤ اور ہم اپنی اولاد کو لاتے ہیں۔ تم اپنے نفوس کو لاؤ اور ہم اپنے نفوس کو لاتے ہیں پھر دیکھتے ہیں کہ خدا کے روبرو کون سرخرو ہوتا ہے۔

خمینی صاحب جن خیالات کو 'بیرونی' کہہ کر رد کرتے ہیں وہ دراصل ایرانی عوام کے خیالات ہیں اور انھیں کے جذبات اور خواہشات کی عکاسی کرتے ہیں۔ وہ خیالات کیا ہیں؟ یہی ناکہ اقتدارِ اعلیٰ کے مالک عوام ہیں اور حکومت ان کے چنے ہوئے نمائندوں کا منصب ہے۔ یہی ناکہ شہری آزادی ہر شخص کا پیدائشی حق ہے جس سے کوئی طاقت ان کو محروم نہیں کرسکتی۔ یہی ناکہ ہر شخص کو اس کی محنت کا پھل ملنا چاہیے۔ یہی ناکہ لوگوں کو روٹی، کپڑا، مکان کی سہولتیں فراہم کرنا ریاست کا بنیادی فریضہ ہے۔ یہی ناکہ ہر شخص کو اپنی فطری صلاحیتوں کو نکھارنے اور ترقی دینے کا موقع دیا جائے۔

ریاست خواہ وہ اسلامی ہو یا غیر اسلامی، اگر اس کا نظم و نسق درست نہ ہو، اگر ہر طرف لاقانونیت پھیلی ہو اور کسی کو کل کی خبر نہ ہو تو ریاست کا کوئی مسئلہ قرینے سے حل نہیں ہوسکتا۔ ایران ان دنوں اسی طوائف الملوکی اور بے یقینی کا شکار ہے۔ حکومت لمحہ بہ لمحہ جیتی ہے۔ نہ کوئی طویل المیعاد منصوبہ ہے اور نہ کوئی منزلِ مقصود۔ بس چلتی کا نام گاڑی ہے۔ اس سے کسی کو سروکار نہیں کہ یہ گاڑی بلندیوں کی جانب جارہی ہے یا سمندر کی گہرائیوں میں اتر رہی ہے۔ خود وزیر اعظم مہدی بازارگان معترف ہیں کہ ایران کی حکومت ایک چاقو ہے جس میں پھل نہیں حالانکہ

پھل قم میں ہے۔ اس دو عملی کے باعث نظم ونسق کا ستیاناس ہوگیا ہے۔ ملاؤں کی ہوسِ اقتدار اتنی بڑھ گئی ہے کہ اب تو خمینی صاحب کی بھی کوئی نہیں سنتا۔ چنانچہ ان کے صاحبزادے حجتہ اللہ احمد خمینی نے ۱۶؍اکتوبر کو علانیہ شکایت کی کہ مفاد پرست عناصر نے انقلاب کی روح مسخ کردی ہے اور امام خمینی اب بالکل تنہا رہ گئے ہیں۔ 'میرے والد کے پرانے احباب اور قریبی رفقا کا عوام کی جانب رویہ بدل گیا ہے۔ امام خمینی امریکہ پر گرجتے ہیں۔ وہ دشمن کو پہچانتے ہیں لیکن ان کے مریدوں نے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں پہن لی ہیں۔' احمد خمینی نے کسی کا نام نہیں لیا لیکن 'گارجین' کی نامہ نگار مقیم تہران (لزتھرووڈ) کے بقول ہر شخص جانتا ہے کہ اشارہ ڈاکٹر ابراہیم یزدی کی طرف تھا جنھوں نے 'حال ہی میں نیویارک کے دوران قیام میں امریکی سرمایہ داروں کو یقین دلایا تھا کہ تمہارا کاروبار محفوظ رہے گا۔'

وزارت کے دوسرے مرد آہن مصطفیٰ چمران کے کارنامے کچھ کم نہیں ہیں۔ وہ اپنے استبدادی منصوبوں کو بروئے کار لانے کی غرض سے خانہ جنگی کو ہوا دے رہے ہیں۔ ان کو کردستان کی مہم سر کرنے بھیجا گیا تھا۔ وہاں جب کردوں کا قتلِ عام ہوا تو خمینی صاحب نے اپنے ایک معتمد خاص مہدی بہادران کو تحقیقات کے لیے بھیجا۔ انھوں نے واپس آکر اطلاع دی کہ مصطفیٰ چمران نے ترک وڈیروں میں اسلحے تقسیم کیے تھے تاکہ ترک نژاد ایرانیوں اور کردوں کے درمیان نسلی خانہ جنگی شروع ہوجائے۔ غرضیکہ ہر وزیر اپنی کرسی کو مستحکم کرنے کی فکر میں ہے اور ہر ملا اپنی طاقت بڑھانے میں مصروف ہے۔ اس کھینچا تانی کی وجہ سے جو ابتری پھیلی ہوئی ہے اس کا اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں۔ اسی صورتِ حال سے تنگ آکر ڈاکٹر کاظم سمیع وزیر صحت نے آخر کار استعفیٰ دے دیا ہے اور خمینی صاحب کو ایک خط میں جو بہت تلخ ہے، لکھا ہے کہ 'ہر وزیر فقط اقتدار کا خواہاں ہے اور حصولِ اقتدار کی کوششوں میں منہمک ہے۔ لہٰذا ملکی مسائل کو متحدہ طور پر حل کرنے کی نہ تو کوئی پالیسی وضع ہوسکتی ہے اور نہ اُس پر عمل کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ گزشتہ آٹھ ماہ کے عرصے میں حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے بلکہ لوگوں کی بددلی میں اضافہ ہوا ہے۔' ڈاکٹر سمیع ایک چھوٹی سی جماعت جاما (جنبش انقلابی مردم مسلمانان ایران) کے سربراہ ہیں۔ ان کے مستعفی ہونے کے بعد ڈاکٹر مہدی بازرگان بالکل ہی ملاؤں

کے رحم وکرم پر ہیں۔ وہ خود بھی ملاؤں کی دخل اندازیوں سے عاجز آ کر دوبار استعفیٰ دے چکے ہیں۔ وہ خمینی صاحب سے کہتے ہیں کہ خدا را تہران آ یئے اور اختیار سنبھالیے لیکن خمینی صاحب ان کا استعفیٰ منظور نہیں کرتے۔

پھر ایسے ایسے لطیفے ہوتے ہیں کہ شاہ کے زمانے میں بھی کسی نے شاید ہی سنے ہوں مثلاً آیت اللہ منتظری کے صاحبزادے شیخ محمد منتظری کے سفرِ لیبیا کا لطیفہ۔ آیت اللہ منتظری کو خمینی صاحب نے آیت اللہ طیلقانی مرحوم کا جانشین مقرر کیا ہے۔ وہ مجلسِ خبرگان کے صدر بھی ہیں۔ ان کے بیٹے شیخ محمد ستمبر میں لیبیا جانے کے ارادے سے تہران ایئرپورٹ پہنچے۔ دس پندرہ مسلح پاسدارانِ انقلاب ان کے ہمراہ تھے۔ شیخ محمد کے پاس پاسپورٹ ویزا کچھ نہیں تھا لہٰذا ایئرپورٹ والوں نے ان کو روکنا چاہا تو پاسدارانِ انقلاب نے ایئرپورٹ والوں کی خوب مرمت کی اور سیرین عرب ایئر لائن کے ایک جہاز پر زبردستی قبضہ کر لیا۔ شیخ محمد اس میں بیٹھ کر لیبیا روانہ ہو گئے۔ واپسی پر ایئرپورٹ والوں نے ان کو پکڑ کر حراست میں لے لیا مگر پاسدارانِ انقلاب جو شیخ محمد منتظری کے انتظار میں باہر کھڑے تھے اندر گھس آئے اور شیخ منتظری کو چھڑا کر لے گئے۔ ایئرپورٹ کے حکام مُنہ دیکھتے رہ گئے[۶]

سوال یہ ہے کہ اس صورتِ حال کا ذمے دار کون ہے؟ خمینی صاحب اور ان کے رفقا یا وہ 'طاغوتی' جو ان دنوں معتوب ہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ مخلص انقلابی عناصر کو بے دست وپا خمینی صاحب نے کیا؟ سیاسی جماعتیں ان کے حکم سے خلافِ قانون قرار دی گئیں۔ اخباروں اور رسالوں کا گلا ان کے آدمیوں نے گھونٹا، مجلس شورائی ملی کی تجویز کو انھوں نے سبوتاژ کیا۔ نسلی قومیتوں پر مظالم ان کے ایما سے توڑے گئے۔ ملاؤں کو انھوں نے بانس پر چڑھایا اور وزارتیں اپنے معتمدین کو انھوں نے سونپیں۔ اس کے بعد یہ شکوہ کہ مفاد پرست عناصر نے انقلاب کی روح مسخ کر دی ہے اور میری کوئی نہیں سنتا، بے جا ہے۔

مکافاتِ عمل بڑا قوی دستور ہے۔ ہر آمر کو خواہ وہ سیکولر ہو یا مذہبی اپنے اعمال کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ قاعدہ ہے کہ جمہور کی آواز جب ایوانِ اقتدار تک نہیں پہنچتی اور نہ ان کو امورِ مملکت میں شریک کیا جاتا ہے تو طالع آزماؤں اور موقع پرستوں کی عید ہو جاتی ہے اور حاکم

وقت خود غرض خوشامدیوں میں گھر جاتا ہے۔ ان حالات سے شاہ کے زمانے میں شاہ کے حاشیہ نشینوں نے فائدہ اٹھایا اور اب یہی کردار خمینی صاحب کے حاشیہ نشین ادا کر رہے ہیں۔ جمہوری طرزِ حکومت میں ریاست کے تمام عناصر چونکہ عوام کے روبرو جواب دہ ہوتے ہیں اور احتساب کا عمل جاری رہتا ہے لہٰذا مفاد پرستوں کی روک تھام ممکن ہوتی ہے لیکن ایران میں نہ خمینی صاحب کے نامزد کردہ اربابِ اختیار عوام کے روبرو جواب دہ ہیں اور نہ خود خمینی صاحب سے باز پرس کی جا سکتی ہے۔

ایرانی انقلاب کو سب سے زیادہ بدنام 'پاسدارانِ انقلاب' نے کیا ہے۔ ملک میں افراتفری اور لاقانونیت پھیلانے کا ذمے دار یہی گروہ ہے، جس میں بیشتر نچلے درمیانے طبقے کے بیروزگار شامل ہو گئے ہیں۔ ان کا کوئی سیاسی عقیدہ نہیں ہے بلکہ وہ بھاڑے کے ٹٹو ہیں۔ شاہ کے زمانے میں وہ شاہ کے ساتھ تھے۔ عوامی تحریک نے زور پکڑا تو وہ راتوں رات انقلابی بن گئے۔ بینکوں، دکانوں کو لوٹنا، دفتروں میں آگ لگانا اور دوسری اشتعال انگیز حرکتیں کرنا ان کا مشغلہ ٹھہرا۔ انقلاب کے بعد ان کی باقاعدہ تنخواہیں مقرر کر دی گئیں اور ان کو رائفلوں، سٹین گنوں سے مسلح کر کے انقلاب کی 'حفاظت' پر مامور کر دیا گیا اور اب یہ پاسدارانِ انقلاب ہٹلر کے طوفانی دستوں کی طرح ملک میں ہر طرف خوف اور دہشت پھیلا رہے ہیں۔ وہ جس کو چاہتے ہیں، ساواک کا ایجنٹ یا شاہ کا وفادار کہہ کر پکڑ لیتے ہیں۔ تہران میں انہوں نے وہ ادھم مچائی کہ آخرکار آئی جی پولیس نے تنگ آ کر سپاہیوں کو ہدایت کر دی کہ شہر میں کوئی واردات ہو تو تم کسی سے کچھ نہ کہو۔ پاسدارانِ انقلاب کو نمٹنے دو اور جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے کہہ دیا کہ آئندہ ہم کسی قیدی کو جیل میں نہیں رکھیں گے اور اب تو وہ اتنے خود سر ہو گئے ہیں کہ آیت اللہ خمینی کے احکام کی بھی پروا نہیں کرتے۔ خمینی صاحب نے ہدایت کی تھی کہ آئندہ کسی کو موت کی سزا نہ دی جائے اور نہ گولی ماری جائے مگر خوزستان میں اس ہدایت پر عمل نہیں ہوا چنانچہ اب تک پاسدارانِ انقلاب آٹھ عربوں کو گولی مار چکے ہیں۔ تبریز میں حال ہی میں آیت اللہ محمد علی طباطبائی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ وہ تبریز میں خمینی صاحب کے خاص نمائندے تھے اور پاسدارانِ انقلاب کے سربراہ بھی مگر کچھ عرصے سے وہ پاسداروں کی حرکتوں کی وجہ سے ان

سے بیزار ہو گئے تھے اور کہتے تھے کہ یہ لوگ ساواک کے جانشین بن گئے ہیں اور انھیں جرائم کے مرتکب ہو رہے ہیں جو ساواک سے منسوب تھے (۲ نومبر)

کردستان میں بھی ساری تباہی پاسداروں ہی کی لائی ہوئی ہے۔ نہتے بے گناہوں کو گولی مار کر انھوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ کرد چھاپہ ماروں کو بھی زیر کرلیں گے مگر کردوں نے ان کرائے کے سورماؤں کی وہ مرمت کی کہ چھٹی کا دودھ یاد آ گیا۔ اب شکایت کرتے ہیں کہ فوج نے ہمارے ساتھ تعاون نہیں کیا۔ خوزستان میں عربوں پر جو ظلم ہو رہا ہے اس میں بھی یہی حضرات پیش پیش ہیں۔ غرضیکہ یہ وہ فاشسٹ گروہ ہے جو انقلاب کی پاسبانی کے بجائے انقلاب کی جڑیں کھود رہا ہے اور عوام کو انقلاب سے بدظن کر رہا ہے۔

ایران کے موجودہ حکمران، ملک میں ایک ایسا نظامِ حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں جو کہنے کو تو اسلامی ہوگا لیکن فی الواقعی اتنا ہی آمرانہ ہوگا جتنا شاہی نظام تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ ان دنوں اس نام نہاد اسلامی آمریت کو آئینی شکل دینے کی کوشش کی جارہی ہے اور اگر یہ مسودۂ آئین استصوابِ رائے سے منظور ہوگیا تو ایران میں جمہوریت کا جنازہ نکل جائے گا۔ اس کی پیش بندیاں ابھی سے ہو رہی ہیں۔ 'سازمان اسیرانِ سیاسی' ایک تنظیم ہے جو شاہ کے آخری دنوں میں قائم ہوئی تھی۔ اس نے حال ہی میں ایک رپورٹ شائع کی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ساواک کے کئی چوٹی کے افسر جو، اب تک روپوش تھے، ساواما (خفیہ پولیس) میں بھرتی کر لیے گئے ہیں اور سیاسی قیدیوں کو دوبارہ جسمانی اذیتیں پہنچائی جارہی ہیں۔ اس رپورٹ کے مطابق ایران میں اس وقت ڈیڑھ ہزار سے زیادہ سیاسی قیدی جیلوں میں بند ہیں۔ اس اندازے میں شاہ پرست اور ساواک کے ایجنٹ شامل نہیں ہیں۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ جیل میں سیاسی قیدیوں کی حالت شاہی دور سے بہتر نہیں ہے۔ قیدیوں کو اعتراف جرم پر مجبور کرنے کی خاطر خاردار تاروں سے پیٹا جاتا ہے۔ ان کے مقدموں کی سماعت خفیہ طور پر جیلوں کے اندر ہی ہوتی ہے۔ ان مقدموں میں ملزموں کو وکیل کرنے کی اجازت نہیں ہوتی اور نہ ان کو فردِ جرم پہلے سے فراہم کی جاتی ہے۔ عدالت کے کمرے میں مقدمے کی سماعت کرنے والے مولوی اور ملزم کے سوا کوئی موجود نہیں ہوتا اور مقدمے کا فیصلہ پندرہ منٹ میں کردیا جاتا ہے۔ ایک

مقدمے میں تو جرم کا ثبوت ملزم کو گولی مار دینے کے بعد اس کے گھر سے 'برآمد' کیا گیا۔ عدالتی ناانصافی کی مثال دیتے ہوئے رپورٹ میں لکھا ہے کہ کرمان میں علی امیر شاکری نامی ایک تیرہ سالہ طالب علم کو فقط اس جرم کی پاداش میں گولی ماردی گئی کہ اس کے پاس سے چند پرچیاں نکلی تھیں اور علی احسن ناہید کو جس کا ایک بازو اور ایک پاؤں پہلے سے ٹوٹا ہوا تھا، پاسدارانِ انقلاب گولی مارنے کے لیے چارپائی پر اٹھا کر لے گئے۔

رپورٹ میں رضا سعادتی اور بارہ دوسرے سوشلسٹوں اور آٹھ صحافیوں کی گرفتاری کی روداد بھی درج ہے۔ ان میں سے دو کو اسلام آباد کے ایرانی سفارتخانے کے اعلان کے مطابق عمر قید کی سزا دی جا چکی ہے۔ رضا سعادتی کئی مہینے سے قید ہیں۔ ان پر سوویت یونین کے جاسوس ہونے کا الزام ہے۔ اس الزام پر تبصرہ کرتے ہوئے آیت اللہ طیلقانی مرحوم نے کہا تھا کہ 'عجیب بات ہے کہ ہمارے ملک میں امریکہ کا کوئی جاسوس آج تک نہیں پکڑا گیا البتہ روس کے جاسوس حکومت کو ہر جگہ مل جاتے ہیں'۔

طاقت کا نشہ سب نشوں سے زیادہ برا ہوتا ہے۔ شاہ کو یہی نشہ لے ڈوبا اور اب خمینی صاحب اور ان کے رفقا بھی اسی مرض میں مبتلا ہیں۔ کردوں نے بہت سمجھایا کہ دیکھئے علاقائی خودمختاری سے ایران کی وحدت، اور سالمیت پر حرف نہیں آتا مگر خمینی صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے بلکہ الٹے کردستان پر چڑھائی کا حکم دے دیا گیا اور فوج کے دستے اور ان کے جلو میں پاسدارانِ انقلاب اس شان سے کردستان فتح کرنے نکلے گویا داریوش کا لشکر یونان فتح کرنے جا رہا ہے۔ کردستان پہنچ کر فوج نے تو ہم وطنوں کے قتل میں شرکت سے انکار کر دیا اور پاسداروں کو ایسی منہ کی کھانی پڑی کہ حکومت کو چار و ناچار تشدد کی حکمتِ عملی ترک کر کے مصالحت کی گفتگو شروع کرنی پڑی۔ حالانکہ یہ مسئلہ ہزاروں بے گناہوں کا خون بہائے بغیر بھی افہام و تفہیم کے ذریعے آسانی سے طے کیا جا سکتا تھا۔ ایرانی حکمرانوں کے طرزِ عمل سے یہ حقیقت ایک بار پھر آشکارا ہو گئی کہ جمہوری حقوق خیرات نہیں ہوتے بلکہ لڑ کر حاصل کیے جاتے ہیں۔

طاقت کا یہی نشہ ہمسایہ عرب ملکوں سے بھی کشیدگی کا باعث بنا ہے۔ عرب امارتوں کے اندرونی معاملات میں مداخلت، بحرین اور دوسرے جزیروں پر قبضے کی دھمکیاں اور خلیج میں اشتعال

انگیز بحری مشقیں ایسے اقدامات نہ تھے جن کو عرب ممالک نظر انداز کر دیتے۔ چنانچہ عربوں پر ان باتوں کا شدید ردعمل ہوا اور ایران کے خلاف ان کا متحدہ محاذ بن گیا۔ تب خمینی صاحب اور ان کے رفقا کو ہوش آیا اور اب کبھی شام کے صدر حافظ اسد سے بیچ بچاؤ کرنے کی درخواست کی جاتی ہے اور کبھی یاسر عرفات کے پاس ایلچی بھیجے جاتے ہیں کہ 'غلط فہمیاں دور کرواؤ'۔

انقلاب کوئی جامد شے نہیں ہے بلکہ ایک متحرک حقیقت، ایک مسلسل عمل ہے۔ اسی طرح انقلاب کی قیادت بھی کسی کی ذاتی جاگیر نہیں۔ چنانچہ انقلاب کی قیادت خواہ وہ کتنی ہی مقدس اور مقتدر کیوں نہ ہو، اگر انقلاب کے مقاصد اور تقاضوں کو پورا نہ کرے تو عوام ایسی قیادت کو زیادہ عرصے برداشت نہیں کرتے۔ ایران میں ان دنوں یہی ہو رہا ہے۔ لوگوں کو انقلاب سے جو توقعات تھیں وہ پوری نہیں ہوئی ہیں بلکہ وہ یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ ہم نے بڑی قربانیوں کے بعد ایک ڈکٹیٹر سے نجات پائی تھی اور اب اسلام کی آڑ میں ہم پر آمریت دوبارہ مسلط کی جا رہی ہے۔ یہ درست ہے کہ جمہوریت پسند تنظیموں کو بے اثر بنا دیا گیا ہے لیکن عوام سے ان کا جمہوری شعور تو کوئی نہیں چھین سکتا۔ آج نہیں تو کل وہ اپنی حاکمیت، اپنا حق منوا کر رہیں گے۔

۵ رنومبر ۱۹۷۹ء

حوالہ جات وحواشی

۱۔ تحریک پاکستان کی اساس ۱۹۴۰ء کا لاہور رزولیوشن ہے جس میں اسلامی نظام کا ذکر تک نہیں بلکہ مسلمانوں کے اکثریتی علاقوں میں مسلمانوں کی خود مختار ریاستیں قائم کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

۲۔ ڈاکٹر علی شریعتی، رسالہ اُمت وامامت (تہران)، ۱۹۶۹ء ص ۳۴۔

۳۔ ایضاً، ص ۵۷۔

۴۔ ایضاً، ص ۱۷۳۔

۵۔ ایضاً ص ۱۸۰۔

6- *Meed*, 21 September, 1979.

چودھواں باب

۱۹۸۰ء کے بعد ایران پر کیا گزری

اس کتاب کی اشاعت کے وقت (جنوری ۱۹۸۰ء) ایرانی انقلاب بڑے نازک دور سے گزر رہا تھا۔ محبانِ وطن کے متحدہ محاذ کے لیے (جس میں علمائے دین، تاجرانِ بازار، مجاہدینِ خلق، فدائینِ خلق، حزبِ تودہ، خواتین، طلبا اور محنت کش عوام بھی شریک تھے) وہ زمانہ بڑی آزمائش کا تھا کیونکہ شاہ اور امریکیوں کی ملک بدری کے بعد متحدہ محاذ میں رخنے پڑنا شروع ہو گئے تھے۔ نئی ریاست کی نوعیت کیا ہوگی اور ایرانی معاشرے اور معیشت کی از سرِ نو تعمیر کن اصولوں کے تحت کی جائے، اس کے بارے میں متحدہ محاذ میں شامل عناصر کے مابین شدید اختلافات پیدا ہونے لگے تھے۔ سبب یہ تھا کہ جدو جہد کے دوران متحدہ محاذ کی کوئی باقاعدہ تنظیم نہ بن سکی تھی۔ انقلاب میں شریک ہونیوالے مختلف الخیال عناصر اگر متفق تھے تو اس بات پر کہ شاہ کی استبدادی حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے اور شاہ کے سرپرست امریکی سامراج کا عمل دخل ختم ہو۔ یہ درست ہے کہ تمام عناصر نے امام خمینی کو اپنا قائد و رہبر تسلیم کر لیا تھا لیکن خود انقلاب کے رہنماؤں کے ذہن میں معاشرے کی اصلاح و ترقی کا کوئی واضح اور ٹھوس نقشہ نہ تھا اور نہ انہوں نے انقلاب میں شامل عناصر کے ڈھیلے ڈھالے اتحاد کو کسی پروگرام کے تحت پائیدار اور

مستحکم بنانے کی کوشش کی تھی۔ انقلاب کی یہی وہ بنیادی خامی تھی جس کی وجہ سے نہ صرف متحدہ محاذ پارہ پارہ ہوگیا بلکہ ایران گزشتہ پانچ سال سے مسلسل بحران میں مبتلا ہے اور یہ بحران روز بروز زیادہ شدید ہوتا جارہا ہے۔

انقلابی جدو جہد میں شریک ہونے والوں میں ایک سرے پر وہ لبرل عناصر تھے (مہدی بازرگان اور ابوالحسن بنی صدر وغیرہ) جو مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کے حامی تھے اور ملک کے معاشی اور سیاسی مسائل کو سرمایہ داری کے دائرے میں رہ کر حل کرنا چاہتے تھے۔ وہ مغربی تہذیب، مغربی طرزِ تعلیم اور مغربی طرزِ حکومت کو اختیار کرنے ہی میں ملک کی نجات سمجھتے تھے۔ اسی گووہ میں امریکی گماشتے بھی شامل ہوگئے تھے (ابراہیم یزدی اور صادق قطب زادہ وغیرہ)۔ استبدادی حکومت کے خلاف جب کسی ملک میں عوامی تحریک زور پکڑتی ہے تو امریکہ، پٹھوحکومت کی مدد کرنے کے علاوہ اپنے چند معتبر آدمیوں کو عوامی تحریک میں بھی چپکے سے داخل کروا دیتا ہے تاکہ وہ عوامی تحریک کے کامیاب ہونے پر کلیدی اسامیوں پر قابض ہوجائیں۔ صادق قطب زادہ سترہ سال امریکہ میں رہ کر پیرس اُس وقت پہنچا جب امام خمینی وہاں مقیم تھے اور اُن کے حلقہ بگوشوں میں شامل ہوگیا۔ انقلاب کے فتحیابی کے بعد وہ پہلے ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات کا ناظم اعلیٰ بنا اور پھر وزیرِ خارجہ ہوگیا۔ اُسکی امریکہ نوازی کا بھانڈا اُس وقت پھوٹا جب ایرانی سفیر متعینہ پیرس نے ایک لاکھ ڈالر کے اُس چیک کی نقل حاصل کرلی جو سی۔ آئی۔ اے نے صادق قطب کو دیا تھا۔ صادق قطب زادہ کو اپنے جرم کا اعتراف کرنا پڑا۔ وہ گرفتار ہوا اور سزائے موت کا مستوجب قرار پایا مگر ابھی تک ایران کے اندر قطب زادہ کے قبیلے کے بیشمار افراد خفیہ طور پر سرگرم عمل ہیں۔

لبرل عناصر سرمایہ داروں کو جن میں شاہ پرست بھگوڑے بھی تھے، زیادہ سے زیادہ رعائتیں دینے کے حق میں تھے۔ چنانچہ انھیں کے دورِ اقتدار میں ملیں اور فیکٹریاں جن کو مزدور چلارہے تھے، سرمایہ داروں کو ملنے لگی تھیں۔ وہ برطانیہ، فرانس، مغربی جرمنی اور جاپان سے تجارتی تعلقات کو فروغ دینے کے قائل تھے بلکہ امریکہ سے مفاہمت میں بھی کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے۔

دوسرا گروہ ملاؤں کا تھا جن کو امام خمینی کی قربت اور حمایت حاصل تھی اُن کی سب سے طاقتور جماعت حزب جمہوریہ اسلامی تھی اور اسی سے ملحق حزب اللہ اور پاسداروں کی تنظیمیں تھیں۔ یہ لوگ مغربی تہذیب، مغربی طرزِ تعلیم اور مغربی طرزِ سیاست کو تمام خرابیوں کی جڑ خیال کرتے تھے اور معاشرے کو مشرف بہ اسلام کرنے کے درپے تھے۔ البتہ اُن کے مذہب میں سرمایہ داری نظام اور فیوڈل ازم میں شرعی اعتبار سے کوئی بات قابلِ اعتراض نہیں تھی بلکہ وہ ذاتی ملکیت کو خواہ وہ کسی طرح حاصل کی گئی ہو، اسلام کے عین مطابق سمجھتے ہیں۔ ان کو تاجرانِ بازار کی پشت پناہی بھی حاصل ہے۔ لبرل عناصر سے اُن کا اختلاف اگر تھا تو مغربی تہذیب وتمدن پر تھا، جس کو وہ طاغوتی کہتے تھے۔

تیسرا عنصر بائیں بازو کی جماعتوں کا تھا، جو معاشرے میں بنیادی تبدیلیوں کے خواہاں تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ ایرانی انقلاب قومی جمہوری انقلاب ہے جس کی تکمیل اُسی وقت ہو سکتی ہے جب مغربی سامراج سے ناتا توڑ لیا جائے۔ بھگوڑے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی املاک ضبط کرلی جائیں۔ مزدوروں کو فیکٹریوں اور کارخانوں کے نظم ونسق میں بااثر کردار ادا کرنے کا موقع ملے۔ زمینیں دہقانوں میں بانٹ دی جائیں اور زرعی اصلاحات کا باضابطہ منصوبہ بنے، تاکہ دیہات کی معیشت جو شاہ کے عہد میں تہس نہس ہوگئی تھی، بحال ہوسکے اور زرعی پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ ہو۔ اُن کا مطالبہ تھا کہ انقلاب میں شریک ہونے والی تمام جماعتوں کو تقریر، تحریر اور تنظیم کی پوری پوری آزادی ہو اور تعلیم یافتہ بیروزگاروں کے روزی روزگار کا بندوبست کیا جائے۔ اُن کا خیال تھا کہ ان تجاویز پر عمل کرنے ہی سے قومی اتحاد کو فروغ ہوگا۔ ملکی معیشت ترقی کریگی، عوام کے مسائل حل ہونگے اور ان میں جو بے چینی پیدا ہورہی ہے، اس کا ازالہ ہوسکے گا۔

امام خمینی نے ان تینوں عناصر کی ملی جلی قومی حکومت بنانے کے بجائے عنانِ اقتدار ایک طرف لبرلوں کی سپرد کردی۔ دوسری طرف ملاؤں کو من مانی کرنے کی پوری آزادی دیدی۔ البتہ بائیں بازو والوں کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیا۔ ایران میں دوعملی شروع ہوگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملاؤں کی جماعت حزبِ انقلابِ اسلامی اور لبرل کے درمیان کرسی کی جنگ چھڑ گئی۔

ابتدا میں لبرلوں کا پلہ بھاری رہا۔ چنانچہ جنوری ۱۹۸۰ء میں جب نئے آئین کے تحت صدر جمہوریہ کا انتخاب ہوا تو حزب انقلاب اسلامی کے نمائندہ حسن حبیبی کو فقط پانچ لاکھ ووٹ ملے اور ابوالحسن بنی صدر ایک کروڑ دس لاکھ کی بھاری اکثریت سے صدر چن لیے گئے۔

مگر لبرلوں کی امریکہ نوازی اُن کو لے ڈوبی کیونکہ ایرانی قوم جو امریکہ کی زخم خوردہ ہے سب برداشت کرسکتی ہے لیکن امریکہ کے دوستوں کو ہرگز برداشت نہیں کرسکتی۔ ملاؤں نے اس صورتِ حال سے خوب فائدہ اٹھایا۔ عدالتوں پر وہ پہلے ہی قابض تھے رفتہ رفتہ وہ ابلاغ عامہ کے تمام ذرائع پر بھی قابض ہوگئے۔ ریڈیو، اخبار اور ٹیلی وژن سے تمام روشن خیال عناصر برطرف کردیئے گئے اور لبرلوں کے خلاف مہم پوری قوت سے شروع ہوگئی۔ اس کے ساتھ پاسداروں کے ذریعے بڑے پیمانے پر دہشت گردی کا آغاز ہوا۔ پاسدارانِ انقلاب گھروں میں گھس کر لوٹ مار کرتے، لوگوں کو مارتے پیٹتے، دکانوں، دفتروں کو آگ لگادیتے اور جس کو چاہتے طاغوتی کہہ کر پکڑ کرلے جاتے۔ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ ان کی نام نہاد عدالتوں سے اب تک چالیس پچاس افراد کو جن میں بارہ تیرہ سال کی معصوم بچیاں بھی شامل ہیں، موت کی سزا مل چکی ہے۔ اسی دہشت گردی کا نتیجہ تھا کہ مارچ ۱۹۸۰ء میں جب مجلسِ شورائی ملی کے انتخابات ہوئے تو حزبِ انقلاب اسلامی کے آدمی بڑی اکثریت سے منتخب ہوگئے۔ اس کی وجہ سے ملک میں شدید آئینی بحران پیدا ہوگیا۔ ابوالحسن بنی صدر مصر تھے کہ نیا آئین صدارتی طرزِ حکومت کی عکاسی کرتا ہے، لہٰذا وزیروں کو مقرر کرنا اور برطرف کرنا میرا حق ہے۔ اس کے برعکس مجلس کا دعویٰ تھا کہ اختیارات کا منبع اور مخرج مجلس ہے۔

ایران کا نیا آئین بہ ظاہر جمہوری ہے لیکن حقیقت میں اس کے ذریعے بدترین قسم کی تھیوکریسی کے لیے آئینی جواز فراہم کیا گیا ہے۔ ایک طرف مزدوروں، کسانوں، طالب علموں، عورتوں اور عام شہریوں کو دنیا بھر کے حقوق بڑی فراخدلی سے عطا ہوئے ہیں دوسری طرف اتنی شرطیں اور پابندیاں لگادی گئی ہیں کہ ان حقوق کی کوئی آئینی حیثیت باقی نہیں رہی ہے۔ آئین سازوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ ملاؤں کے ایک مختصر سے ٹولے کو اتنے وسیع اختیارات دیدیئے ہیں جن سے صدرِ مملکت اور مجلس دونوں اس ٹولے کے تابع ہوگئے ہیں۔ ملاؤں کی اس

تنظیم کا نام 'شورائی نگہبانان' ہے جو بارہ افراد پر مشتمل ہے۔ چھ ارکان کو امام خمینی نامزد کرتے ہیں اور چھ کو مجلس۔ آئین کی دفعہ ۹۱ کے مطابق 'شورائی نگہبانان' اسلامی شریعت کے تحفظ اور نفاذ کے لیے قائم کی گئی ہے، تاکہ مجلس کوئی قانون، شریعت کے خلاف وضع نہ کر سکے۔ دفعہ ۹۴ کے تحت مجلس کا فرض ہے کہ قوانین کو کونسل کی منظوری اور توثیق کی غرض سے شورائی نگہبانان کے رو برو پیش کرے۔ اگر وہ کسی قانون کو شرع اور آئین کے خلاف سمجھے تو وہ اس کو رد کرنے کی مجاز ہے۔ شورائی نگہبانان کو دفعہ ۹۹ کے تحت صدر مملکت اور مجلس کے انتخابات کی نگرانی کا حق بھی حاصل ہے۔ ملا اپنے اس آئینی حق کو بڑی مستعدی سے استعمال کر رہے ہیں۔

امام خمینی کے آئینی اختیارات شاہ سے بھی زیادہ ہیں۔ آئین کی دفعہ ۱۱۰ کے تحت عدالتِ عالیہ کے ارکان مقرر کرنا، سپہ سالار افواج اور چیف آف جنرل اسٹاف کی تقرری اور برطرفی، پاسداروں کے سربراہوں کی تقرری اور برطرفی، قومی تحفظ کی مجلسِ اعلیٰ کی تشکیل، بری، بحری اور فضائی افواج کے سپہ سالاروں کا تقرر، جنگ اور صلح کا اعلان، صدر مملکت کے انتخاب کی توثیق، صدارت کے امیدواروں کی توثیق اور تنسیخ اور صدر مملکت کی برطرفی کا اختیار امام خمینی کو ہے۔

ملاؤں نے امریکی یرغمالیوں کے واقعے کو بھی اپنی طاقت بڑھانے اور لبرلوں کو زک پہنچانے کی خاطر استعمال کیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ابو الحسن نمائشی صدر ہو کر رہ گئے۔

ابھی ابو الحسن بنی صدر اور حزب انقلاب اسلامی میں رسہ کشی جاری تھی کہ عراق نے ایران کے سیاسی بحران سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ستمبر ۱۹۸۰ء میں ایران پر اچانک حملہ کر دیا حالانکہ ایران کی طرف سے کوئی ایسی اشتعال انگیز حرکت سرزد نہیں ہوئی جو حملے کے لیے جواز فراہم کرتی۔ صاف ظاہر تھا کہ یرغمالیوں کو طاقت کے زور سے رہا کرانے کی کوشش کے ناکام ہونے کے بعد امریکہ نے عراق کو ایران پر حملہ کرنے کی ترغیب دی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ ایران تیل کے ذخیروں سے اور عرب ملکوں کی حمایت سے محروم ہو جائے۔

عراق کے فوجی حاکموں کا خیال تھا کہ آپس کی پھوٹ کا اثر ایران کی دفاعی قوتوں پر بھی پڑے گا۔ ایرانی فوج مقابلے کی تاب نہ لا سکے گی اور وہ ایران کے تیل کے ذخیروں پر آسانی

سے قبضہ کر لے گا۔ عراقیوں کو یہ خوش فہمی بھی تھی کہ حملہ ہوتے ہی ایرانی کرد اور عرب عراق کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوں گے۔ ایران میں بغاوت پھیل جائے گی اور حکومت کا تختہ الٹ جائے گا۔ یہ بزدلانہ حملہ بلا کسی اشتعال کے ایسے وقت کیا گیا تھا، جب ایرانی فوج کی تنظیم بھی نہیں ہو سکی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عراقی فوجوں نے آبادان اور خرم شہر پر جہاں تیل کی ریفائنریاں تھیں، جلد ہی قبضہ کر لیا اور تقریباً سو میل اندر گھس آئیں۔

لیکن حملہ آوروں نے ایران کے حالات کا اندازہ لگانے میں سخت غلطی کی تھی، نہ ایرانی فوج شکست خوردگی کا شکار ہوئی، نہ کردوں اور عربوں نے بغاوت کی بلکہ پوری ایرانی قوم نے متحد ہو کر لڑنے مرنے پر کمر باندھ لی۔ ایران کے ہمسایہ عرب ممالک ہر چند کہ عراق کی مالی امداد کر رہے تھے اور عراق فوجوں کے پاس اسلحوں کی بھی کمی نہ تھی لیکن فوجیں فقط ڈالر اور اسلحوں کے بل بوتے پر نہیں لڑتیں۔ اگر مؤقف کی صداقت مشکوک ہو اور دل سوزِ یقیں سے خالی ہوں تو بڑے بڑے سورماؤں کے بازو شل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ عراقی سپاہیوں کو پہلے دن ہی سے یہ احساس تھا کہ حملہ سراسر ناانصافی ہے اور عراق کے پاس اس جارحانہ اقدام کا کوئی اخلاقی جواز موجود نہیں لہٰذا وہ بڑی بے دلی سے لڑے بلکہ ہزاروں سپاہیوں نے بلا لڑے ہتھیار ڈال دیے اور جنگی قیدی بننا گوارہ کر لیا۔ بالآخر ایرانیوں نے عراقی فوجوں کو شکست دی اور دشمن کو مقبوضہ علاقے خالی کر کے بھاگنا پڑا۔

مگر جنگ کے دوران بیشتر اسلامی ملکوں نے جو منافقانہ رویہ اختیار کیا، وہ بے حد افسوسناک ہے۔ ان میں سے کسی نے بھی عراقی جارحیت کی مذمت نہ کی اور نہ صدام حسین پر دباؤ ڈالا کہ وہ اپنی فوجوں کو واپس بلانے کا حکم دے۔ آمہ کمیٹی کے اجلاس ہوتے رہے اور فریقین میں 'مصالحت' کروانے اور جنگ رکوانے کی کوششیں بھی کی گئیں مگر چپکے چپکے عراق کی مدد بھی ہوتی رہی، چنانچہ خود صدام حسین نے 'نیویارک ٹائمز' کے ایک انٹرویو میں اعتراف کیا کہ خلیجی امارتوں نے عراق کو بیس ارب ڈالر (۲۰۰ ارب روپیہ) فراہم کیے تھے (روزنامہ جنگ ۱۴ جولائی ۱۹۸۲ء) اور روزنامہ ڈان مورخہ ۱۴ جولائی کی اطلاع کے مطابق 'گلف کوآپریشن کونسل' جو سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، قطر، کویت، بحرین اور عمان پر مشتمل ہے، عراق کی

پشت پناہی کرتی رہی ہے۔ جب تک عراقی فوجیں آگے بڑھتی رہیں، کسی نے عراق کی مدد نہ کی۔ لیکن جونہی عراقی ہارنے لگے تو غیر جانب داری کی جالی دار نقاب بھی اتار کر پھینک دی گئی۔ اردن اور سعودی عرب کے سربراہوں نے تو ایران کے خلاف جہاد کا فتویٰ بھی صادر کردیا البتہ اس جہاد بالسان کا وہی حشر ہوا جو لن ترانیوں کا عموماً ہوتا ہے۔

لیکن اب کہ ایران نے عراقی فوجوں کو شکست دے دی ہے اور عراق کی حدود میں داخل ہوگئی ہیں، جنگ کو مزید طول دینے کا کوئی جواز نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایرانی حکومت لوگوں کی توجہ اصل مسائل سے ہٹانے کی غرض سے جنگی جنون کو ہوا دے رہی ہے اور فوجی ضرورتوں کو بہانہ بنا کر امریکہ سے بھی پس پردہ ساز باز کر رہی ہے۔ چنانچہ ہفت روزہ 'ٹائم' نے ۲۵ جولائی ۱۹۸۳ء کی اشاعت میں ایرانی حکومت کی نام نہاد امریکی دشمنی کا سارا راز افشا کردیا اور بتایا کہ امام خمینی کے گماشتے کس طرح امریکہ میں بیٹھ کر اور امریکی حکومت کی ایما پر اسلحے خریدتے ہیں۔ حیرت تو اس بات پر ہے کہ یہ خفیہ کاروبار ۱۹۷۹ء میں امام خمینی کے برسرِ اقتدار آنے کے فوراً بعد ہی شروع ہوگیا تھا۔ ٹائم نے امریکی گماشتوں کے نام، اُن کی دکانوں کی جائے وقوع اور جن امریکیوں سے سودا ہوتا تھا اُن سب کی نشاندہی کردی ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ایرانی حکومت اسرائیل سے بھی اسلحے درآمد کرتی رہی ہے۔

حال ہی میں تہران کے انگریزی اخبار 'ایران ٹائمز' کے ایڈیٹر مساویان حسین پاکستان تشریف لائے تھے۔ انھوں نے اسرائیل سے اسلحے حاصل کرنے کی پُرزور تردید کی لیکن امریکہ سے اسلحے خریدنے کی تردید نہ کرسکے بلکہ فرمایا کہ 'ہم اسلحے آزاد مارکیٹ سے خریدتے ہیں۔ ہم کو اس سے کیا غرض کہ اسلحہ فروش مال کہاں سے لاتے ہیں۔' (اخبار ڈان ۱۶ر ستمبر ۱۹۸۳ء) گویا اسلحے بھی گندم کپاس ہیں اور اب تو آپ گندم کپاس بھی حکومت کی اجازت کے بغیر درآمد برآمد نہیں کرسکتے۔

ایران عراق جنگ کے دوران ملاؤں کی طاقت اور بڑھ گئی۔ رہی سہی شہری آبادی بھی چھین لی گئی اور اُن سیاسی تنظیموں پر بھی عتاب نازل ہونے لگا جو امام خمینی کی حامی تھیں لیکن جو حزب انقلاب اسلامی کے سب سے رجعت پسند عنصر (حجتی گروپ) پر تنقید کرتی رہتی تھیں۔

مجاہدین خلق پہلے ہی سزا وار گردن زنی قرار پا چکے تھے لہٰذا اب نزلہ حزبِ تودہ اور فدائینِ خلق (اکثریت) پر اترا۔ ۷ جون ۱۹۸۱ء کو پاسداران انقلاب کے گنڈوں نے حزبِ تودہ کے دفاتر پر دھاوا کیا۔ فرنیچر اور دستاویزات کو آگ لگا دی اور اخبار 'مردم' بند کر دیا گیا۔ ۲۹ جون کو مجلس نے ابو الحسن بنی صدر پر غداری کا الزام لگایا۔ ابو الحسن کو مواخذہ کی اس کارروائی کا انجام معلوم تھا لہٰذا وہ روپوش ہو گئے اور ۲۹ جولائی کو مجاہدینِ خلق کے رہنما رجائی کو ساتھ لے کر نہایت خاموشی سے پیرس پرواز کر گئے۔ اب ملاؤں کے حجتی ٹولے کے لیے مطلع بالکل صاف تھا۔ صدارت، وزارت، عدالت اور مجلس سب کچھ ان کی جیبوں میں تھی اور اب بھی ہے۔

حجتی ٹولے کی نظر میں ہر وہ شخص غدار اور طاغوتی ہے جو اُس کی ہاں میں ہاں نہیں ملاتا حتیٰ کہ امام خمینی نے جن سے لوگوں کو دادرسی کی امید تھی، حجتیوں کے رحم وکرم پر ہیں۔ حجتیوں نے حزبِ تودہ کو بھی جو امام خمینی کی پوری پوری حمایت کرتی تھی، خلاف قانون قرار دے دیا ہے۔ جماعت کے دو ہزار سے زیادہ ارکان جن میں پارٹی کے جنرل سیکریٹری نورالدین کیانوری اور مجلس عاملہ کے کئی رکن بھی ہیں، گرفتار کر لیے گئے ہیں۔ اُن پر سوویت یونین کی جاسوسی کرنے کا الزام ہے۔ خانم مریم نورالدین کیانوری کو جو عورتوں کی تحریکِ آزادی کی ممتاز رہنما تھیں اور دوسرے کئی رہنماؤں کو جیل میں گولی ماری جا چکی ہے۔ خود نورالدین کیانوری کے بارے میں بھی اسی قسم کی افواہ گرم ہے۔

ایران کا موجودہ سیاسی بحران ملک کے معاشرتی اور معاشی بحران کا عکس ہے۔ حکومت نے سرمایہ داروں، تاجروں اور بڑے زمینداروں کے مفاد کے تحفظ کے پیشِ نظر جو حکمتِ عملی اختیار کر رکھی ہے، وہ معیشت کی تعمیر نو کے تقاضوں کی عین ضد ہے۔ ملاؤں کا حجتی ٹولا نہ زرعی اصلاحات چاہتا ہے، نہ مزدوروں کو ٹریڈ یونین بنانے کی اجازت دیتا ہے اور نہ بیرونی تجارت کو قومیانے کے حق میں ہے۔ بیروزگاروں کی تعداد برابر بڑھتی جاتی ہے۔ تاجر طبقہ درآمد شدہ اشیا کے منہ مانگے دام وصول کر رہا ہے۔ چور بازاری اور ذخیرہ اندوزی عام ہے۔ یونیورسٹیاں بند ہیں اور عورتیں 'چادر اور چہار دیواری' کے نام پر سرکاری ملازمتوں سے برطرف کی جا رہی ہیں۔ شہری آزادی یکسر مفقود ہے اور ہر طرف خوف ودہشت کی زہریلی دھند چھائی ہوئی ہے۔

اس حقیقت سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا کہ ایشیا کے نو آزاد ملکوں میں زراعت ہنوز معیشت کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ حکومت پر خواہ فوجی قابض ہوں، یا ملا یا عوام کے منتخب شدہ نمائندے، زرعی اصلاحات کے بغیر مفر نہیں، کیونکہ دیہات کے فرسودہ فیوڈل نظام کو ختم کیے بغیر نہ پیداوار میں اضافہ ہوسکتا ہے اور نہ کسانوں کا معیارِ زندگی بہتر ہوسکتا ہے۔ وہ بدستور توہم پرستیوں میں مبتلا رہیں گے اور معاشرے کے ترقیاتی منصوبوں کی راہ میں رکاوٹ بنے رہیں گے۔ ایران میں اولاً قابلِ کاشت زمینیں بہت کم ہیں دوئم ان پر انقلاب سے پیشتر شاہ، اُس کے خاندان اور بڑے بڑے امرا کا قبضہ تھا۔ لہٰذا انقلابی حکومت کے لیے ان غدار عناصر کی املاک کو ضبط کرکے زمینیں دہقانوں میں تقسیم کرنا بہت آسان تھا مگر مشکل یہ ہے کہ خود ملاؤں کا ایک طبقہ ہزاروں ایکڑ زمینوں کا مالک ہے اور اُس کی ربط ضبط اُن بڑے زمینداروں سے بھی ہے جو واپس آگئے ہیں۔ چنانچہ جنوری ۱۹۸۳ء میں مجلس نے جب زرعی اصلاحات کا نہایت بے ضرر قانون منظور کیا تو نام نہاد شورائی نگہبانان نے اس قانون کی توثیق کرنے سے اس بنا پر انکار کردیا کہ یہ قانون ذاتی ملکیت کے شرعی حق کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ مساویانِ حسن سے جب اس کی وجہ پوچھی گئی تو انھوں نے کہا کہ 'یہ بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے مثلاً آنحضرت صلعم کی حدیث ہے کہ ہر شخص زمین کا مالک ہوسکتا ہے۔' (حسین صاحب یہ بتانا بھول گئے کہ آنحضرتؐ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ بشرطیکہ وہ خود کاشت کرے اور مزارعوں سے کام نہ لے) حسین صاحب نے مزید کہا کہ 'ہم کو ہوشیار رہنا چاہیے کہ کوئی شخص اس حدیث کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے فیوڈل ریاستیں قائم نہ کرلے اور سماجی توازن میں خلل انداز ہو۔ اس کے ساتھ ہم کو ریڈیکل اصلاحات پر عجلت سے کام نہیں لینا چاہیے کیونکہ ایرانی علما کو احساس ہے کہ ایران میں جو زرعی اصلاحات ہوں گی، وہ تمام دنیائے اسلام کے لیے نظیر اور سند بن جائیں گی.....' ملاؤں کے اس وکیلِ صفائی کو شاید معلوم نہیں کہ مصر، الجزائر، لیبیا، شام اور جنوبی یمن میں ایرانی انقلاب سے برسوں پہلے ریڈیکل زرعی اصلاحات نافذ ہوچکی ہیں۔ دنیائے اسلام کو اگر تقلید کرنی ہوگی تو وہ ان ملکوں سے رجوع کرے گی نہ کہ ایران سے۔

احادیث رسولؐ کا حوالہ دینے والوں کو یہ تاریخی حقیقت نظر انداز نہیں کرنی چاہیے کہ

حدیثیں خواہ وہ مصدقہ ہوں یا غیر مصدقہ، آنحضرتؐ کی وفات کے ڈیڑھ دو سال بعد عباسیوں کے عہد میں مرتب ہوئی تھیں، ان میں بکثرت وہ حدیثیں بھی شامل ہیں جن کا مقصد عباسیوں کے طرزِ حکومت کے لیے جواز فراہم کرنا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اقطاع کا بازنطینی اور ساسانی طریقہ پوری طرح اپنا لیا گیا تھا۔ سالارانِ فوج اور امرائے دربار کو عراق، مصر، شام، ایران وغیرہ میں ہزاروں لاکھ ایکڑ زمینیں ملی ہوئی تھیں۔ حنفی اور جعفری دونوں فقہیں بھی اسی دورِ ملوکیت میں مدون ہوئی تھیں۔ لہٰذا نہ تو ریاست کے تنخواہ یافتہ مفتی اور قاضی ذاتی ملکیت بالخصوص زمین کی ذاتی ملکیت کے مروجہ دستور سے صرفِ نظر کر سکتے تھے اور نہ حنفی اور جعفری فقہا۔ ایسی صورت میں فقہ اور احادیثِ نبوی سے جن میں بہ کثرت جعلی حدیثیں شامل ہیں استنباط کرنا اسلامی تعلیمات کی روح کو مسخ کرنا ہے۔ مفاد پرست علمائے دین کے اسی عوام دشمن طرزِ عمل کی وجہ سے لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ اسلام اہلِ جاہ و ثروت کا حامی ہے اور دولت مندوں، رئیسوں اور نوابوں کی پشت پناہی کرتا ہے۔

ایران میں اس وقت دس لاکھ مزارعے ہیں جن کے پاس ایک گز زمین بھی نہیں اور بیس لاکھ وہ کاشت کار ہیں جن کے پاس زمینیں اُن کی ضرورتوں سے بہت کم ہیں۔ یہ لوگ انقلاب میں وزارتوں، سفارتوں کی لالچ میں نہیں شریک ہوئے تھے، البتہ اُن کو یہ امید ضرور تھی کہ نئی حکومت اُن کے حقوق کا لحاظ کرے گی۔ چنانچہ انقلاب کے دوران جب بڑے بڑے زمیندار ملک سے بھاگ گئے تو دہقانوں نے یہ کہہ کر اُن کی زمینوں پر قبضہ شروع کر دیا کہ 'ہماری ہتھیلیوں کے گٹھے اور ہمارے پاؤں کے چھالے ہمارے حقِ ملکیت کی دستاویز ہیں۔' لیکن یہ دستاویزیں ملاؤں کی شرع میں قبول نہیں ہوئیں اور زمینیں کسانوں سے زبردستی واپس لے لی گئیں۔ موضع قلعہ دار کے کاشتکاروں نے مزاحمت کی تو اُن کو قید کی سزا دی گئی (مئی ۱۹۸۳ء) اسی طرح شمالی ایران کے علاقے غراب طولام میں بڑے پیمانے پر کاشت کاروں کی بے دخلیاں عمل میں آئیں۔

شورائی نگہبانان کو ذاتی ملکیت کا تقدس اس قدر عزیز ہے کہ جنوری ۱۹۸۳ء میں مجلس نے بھگوڑے سرمایہ داروں اور شاہ کی املاک کی ضبطی کا قانون منظور کیا تو شورائی نگہبانان نے

اُس کو بھی رد کر دیا۔ اس سے پیشتر شورائی نگہبانان جون ۱۹۸۲ء میں بیرونی تجارت کو قومیانے کے قانون کو بھی خلافِ شرع قرار دیکر نامنظور کر چکی تھی۔ یہ شرعی عذر فقط بہانہ تھا۔ اصل وجہ یہ ہے کہ ملاؤں کا طبقہ پوری طور پر تاجرانِ بازار کے زیرِ اثر ہے۔ بیرونی تجارت اگر قومیائی جاتی تو تاجروں کی نفع اندوزی اور چور بازاری کی راہیں مسدود ہو جاتیں، وہ ملاؤں کی خوشنودی کی خاطر اپنی روزانہ کی آمدنی میں سے ایک رقم 'حصۂ امام' کے نام سے الگ کر دیتے ہیں۔

شہری صنعتوں کے بارے میں بھی اسی پالیسی پر عمل ہو رہا ہے۔ فیکٹریاں، ملیں اور کارخانے جو مزدوروں کی نگرانی میں چل رہے تھے، مالکوں کو واپس دے دیئے گئے ہیں۔ مزدوروں کو ٹریڈ یونین بنانے کی اجازت نہیں ہے اور نہ اُن کے نمائندوں کو صنعت گاہوں کے نظم و نسق میں شرکت کا حق ہے۔ شہروں میں بیروزگاروں کی تعداد جو شاہ کے زمانے میں پندرہ لاکھ تھی، بڑھ کر چالیس لاکھ تک پہنچ گئی ہے۔ یہی وہ 'فوج' ہے جو کام پر لگے ہوئے مزدوروں کے سروں پر تلوار کی طرح لٹکتی رہتی ہے اور جس کی صفوں سے 'پاسدارانِ انقلاب' اپنے گرز باز بھرتی کرتے ہیں۔

ایرانی انقلاب کا تقاضا تھا کہ ملک کی اقتصادیات کو غیر سرمایہ دارانہ خطوط پر ترقی دی جائے لیکن اربابِ اقتدار نے ملکی معیشت کو مغرب کے سرمایہ دار ملکوں کا دستِ نگر بنا دیا ہے۔ ان ملکوں سے اشیائے صرف کی بے تحاشا درآمد ہو رہی ہے اور زرِ مبادلہ کی ادائیگی کے لیے تیل کی پیداوار کو جاپان اور مغربی ملکوں کے ہاتھ فروخت کیا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایران کی صنعتی پالیسی غیر ملکی اجارہ دار کمپنیوں کے مفاد کے تابع ہوگئی ہے۔ امریکہ سے براہِ راست تجارت نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا یہ سودا ترکی کے ذریعے ہوتا ہے۔ ۱۸ر جنوری ۱۹۸۳ء کے اخبار 'کیہان' کے بقول وزیرِ روغنیات غرازی نے کہا کہ ترکی سے ہماری تجارت ۸۰ کروڑ ڈالر تک پہنچ گئی ہے جو شاہ کے زمانے کے مقابلے میں ۴۰ گنا زیادہ ہے۔ ترکی صنعتی ملک نہیں ہے۔ وہ خود امریکہ، اٹلی اور جاپان سے مصنوعات درآمد کرتا ہے۔ یہ سارا کاروبار امریکی کمپنیوں اور اُن کے گماشتوں کے قبضے میں ہے۔ وہ ترکی میں بیٹھ کر امریکی مال ایران کو فراہم کرتے رہتے ہیں۔ اس طرزِ تجارت کو جس میں ترکی کی حیثیت دلال سے زیادہ نہیں 'اسلامی کامن مارکیٹ' کا نام دیا جاتا

ہے۔ اور وزیر، دینیات فرماتے ہیں کہ 'اسلامی کامن مارکیٹ قائم کرکے ہم امپیریئل ازم سے ٹکر لے سکیں گے۔' حالانکہ اس نام نہاد اسلامی مارکیٹ کی ساری معیشت امپیریلسٹ ملکوں کے دامن سے بندھی ہوئی ہے۔ اسلام بچارہ ان دنوں ہر شخص کا تکیۂ کلام بن گیا ہے۔ بینک ہوں، بیمہ کمپنیاں ہوں، ہوٹل ہوں، تعمیراتی کمپنیاں ہوں، ان کے نام کے آگے اسلامی لکھ دو، وہ مشرف بہ اسلام ہوجائیں گی۔

انقلاب کے دوران امام خمینی پیرس میں بیٹھ کر ایرانی عورتوں سے اپیل کرتے تھے کہ وہ سڑکوں پر نکل آئیں اور پہلوی طاقت کے خلاف مردوں کے دوش بدوش جدو جہد میں شامل ہوں۔ عورتوں نے جس جرأت سے دشمن کا مقابلہ کیا، تاریخ اس کو کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ انقلاب کی فتح یابی کے بعد ۳۱ مارچ ۱۹۷۹ء کو استصواب رائے کے سلسلے میں عورتوں کو مخاطب کرتے ہوئے امام خمینی نے فرمایا کہ اسلام میں عورتوں کو ووٹ دینے کا پورا حق ہے بلکہ اُن کو اتنے وسیع حقوق حاصل ہیں، جتنے مغرب میں بھی نہیں۔ 'اُن کو امور مملکت کے ہر شعبے میں ہر پیشہ اختیار کرنے کا حق ہے۔' لیکن چند ماہ بعد ہی 'چادر اور چہار دیواری' کے احکام صادر ہوگئے، مردوں کو طلاق کی اور ایک سے زائد شادیوں کی اجازت مل گئی، ایک قانون کے ذریعے عورت کے قتل پر قصاص کی رقم مردوں سے آدھی مقرر ہوئی اور فیصلہ کیا گیا کہ عورتیں وکیل، مجسٹریٹ اور جج نہیں بن سکتیں کیونکہ وہ صائب الرائے نہیں ہوتیں! پاسداروں کو حکم ملا کہ وہ عورتوں کو جلسوں، جلوسوں میں شرکت سے روکنے کے لیے طاقت استعمال کریں۔ امام خمینی نے طلبا کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ۲۶ راگست ۱۹۷۹ء کو فرمایا تھا کہ جن لوگوں نے ہماری قوم کو تباہی سے بچایا وہ یونیورسٹیوں کے طلبا تھے لیکن سال بھر بعد یونیورسٹیوں کے بارے میں امام صاحب کی رائے بدل گئی کیونکہ طلبا نے حکومت کی استبدادی حکمتِ عملی کی تائید سے انکار کردیا تھا اور مطالبہ کرنے لگے تھے کہ حکومت، رضا شاہ پہلوی کے نقش قدم پر چلنے کے بجائے جمہوری اقدار کو فروغ دے۔ اس جرم کی پاداش میں یونیورسٹیاں یک قلم بند کردی گئیں اور امام خمینی نے طلبا کی مذمت کرتے ہوئے ۲۰ دسمبر ۱۹۸۰ء کو فتویٰ صادر کیا کہ 'بنی نوع انسان پر اب تک جتنی مصیبتیں نازل ہوئی ہیں، اُن سب کا باعث یونیورسٹیاں ہیں۔'

اس کتاب کی اشاعت کے وقت ایرانی انقلاب جو رُخ اختیار کرتا جارہا تھا، اُس پر تنقید کرتے ہوئے ہم نے لکھا تھا کہ 'جن لوگوں کے خیال میں انقلاب کوئی مسلسل عمل نہیں بلکہ ایک حادثہ ہے، وہ گزرے ہوئے کل میں تو انقلاب کو جائز اور درست سمجھتے ہیں، لیکن آنے والے کل میں مطالبہ کرنے والوں پر مفسد اور ''طاغوتی'' ہونے کے فتوے لگاتے ہیں۔' افسوس ہے ہم نے جن اندیشوں کا اظہار کیا تھا، وہ اب ہولناک حقیقت بن گئے ہیں۔

اس کے باوجود انقلابِ ایران سے ہمدردی رکھنے والے ہر شخص کی دلی تمنا ہے کہ ایران کے اربابِ اقتدار شاہ کے استبدادی روش سے باز آئیں گے اور ہم وطنوں کا خون بہانے کے بجائے اُن کے تعاون سے معاشرے کے بنیادی مسائل حل کرنے کی کوشش کریں گے۔ اگر اُن کو یہ غلط فہمی ہے کہ وہ لوگوں کو اسلام کے نام پر سدا بیوقوف بناتے رہیں گے، تو وہ دن دور نہیں جب ایران کے بہادر اور سرفروش لوگ ایک بار پھر جبر و استبداد کے خلاف جہاد کرنے میدان میں نکل آئیں۔ وہ دن ملاؤں کے حق میں اتنے ہی برے ہوں گے جتنے جنوری، فروری ۱۹۷۹ء کے ایام رضا شاہ پہلوی اور اُس کے ہمنواؤں کے لیے تھے۔

سبطِ حسن
۲۵ ستمبر ۱۹۸۲ء
کراچی

حوالہ جات

۱۔ 'کیہان' (تہران)، ۱۹؍ جنوری ۱۹۸۳ء۔

ایران کے شاہی خاندان

ہخامنشی	۵۴۰۔۳۳۰ ق م
سلوکی	۳۳۰۔۲۵۷ ق م
اشکانی	۲۵۷ ق م۔۲۲۶ء
ساسانی	۲۲۶ء۔۶۵۲ء
خلافت راشدہ	۶۳۷ء۔۶۶۱ء
بنی اُمیہ	۶۶۲ء۔۷۵۰ء
بنی عباس	۷۵۰ء۔۱۲۳۶ء
منگول ایلخانی	۱۲۵۸۔۱۵۰۲ء
صفوی	۱۵۰۲ء۔۱۷۳۶ء
افشار	۱۷۳۶ء۔۱۷۴۷ء
زند	۱۷۵۰ء۔۱۷۹۴ء
قاچار	۱۷۹۵ء۔۱۹۲۴ء
پہلوی	۱۹۲۵ء۔۱۹۷۸ء

''ایران کی تاریخ اور سیاست کے طالب علموں کو سید سبطِ حسن کا ممنون ہونا چاہیے کہ انہوں نے ۱۹۷۹ء کے انقلاب کو اس کے صحیح تاریخی تناظر میں پیش کیا ہے۔ باوجود ماخذ کے فقدان کے، مصنف نے ایرانی ادبیات کا دِقتِ نظر کے ساتھ مطالعہ کرنے کے بعد گزشتہ تین صدیوں پر پھیلی ہوئی ایران کی عوامی تحریکوں اور ان کی احتجاج کی روایت کا بہت مناسب طور پر احاطہ کیا ہے۔ ماضی کے اس مطالعے کے بغیر ان متنوع رجحانات کے ملاپ کا صحیح تناظر اُجاگر نہیں ہوسکتا تھا جو بالآخر ایک انقلابی قوت بن گیا۔ تاریخ کا یہ مطالعہ ہم کو اس بات کو سمجھنے میں بھی مدد دیتا ہے کہ ایک عام ایرانی مرد و زن میں صعوبتیں برداشت کرنے اور قربانیاں دینے کی اس قدر ناقابلِ یقین استعداد کس طرح پیدا ہوگئی۔۔۔'' آئی۔ اے۔ رحمٰن،

'ویو پوائنٹ'، لاہور، ۲۷ر اپریل ۱۹۸۰ء

''پہلوی ریاست جس کی بنیادیں بظاہر بہت مضبوط تھیں اور جس کی تعمیر میں امریکہ اور اس کے مغربی حلیفوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا آناً فاناً ریت کی دیوار کی طرح بیٹھتی جا رہی تھی تا آنکہ انقلاب کامیاب ہوا، شاہ کو فروری ۱۹۷۹ء میں ملک سے رخصت ہونا پڑا اور انقلابی حکومت نے آیت اللہ خمینی کی قیادت میں ملک کی باگ ڈور سنبھالی۔ انقلاب ایران ایک دنیا کے لیے معمہ بنا ہوا تھا۔ شاہ کے دورِ عروج میں کون سوچ سکتا تھا کہ وہ سلطنت جسے اس خطے میں استحکام اور قوت و شوکت کا گہوارہ کہا جاتا تھا وہ خس و خاشاک کا گھروندا ثابت ہوگی۔ انقلاب ایران کے بعد سماجی و سیاسی علوم کے ماہرین نے اس واقعے کے اسباب و محرکات کا مطالعہ کرنا شروع کیا اور اس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔

''سبطِ حسن ایران کے انقلاب کے بارے میں زیادہ صاف ذہن رکھتے ہیں۔ انقلاب ایران کے بارے میں ان کے تجزیے کا نقطۂ آغاز خود ان کا تصورِ انقلاب ہے۔ وہ انقلاب کو انسانی معاشرے کے جدلیاتی عمل کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔ ان کے خیال میں کسی انقلاب کی نوعیت اور اس کے حقیقی کردار کا تعین بھی اسی چیز سے ہوتا ہے کہ وہ سماجی رشتوں کی تبدیلی کے ضمن میں کس قدر کامیاب ہوا۔

''انقلاب کے بعد ایران میں جو رجحانات پروان چڑھے، سبطِ حسن صاحب ان کا بھی تنقیدی جائزہ لیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ایران کا انقلاب عوام کی توقعات پر پورا نہیں اترا اور یہ معاشرے میں کوئی بنیادی تبدیلی لانے میں ناکام رہا۔ انقلاب کے قائدین کا کردار ہی اس کی راہ میں مانع ہوا جو ایک مرتبہ پھر شخصی آمریت کو پروان چڑھانے میں مصروف ہوگئے۔

''غرض 'انقلاب ایران' اپنے موضوع پر ایک معروضی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔۔۔ سبطِ حسن صاحب نے ایرانی علمائے کرام کی روش کے پیشِ نظر جن خدشات کا اظہار کیا تھا وہ بھی اس عرصے میں درست ثابت ہوئے ہیں۔'' سید جعفر احمد

'ریسرچ فورم'، سبطِ حسن نمبر، اگست ۱۹۸۷ء